مجلس تفهیم ودانش

سعیده خاتون عظیمی

دیباچہ

ہر آدمی جو اس دنیا میں تھا یا آئے گا, تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ دوسری مخلوقات پر انسان کی فضیلت ایک ایسے علم کی وجہ سے ہے جو کائنات میں بسنے والی کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔انسان کتنا بھی ترقی یافتہ ہو جائے اور وہ علم کی موشگافیوں میں سبقت حاصل کرے لیکن اس کی مجبوری ہے کہ وہ دوسری مخلوقات کے علم اور شعور کی نفی نہیں کر سکتا۔ علم محض دم کے بیٹے انسان کی میراث نہیں ہے۔ البتہ ابن آدم کو علوم میں سے ایک مخصوص علم ایسا عطا کیا گیا ہے جو آدم زاد کی شناخت ہے۔اگر یہ علم آدم زاد کے پاس نہ ہو تو اس کی حیثیت کسی بھی طرح حیوانات سے ممتاز نہیں ہے۔یہ مخصوص علم جب انسانی دماغ میں دور کرتا ہے تو انسان کے سامنے نئے نئے فلسفے، نئے نئے نظریات اور نئی نئی علمی توجیہات آتی رہتی ہیں۔ہر فلسفے اور ہر نظریئے کے پیچھے جو بات یقینی طور پر مشترک ہے۔وہ تحقیق و تلاش ہے۔ تحقیق و تلاش کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آدم زاد کسی ایک نقطے پر ذہنی مرکزیت کے ساتھ مسلسل اور متواتر غور و فکر کرے۔جب تک ایسا نہیں ہوتا کوئی فلسفہ وجود میں نہیں آتا اور نہ ہی کوئی نظریہ قائم ہوتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ ایک نقطے کی مرکزیت ہی تحقیق و تلاش کے لئے طبیعات، نفسیات اور مابعد النفسیات کی بنیاد ہے۔فکری وسعت جب مظاہرات میں اپنا نشیمن بناتی ہے تو ایجادات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔کوئی بھی ایجاد سوچ و تفکر اور ادراک کے مراحل سے گزرے بغیر مظہر نہیں بنتی۔پہلے تفکر انفرادی ہوتا ہے جب دائرہ کار میں وسعت آجاتی ہے انفرادی تفکر اجتماعی بن جاتا ہے اور انفرادی سوچ اجتماعی بن جاتی ہے۔قدرت کا فیضان عام ہے۔ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔

سعیدہ خاتون عظیمی ایک ہونہار شاگرد ہیں۔ان کی سوچ انفرادی محدودیت سے نکل کر اجتماعی سوچ میں داخل ہو گئی ہے۔ کمیونٹی سینٹر مانچسٹر برطانیہ میں سعیدہ خاتون عظیمی نے دانش و تفہیم کے لئے ایک مجلس مذاکرہ قائم کی جس میں بلا تخصیص مذہب و ملت لوگ شریک ہوتے رہے ہیں۔اس دانش کدہ میں ہر مکتبہء فکر کے علماء، دانشور، اسکالر، پروفیسر، لیکچرر، انجینئر، ڈاکٹر، Ph.D حضرات وخواتین نے اپنی علمی کاوشوں کے ساتھ فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ انداز میں پیچیدہ اور الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھایا ہے۔نئے انداز اور نئے اسلوب سے علمی موشگافیاں سامنے آئی ہیں۔ تحقیق و تلاش کے شوقین لوگوں اور معمولی سمجھ بوجھ کے افراد کے لئے یہ کتاب بہترین گائیڈ لائن فراہم کرتی ہے۔

www.ksars.org

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سعیدہ خاتون عظیمی کی اس کاوش کو قبول کریں اور عوام الناس کو اس سے استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائیں۔

خواجہ شمس الدین عظیمی

www.ksars.org

Table of Contents

نیوٹرل طرز فکر.....6

آداب زندگی.....12

1۔اللہ کے ساتھ ادب.....13

2۔مخلوق کے ساتھ ادب.....15

ایثار.....19

ذہنی مرکزیت۔ادراک۔نقطہ۔نقطہ ءذات.....22

مرکزیت کیسے حاصل کی جاتی ہے.....26

محبت.....28

مجاہدہ.....34

خدمت خلق.....40

تقویٰ.....46

اتباع سنت.....52

سخاوت.....62

بے مقصد گفتگو.....70

www.ksars.org

عقل سلیم 78
تعمیلِ ارشاد 87
لالچ اور حسد 94
اللہ کی صفات 102
ذوق وشوق 111
محدود اور لامحدود 120
محدودیت اور لامحدودیت کی پہچان 131
نعمتوں کا استعمال، اللہ کا شکر ہے 134
حقوق العباد 142
غیب کا مشاہدہ۔۔۔ایمان ہے 153
اللہ صبر کرنے والوں کا رفیق ہے 162
اتحاد 170
آزادی 178
راز و نیاز 189
خوش مزاجی 197

www.ksars.org

آدابِ مجلس 206
نام ونمود کی خواہش 215
رزق حلال 223
تقدیر 231
خوف اور غم 242
انا کی فطرت 251
وحی کی حقیقت 259

www.ksars.org

نیوٹرل طرز فکر

1۔ذہن میں کوئی نقطہ ء فکر آنے کے بعد اس پر غیر جانب دار ہو کر سوچنا اور فیصلہ کرنے کے بعد زباسے اس کا اظہار بھی غیر جانب دارنہ طور پر کرنا نیوٹرل ذہن ہونے کی علامت ہے۔

2۔کسی بھی نقطے پر گہرائی میں تفکر کرنا نیوٹرل ذہن کی خاصیت ہے۔

3۔عدالت کا ذہن نیوٹرل ذہن ہے۔

4۔تکلیف اور راحت کو اللہ پاک کی جانب سے جاننا نیوٹرل ذہن ہونے کی علامت ہے۔

5۔کسی کو برا نہ کہنا اور کسی کو برا سمجھ کر اس سے نفرت وبغض نہ رکھنا نیوٹرل ذہن کی علامت ہے۔

6۔Not to be personally involved یعنی اپنی ذات کو کسی معاملے میں ملوث نہ کرنا۔

7۔اللہ پاک کی مخلوق کی بے لوث خدمت کرنا اور اس سلسلے میں اللہ کے ذہن سے کام لینا نیوٹرل ذہن کا کام ہے۔

8۔ذہن میں غرور و تکبر ہونا۔کسی کو اپنے سے کمتر نہ جاننا نیوٹرل ذہن کی صفت ہے۔

9۔سچائی کی جانب مائل رہنا اور ہر خیال کو مثبت انداز میں معنی پہنانا نیوٹرل طرز فکر ہے۔

10۔اجتماعیت اور انفرادیت کے مفادات میں مساوات برقرار رکھنا نیوٹرل ذہن کا کام ہے۔

11۔راحت وتکلیف میں قلبی کیفیات میں ٹھہراؤ ہونا اور طبیعت میں استغنائی پیدا ہونا نیوٹرل طرز فکر ہے۔

12۔اللہ کی رضا میں راضی برضا ہونا اور کسی بھی کام میں ذاتی مفاد کو مد نظر نہ رکھنا نیوٹرل طرز فکر ہے۔

www.ksars.org

13۔خوشی وغم کے عارضی جذبات سے آزاد ہو جانانیوٹرل ذہن کی فکر ہے۔

14۔خیر اور شر کی حکمتوں کا پہچاننانیوٹرل ذہن کا کام ہے۔

15۔دماغ میں آنے والے خیالات پر کنٹرول ہو جانانیوٹرل ذہن کی علامت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر1 نیوٹرل ذہن کیا ہے؟اوراس کو ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر2 نیوٹرل ذہن حاصل کرنے کے فوائد کیاہیں؟

سوال نمبر3 ہم نیوٹرل ذہن حاصل کر کے اللہ سے کس طرح قریب ہو سکتے ہیں؟

سوال نمبر4 پیغمبرانہ طرز فکر کیا ہے؟

سوال نمبر5 پیغمبروں کے سوچنے کاانداز کیاہوتا ہے؟

سوال نمبر6 روحانی طالب علم کیلئے طرز فکر کا صحیح ہونا کیوں ضروری ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

اللہ تعالی کی ایک صفت ہے۔صفت عدل۔جس کا سم عادل ہے۔اسم عادل کی صفات نیوٹرل ذہن ہے۔عدالت کے ذہن کو نیوٹرل ذہن کہاجاتاہے۔کسی بھی معاملے پر جج غیر جانب دار ہو کر فیصلہ کرتاہے۔غیر جانب دارانہ ذہن کی سوچ نیوٹرل سوچ ہے۔جو معاملے کی گہرائی میں پہنچ جاتی ہے۔یوں توہر آدمی کاذہن نیوٹرل ہونا چاہئے تاکہ وہ اللہ کی مخلوق کو بلاوجہ آزار پہچانے سے باز رہ سکے۔مگر مشکل تو یہ ہے کہ دنیامیں نیوٹرل ذہن کے لوگ کم ہی ملتے ہیں۔خیر ہمیں عام لوگوں سے کوئی

www.ksars.org

سروکار نہیں اس وقت ہمارا موضوع روحانی انسان ہے۔ روحانی انسان کا ذہن غیر جانبدار ہونا بے حد ضروری ہے۔ غیر جانبدارانہ سوچ معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے جب کہ جانبدار سوچ کے آگے اس کی غرض دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ذہن کی فکر اس رکاوٹ کی وجہ سے وہیں رک جاتیہے اور صحیح علم حاصل نہیں ہوتا۔ حرکت کا رک جانا موت ہے۔ حرکت کا جاری رہنا زندگی ہے۔ زندگی کی ہر حرکت ہمارے اندر واقع ہوتی ہے۔ زندگی کا دوسرا رخ موت ہے زندگی بیک وقت دو رخوں میں کام کر رہی ہے۔ مدت کا لمحہ غیب کا لمحہ ہے۔ زندگی کی ہر حرکت غیب سے ظاہر میں آکر اپنا مظاہرہ کرتی ہے اور غیب میں واپس چلی جاتی ہے۔ ایک آدمی جب قدرت کے اس نظام کو پہچان لیتا ہے تو اسے اس بات پر یقین ہو جاتا ہے کہ ہر شے اللہ کی جانب سے آرہی ہے اور اللہ کی جانب لوٹ رہی ہے۔ وہ اس بات سے بھی واقف ہو جاتا ہے کہ زندگی میں پیش آنے والی ہر واردات اس کے اندر ہو رہی ہے اور اندر سے ہی باہر آرہی ہے۔ پس اس کا ذہن باہر پیش آنے والے واقعات کو غیب میں وارد ہونے والے حقائق کا عکس سمجھتا ہے اور اس عکس سے غیب کے حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے۔

قلب ودماغ کے اندر لمحات کے عکس کی صورت فلم کے نیگیٹو کی سی ہے۔ نیگیٹو سے جب تصویر بنتی ہے تو یہ تصویر نیگیٹو کا ہی عکس ہوتی ہے۔ مگر آنکھ اس تصویر کو واضح طور پر دیکھ لیتی ہے۔ ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ فلم کا پہلے نیگیٹو تیار ہوتا ہے پھر نیگیٹو سے فوٹو بنتی ہے۔ نیگیٹو ایک ہوتا ہے مگر فوٹو سے کاپیاں جتنی مرضی بنا سکتے ہیں۔ گویا نیگیٹو اصل ہے یا original ہے۔ جب ایک نیگیٹو سے بہت زیادہ کاپیاں بنائی جائیں تو کاپی یا فوٹو اتنا صاف نہیں آتا۔ فوٹو میں دھندلاہٹ آنے لگتی ہے۔ اس حوالے سے ہم روحانی نقطہ ء نظر سے بشر کے کردار کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اللہ پاک کی تمام مخلوق میں بشر ایک ایسا کردار ہے جو تخلیق کا جوہر ہے یا خالق کا بنایا ہوا شاہکار ہے۔ شاہکار اور جوہر تخلیق کی بہترین صورتے۔ روحانی راست پر چلنے والا بندہ ساری عمر اپنے انر جوہر کی تلاش میں رہتا ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو وہ جانتا ہے کہ زمین پر بسنے والی ہر چیز اور ظاہر میں رونما ہونے والا ہر واقعہ فوٹو ہے اور اسکرین پر فلم کا مظاہرہ ہے۔ دنیا کے اسکرین پر دیکھنے والی آنکھ فرد کی آنکھ ہے جو بشر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔ روحانی شعور رکھنے والا بندہ جب قدرت کے اس قانون سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ خوس اس کی اپنی آذات کے اندر ہی فلم چل رہی ہے اور فلم کا ہر نیگیٹیو اس کے

www.ksars.org

اپنے دماغ کے اندر موجود ہے۔ پس وہ ہر چیز کے حقائق اپنے اندر ہی تلاش کرتا ہے۔ جس طرح فلم کے نیگیٹیو سے روشنی گزرتی ہے اور اسکرین سے ٹکراتی ہے تو آنکھ تصویر کو واضح طور پر اسکرین پر دیکھ لیتی ہے۔ روشنی بند ہو جائے تو نہ نیگیٹیو دکھاءی دیتا ہے نہ تصویر۔ اس کا مطلب روشنی ہی نظر ہے۔ یہ نظر پہلے نیگیٹیو دیکھتی ہے پھر اسکرین پر فوٹو دیکھتی ہے۔ مگر شعور یا عقل انسانی کی فکر الٹے رخ چل رہی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر واقعہ پہلے ظاہر میں رونما ہوتا ہے۔ بھلا سوچئے تو سہی یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا نیگیٹیو کے بغیر فوٹو بن سکتی ہے۔ کیا فلم کی فوٹو پہلے بنتی ہے اور نیگیٹیو بعد میں بنتا ہے یا فلم کی ریل کے بغیر فلم اسکرین پر دیکھی جا سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں ظاہر ہونے سے پہلے ہر واقعہ غیب کے عالم سے گزرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ایک فرد زمیں پر وجود ہے تو زمین پر آنے سے پہلے غیب میں موجود تھا۔ غیب کے عالم میں اپنی زندگی گزار کر دنیا میں آیا ہے۔ اب اگر اسے اپنی زندگی کی حرکات و سکنات سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت پڑے تو یہ علم اسے دنیاوی زندگی کی حرکات میں دکھاءی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اسکرین پر تو صرف ایک ایک نیگیٹیو کا مظاہر ہوتا ہے۔ ساری فلم تو یکجا طور پر ریل کے اندر ہوتی ہے۔ اس کے لئے نظر کا غیب میں مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ظاہری حواس کو ناقص کہا گیا ہے کیونکہ یہ ٹائم اینڈ اسپیس کے حواس ہیں جو محدودیت کے حواس ہیں۔ نیوٹرل ذہن وہ ہے جو محدویت سے نکل کر لال محدودیت میں داخل ہو جائے۔ لا محدودیت غیب ہے۔

کائنات کا نظام قدرت کے نہایت ہی منظم قوانین اور سسٹم پر چل رہا ہے اور اس قانون میں اور اس کے سسٹم میں ازل سے لے کر ابد تک نہ کوئی تبدیلی ہے نہ کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ سسٹم ازل سے جاری ہے اور ایک ہی نہج پر جاری ہے۔ نیوٹرل سوچ قدرت کے سسٹم کو پہچاننے والی فکر ہے۔ یہ دنیا اور اس دنیا میں انسان کا بھیجا جانا خاص حکمت کے تحت ہے اور وہ حکمت ہے شعور کا غیب کی دنیا سے تعارف حاصل کرنا کیونکہ ہر ذی شعور دنیا سے پھر غیب میں لوٹنے والا ہے۔ قدرت کی جانب سے غیب کا تعارف کرانے والی ایک مخصوص ایجنسی موجود ہے جو رشد و ہدایت دینے والا شعبہ ہے۔ تمام پیغمبران علیہ السلام اس شعبہ کے تحت قدرت کی جانب سے دنیا میں بھیجے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو غیب سے متعارف کرائیں اور دنیاوی زندگی اور غیب کی زندگی کے درمیانی ربط کی نشاندہی کریں۔ انسان کی اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ دنیاوی زندگی عارضی ہے اس عارضی زندگی میں آدمی حقیقت سے ناواقفیت کی بناء پر سخت پریشان و بے سکون

www.ksars.org

ہو جاتاہے اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتاہے۔ فطری طور پر بشری تقضہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے راحت و آرام ملے۔ قدرت کی جانب سے رب کی طرف سے مخلوق کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام موجود ہے۔ یہی اہتمام رزق کی صورت میں وسائل کی فراہمی ہے۔ نیوٹرل فکر اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے وسائل کی آسانی کے ساتھ کھوج لگا لیتی ہے۔ روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے قدرت نے جو وسائل مہیا کر رکھے ہیں۔ نیوٹرل ذہن ان وسائل کو بھی آسانی کے ساتھ ڈھونڈ نکالتاہے۔ روحانی نقطہ ء نظر سے نیوٹرل ذہن پیغمبرانہ سوچ ہے۔ پیغمبر کامل بشریت کا بہترین نمونہ ہیں۔ اللہ کی فکر میں بشر کا جو تصور ہے اس تصور کی تصویر پیغمبر علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر پیغمبر اپنے دور کا ایک کامل بشر ہے۔ ہر دور بشری شعور کی نشوونما کا ایک دور ہے۔ جیسے ہر آدمی اپنی زندگی میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے دور سے گزرتا ہے۔ یہ تینوں دور انسانی عمرؓ کے مخصوص حصے ہیں جن میں آدمی کی نشوونما مخصوص حد میں ہوتی ہے اور عقل و شعور بھی ایک ہی تناسب میں بڑھتاہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے کا بچہ بچہ ہی کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی فکر میں بشر کا کامل تصور بھی مختلف ادوار سے بشتریت کا گزرنا ہے۔ جس طرح ایک فرد بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے دور میں اپنی نشوونما یا اپنے شعور کی نشوونما کرتاہے۔ اللہ کے تصور میں بشر کی فکر جن سیڑھیوں سے اتر کر ایک کامل بشر کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ فکر کے ہر زینے پر بشر کی ایک تصویر ہے۔ یہی تمام ہستیاں پیغمبران علیہ السلام ہیں۔ فکر کا کامل نمونہ نبیؐ آخر الزماں حضور پاکؐ کی ذات اقدس ہے۔ دنیا کے ہر دور میں جو پیغمبر زمین پر آئے وہ اس دور کے شعور کی مکمل تصویر تھے۔ ہمیں دنیا میں زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی پیغمبروں کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب پیغمبر اس دور کے شعور کا کامل نمونہ ہیں اور آخر الزماںؐ آنے والی ہستی اپنی اکملیت کی بناء پر ہر دور کے شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔

حسن یوست د عیسیٰ ید بیضاداری

گرچہ خوہاں ہمہ دارند تو تنہاداری

روحانی شعور فکر کے اسی زینے سے اوپر چڑھتاہے۔ جس زینے سے پیغمبران علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے۔ روحانی علوم سیکھنے کے لئے پیغمبروں کی طرز فکر اور ان کے عادات واطوار کو اپنانا ضروری ہے۔ طرز فکر میں سب سے پہلے یہ جاننے

www.ksars.org

کی ضرورت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے سوچنے کا انداز کیا ہے۔ قرآن اور تمام آسمانی کتابیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ سارے پیغمبروں کے سوچنے کا انداز ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ ہر چیز اللہ کی جانب سے آرہی ہے اور اسی کی جانب لوٹ کر جارہی ہے۔ وہ اپنی طرف آنے والی ہر شئے کو سب سے پہلے اللہ کی جانب منسوب کرتے یعنی کسی بھی شئے کا تعلق اپنی ذات سے براہ راست نہیں بلکہ اللہ کے ذریعے جانتے۔ اس طرح اللہ کا نور شئے کی پہچان کا باعث بن جاتا جو کہ حقیقت ہے کیونکہ اللہ کا علم ہی انسان کے ذہن میں منتقل ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی یہی فکر نیوٹرل ذہن ہے۔ نیوٹرل ذہن رکھنے والے کے دماغ میں جیسے ہی کوئی خیال آتا ہے خیال کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن سب سے پہلے اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے خیال کی روشنی کے اندر اللہ کے تصور کی نورانیت جذب ہو جاتی ہے۔ یہی نورانی لہریں ذہن کی توانائی بن جاتی ہیں اور اس توانائی سے شعور کی نشوونما بھرپور طور پر ہوتی ہے۔ یعنی اعمال وافعال درست ہو جاتے ہیں۔ ایک روحانی طالب علم کے لئے طرز فکر کا درست ہونا بنیادی ضرورت ہے تاکہ اس کے روحانی شعور کی صحیح خطوط پر پرورش ہو سکے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

آداب زندگی

1. دین سارے کا سارا ادب ہے۔ یہاں دین سے مراد زندگی گزارنے کے اصول ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔
2. ادب جذبہ ءاطاعت اور فرمانبرداری کا نام ہے۔
3. دل میں نرمی اور جھکاؤ ادب کی علامت ہے۔
4. تعمیل حکم ادب ہے۔
5. بڑوں کا احترام اور عزت کرنا ادب ہے۔
6. ادب۔ تعظیم۔ عاجزی اور اطاعت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔
7. دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دین ادب ہے۔
8. تسلیم ورضا عین ادب ہے۔
9. کسی کو بھی اپنی ذات سے کمتر نہ سمجھنا اور ہر شئے کو اللہ کی جانب سے جاننا ادب ہے۔
10. بہترین خلق ادب ہے۔ خلق سے مراد بہترین اخلاق واخلاص کا مظاہرہ ہے۔
11. اپنی ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچانا ادب ہے۔
12. اپنے ارادے کو اللہ تعالیٰ کے ارادے میں شامل کر دینا ادب ہے۔
13. اللہ تعالیٰ کے امر سے منسلک ہونا ادب ہے۔
14. اپنی ذات کی مکمل نفی کر دینا ادب ہے۔
15. خلوص نیت کا مظاہرہ ادب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

سوالات

سوال نمبر1 دین سے مراد زندگی گزارنے کے کون سے اصول ہیں؟

سوال نمبر2 ادب کیا ہے؟ایک سالک کیلئے ادب کو سمجھنا کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر3 باادب بانصیب بے ادب بے نصیب کا کیا مطلب ہے؟

سوال نمبر4 اللہ پاک، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مرشد کریم کا ادب ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

☆☆☆☆☆☆

ادب روحانیت میں بنیادی درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح بنیاد کے بغیر عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی اسی طرح ادب کے بغیر روحانی علوم کے دروازے میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ادب کے تین درجات ہیں۔

1. اللہ کے ساتھ ادب
2. مخلوق کے ساتھ ادب
3. خود اپنے نفس یا اپنی ذات کے ساتھ ادب

1۔اللہ کے ساتھ ادب

اللہ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ اللہ کو ہر وقت حاضر و ناظر جاننا چاہئے۔ جب ایسا ہو گا تو خلوت، جلوت ہر حال میں اللہ کو ساتھ پائے گا۔ایسی صورت میں بندہ ایک مستقل حالت پر قائم ہو جاتا ہے وہ محفل میں بھی وہی بات کہتا ہے جو تنہائی میں اس کا شعار ہوتی ہے مجمع میں کی ہوئی بات تنہائی میں اس کا عمل بن جاتی ہے اس کے قول اور فعل میں مطابقت ہوتی ہے۔ جب بندہ اللہ کے تصور کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے تو ذہن کے ہر خیال کی Base اللہ کے تصور کے انوار کی لہریں بن جاتی ہیں۔ یہ

www.ksars.org

انوار بندے کے خیالات کو توانائی بخشتے ہیں۔اس توانائی کے ساتھ جب خیال عملی جامہ پہنتا ہے تو قول اور فعل دونوں میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔اس کا بہترین مظاہرہ واقعہ معراج میں اللہ پاک نے بیان فرمایا ہے۔سورہ نجم میں فرماتے ہیں۔

"نہ نگاہ بھٹکی نہ ادھر ادھر اپنی جگہ سے ہٹی۔"یعنی حضور پاکؐ کی نگاہ ان تجلیات کے سوا اور کسی طرف نہ گئی۔یہ اللہ کے ساتھ ادب کا بہترین مظاہرہ ہے جو حضور پاکؐ نے اللہ کے حضور کیا۔یہ ادب کی کامل مظاہراتی صورت ہے۔وہ اس طرح کہ جب آپ معراج پر تشریف لے گئے تو بشری شعور آپؐ کے اندر موجود تھا۔قرآن اس شہادت میں فرماتا ہے کہ "وہ ذات پاک جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔جس کے گرش اگر ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اسےؐ اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاءیں۔بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

اس آیت میں مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کا ذکر کرنے سے مراد حضور پاکؐ کے بشری حواس کا تذکرہ کرنا ہے کہ آپؐ معراج میں بشری حواس کے ساتھ تشریف لے گئے۔اصل میں معراج بشری حواس کی انتہائی رسائی کا نام ہے۔بشری حواس کی انتہائی محدودیت مادی دنیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بشری حواس کو محدودیت سے نکال کر لا محدودیت میں پہنچادیا اور غیب میں موجود اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلادیں۔ساتھ میں اللہ پاک یہ فرمارہے ہیں کہ بشری حواس کے عروج کا باعث اسم سمیع اور اسم بصیر کی تجلیات وانوار ہیں۔بشری حواس کی بنیاد سماعت اور بصارت ہے۔جب بشری حواس اسم سمیع اور اسم بصیر کے انوارات سے لبریز ہو گئے تو حواس اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئے اور اس عروج پر حواس حواس نے تجلیات کا مشاہدہ کر لیا اور مشاہدے کے بعد پھر واپس مادی دنیا میں لوٹ آئے۔معراج کا یہ واقعہ بشری حواس کی اکملیت کا دائرہ ہے جس کا کامل نمونہ حضور پاکؐ کی ذات ہے اور کوءی بشر اس تک نہیں پہنچ سکا۔اللہ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ کر بھی چشم مصطفیٰ ادب کے مقام پر قائم رہی اور حضوری کی انتہائی قربت کے باوجود بھی بندگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔یہی مقام ادب ہے جہاں حضوری میں داخل ہونے کے باوجود بھی بشری حواس اپنی سکت کو برقرار رکھتے ہیں اور اللہ اور بندے کے درمیان فاصلہ برقرار رہتا ہے۔خالق اور مخلوق کی درمیانی فصل موجود رہتی ہے۔اسی فصل کو ایک کمان کا فاصلہ یا تدلی کہا گیا ہے۔حضور پاکؐ کی ذات اقدس نے اپنی زندگی میں جو بھی مظاہرہ کیا آپؐ کے اعمال وافعال آپؐ کے عمل کے دائرے میں ہیں۔آپؐ کا ہر عمل ایک سنت اور قانون یا نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس سے باہر کوئی شئے نہیں

www.ksars.org

جاسکتی۔اللہ کے ساتھ ادب عین بندگی ہے۔بندگی تسلیم ورضا کا نام ہے۔سوادب یہ ہے کہ اللہ جس شئے کا حکم دے اسے بلاچوں وچرا فوراً مان لیاجائے۔ حکم کی تعمیل میں اللہ کے ارادے کو مقدم رکھنا ادب ہے۔اللہ کے ساتھ ادب مرتبہء احسان ہےاور مرتبہءاحسان ہے۔

2۔مخلوق کے ساتھ ادب

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اجتماعی زندگی کے اصول متعین کئے ہیں۔ادب کے اصول پر بھی مخلوق کے ساتھ اجتماعی تعلقات زیر بحث آجاتے ہیں جیسے ماں باپ کا ادب 'مرشد کا ادب 'بڑوں کا ادب 'استاد کا ادب 'احسان کرنے والے کا ادب وغیرہ وغیرہ۔ادب کی یہ ساری جزئیات اجتماعیت کو صحیح نظام کواوپر برقراراور قائم رکھنے کے لئے ہے۔اللہ تعالیٰ کے ملک میں اس طرح رہنا کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ مخلوق کے ساتھ ادب میں شمار ہوتا ہے۔قرآن میں جابجااس کا حکم آیا ہے۔ مثلاً ساءل کونہ جھڑکو، پھل دار درختوں کونہ کاٹو'(اسلامی اصول جنگ) کیونکہ پھلوں سے مخلوق کو فائدہ ہے۔ مخلوق کو فائدہ پہنچے گا تو مخلوق میں سکون چین ہوگا۔ جس سے ملک میں امن وامان قائم رہے گا۔اس دائرے میں ادب کا مطلب فرمانبرداری ہے۔ایسی فرمانبرداری جس میں اللہ پاک کی رضا شامل ہو۔ مخلوق کے ساتھ ادب احسان کا مرتبہ رکھتا ہے۔یہ احسان ایک بندہ دوسرے بندے کے ساتھ ادب احسان کا مرتبہ رکھتا ہے۔یہ احسان ایک بندہ دوسرے بندے کے ساتھ اپنے حسن سلوک کی بناءپر کرتا ہے۔ حسن سلوک کی وجہ سے آپس میں انس واخوت کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔اسی رشتے پر کائناتی شعور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ گویا ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک رکھنا بھی مخلوق کے ساتھ ادب کے درجے میں آتا ہے۔ادب جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے توانس ومحبت سے گزر کر عشق کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ عشق ذہن و دل کو مرکزیت کے آداب سکھلاتا ہے اور ذہن و دل کا مرکز اللہ پاک ہے۔ روحانی راستے پر چلنے والا سالک مرشد کی رہنمائی میں بندگی کے آداب سیکھتا ہے۔

3۔اپنے نفس کے ساتھ ادب

اپنے نفس کے ساتھ ادب بندے پر خود آگاہی کا دروازہ کھولتا ہے۔بندے کا خود اپنے اندر موجود صلاحیتوں کا اپنے ارادے کے ساتھ استعمال کرنا اپنے نفس سے آگاہ وآشنا کرتا ہے۔اپنے نفس کے ساتھ ادب یہ ہے کہ اخلاقی اور معاشرتی تمام خرابیوں اور برائیوں سے بچاجائے۔ہمارے اندر ضمیر ایک ایسا مقام ہے جسے ہم اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے والی ایجنسی کہہ سکتے ہیں۔یہ حق کی آواز ہے جو خیال کے اندر پازیٹواور نیگیٹیو یا خیر اور شر کی اطلاع دیتی ہے۔ایک روحانی آدمی کو اپنے

www.ksars.org

ضمیر کی آواز سے پوری طرح مطلع رہنا چاہئے کیونکہ خیال کے دو رخ اسی مقام سے شروع ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی عمل کا فیصلہ کرتا ہے اور اس فیصلے پر ہر عمل کی اچھائی یا برائی کا انحصار ہوتا ہے۔ ضمیر حق کی آواز ہے۔ ضمیر کی اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔ یہ وہ کسوٹی ہے جو خیال کے اندر پازیٹو اور نیگیٹیو مقداروں کو جانچ کر آپ کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ البتہ آدمی کا فیصلہ غلط ہوتا ہے جس کی وجہ س عمل میں خرابی آجاتی ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ ادب یہ ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کو پوری طرح بیدار رکھے اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا سیکھ لے۔ جیسے جھوٹ بولنا ضمیر گوارہ نہیں کرتا وہ فوراً اطلاع دے دیتا ہے کہ جھوٹ کے اندر سراسر منفی لہریں کام کر رہی ہیں اور ان لہروں کا بہاؤ آدمی کا حق کے راستے سے کتنی دعور پڑ جاتا ہے۔ یہی اس جھوٹ کے نقصانات ہیں۔ اگر آدمی اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرتا ہے تو وہ مجرمانہ ذہنیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز کو مسلسل رد کرنے سے مجرمانہ ذہنیت طرز فکر بن جاتی ہے۔ پھر آدمی شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ ہمارا نفس یا عقل و دشعور ایک نقطہ ہے۔ اس نقطے کا تعلق کائناتی شعور سے ہے۔ نفس کا شعور انفرادی شعور ہے اور کائناتی شعور اجتماعی شعور ہے۔ انفرادی شعور پہلے خود اپنے آپ سے واقف ہوتا ہے اور اپنے آپ کی موجودگی کو تسلیم کرتا ہے پھر کائنات یعنی اجتماعی شعور کے اندر اپنی موجودگی سے واقف ہوتا ہے اور پھر اللہ کی ذات سے آگاہ ہوتا ہے۔

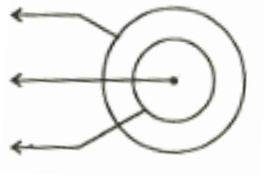

نفس کے تمام آداب کائنات میں اپنے لئے ایک عزت کا مقام بنانے کے لئے ہیں۔ کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظاہرہ ہے۔ صفات کی روشنیاں کائنات کی حدود میں آکر اپنا مظاہرہ کرتی ہیں۔ یہ فطرت ہے۔ جب فطرت کی روشنیاں ایک نقطے یعنی نفس آدم میں سمٹ جاتی ہیں تو یہ نقطہ فرد بن جاتا ہے اور فرد کے ذریعے فطرت کی روشنیوں مظاہرہ ہوتا ہے۔ فطرت اللہ کی صفات کا نور ہے۔ جب فرد اپنی غلط طرز فکر کی وجہ سے اپنی انا کے خول میں بند ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کی صفات سے واقف ہوتا ہے نہ ذات سے ساری کائنات اس کے لئے اجنبی بن جاتی ہے۔ وہ بس اپنے ہی نقطے میں گھومتا رہتا ہے اور اسی نقطے کو ساری کائنات سمجھ لیتا ہے۔۔ان اللہ خلق آدم علی صورتہ۔۔یعنی "بے شک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کا نقطہ یا آدم کا شدور اپنے اندر لا محدودیت کا شعور اور ر علم رکھتا ہے۔ آدم کا نقطہ ایک سمندر ہے جس میں اللہ کی صفات کے انوار ہیں۔ بات صرف ان لہروں سے واقفیت کی ہے۔ سمندر کی ہر لہر دوسری لہر

www.ksars.org

سے وابستہ ہے اور ہر لہر سمندر کا ایک جز ہے۔ کوئی بھی موج جو سمندر سے اٹھتی ہے ساحل تک پہنچتی ہے پھر یہاں سے واپس لوٹ جاتی ہے۔ اصل سمندر اللہ کی ذات کی تجلیات ہیں جس کی موجیں اللہ کا امر ہے۔ امر کی تجلی جب نزول کرتی ہے تو موج کی طرح ساحل سے ٹکراتی ہے اور پھر واپس سمندر میں لوٹ جاتی ہے۔ یہ ساحل انسانی نفس یا شعور ہے۔ گہرے پانی سے موج اٹھ کر ساحل کی سوکھی ریت کی جانب آتی ہے اور اسے گیلا کر کے واپس لوٹ جاتی ہے۔ ریت نے پانی کو جذب کر لیا جتنی دیر پانی جذب رہے گا ریت کے ذرات پانی سے یعنی سمندر سے مستفیض ہوتے رہیں گے اور لہروں کا لطف اٹھائیں گے۔ عقل کل سمندر ہے جو انفرادی شعور کا احاطہ کر لیتی ہے اور اسے اپنی شناخت عطا کر دیتی ہے۔

اللہ پاک نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کئے ہیں۔ یہ علوم روح کے حافظے کا ایک ریکارڈ ہے۔ اس مقام سے اسمائے الٰہیہ کی ایک شعاع موج کی طرح اٹھ کر نفس انسانی (ساحل) کی طرف آتی ہے۔ نفس انسانی یا عقل انسانی ایک خلاء ہے جیسے ریت کا ذرہ۔ اس خلاء میں شعاع کی روشنی داخل ہو جاتی ہے۔ جیسے ذرے نے پانی کو جذب کر لیا۔ اس طرح نفس یا عقل انسانی اللہ کی صفات کا ادراک کر لیتی ہے۔ نفس انسانی سمندر نہیں ہے مگر سمندر سے منسلک ضرور ہے۔ جیسے ساحل بھی سمندر کا ایک حصہ ہے۔ جب آدمی اپنے نفس کو سمندر سے یعنی اللہ پاک کی تجلیات وانوار سے منسلک کر دیتا ہے تو اس کے نفس میں نور کی لہریں بہنے لگتی ہیں۔ ہر لہر دوسری لہر سے قوت وطاقت میں مختلف ہوتی ہے۔ محیط کل اللہ وہ ہستی ہے جس کے اندر لاشمار صفات کام کر رہی ہیں۔ ہر صفت دوسری سے مختلف ہے۔ نفس کی مثال ایک موتی کی سی ہے۔ موتی کے قلب میں آر پار سوراخ ہوتا ہے بغیر سوراخ کے موتی گلے کا ہار نہیں بن سکتا۔ نفس کے موتی کا سوراخ جان کے دھاگے سے روح کے گلے میں اٹکا ہے۔ جان روح کی روشنی ہے جو نفس کی خلاء میں آجا رہی ہے۔ نفس اگر اپنے خلاء کو روشنی کے داخل ہونے سے بند کر لے تو روح کے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر پڑے گا۔ روح فطرت ہے، فطرت اللہ ہے۔ اللہ ہر فائدے ونقصان اور خیر وشر سے مبرا ہے۔ ہار ٹوٹ گیا تو نفس کا موتی ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ روح تو جیسی ہے ویسی رہے گی فرد کا شعور بکھر جائے گا جو خود اپنے نفس کی پہچان ہے۔ سورہ واقعہ میں اس کا بیان آیا ہے۔

"وحور عین۔ کامثال اللولوء المکنو" یعنی حوریں جیسے سچے موتی جو چھپا رکھے ہوں۔

یہاں حور عین سے مراد نفس قدسیہ ہے جو سچے موتی کی مانند ہے۔ سچا موتی سیپ میں چھپا کر رکھا جاتا ہے تاکہ سمندر کے پانی کی طاقتور لہریں اس پر اثر انداز ہو کر اس کی آب وتاب کو خراب نہ کر دیں۔ سیپ وہ حصار اور تحفظ ہے جو اللہ نے موتی کو بخشا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا سمندر کا ہر جانور کسی نہ کسی حصار کے اندر ہے یعنی خول کے اندر ہے تاکہ اس کا جسم یا انفرادی پہچان باقی رہے۔ روحانی علوم بھی سمندر ہیں۔ اس سمندر میں جب کوئی سالک تیرنا چاہتا ہے تو بغیر حصار کے سمندر کی

www.ksars.org

لہریں جو قوت و جبروت کا عالم ہے اپنی حدود میں داخل ہونے والے نفس کے تنکے کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ تنکا موجوں کے زور سے ٹوٹ پھوٹ کر ذرہ بن کر بکھر جاتا ہے۔ روحانیت میں مرشد آپ کا سیپ بن جاتا ہے۔ وہ مراد کے گرد اپنی توجہ اور تصرف کا ایک ایسا حصار بنا دیتا ہے کہ عقل کل کے سمندر میں فرد کی عقل اس کے حصار کے ساتھ موجوں کے اوپر سفر کرتی رہے۔ اپنے نفس کے ساتھ ادب کی منزل خود آگاہی ہے، جو بندہ اپنے نفس سے واقف ہو جاتا ہے وہ خود آگاہی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اپنے نفس کے ساتھ ادب کرنے کا حق ادا کر دیتا ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

ایثار

1. اپنی محبوب چیز کسی کو دے دینا ایثار ہے۔
2. دوسرے کے لئے وہی پسند کرنا جو اپنے لئے پسند ہو ایثار ہے۔
3. اپنی ضرورت کی چیز دوسرے کو دینا جیسے گردہ یا خون کی ضرورت ہو تو دے دینا ایثار ہے۔
4. کائنات کو اپنی ذات کا حصہ جانے، کائنات کی ہر شئے کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ایثار ہے۔
5. اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دینا ایثار ہے۔
6. اللہ کی مخلوق کے مفادات کو ہمیشہ اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دینا ایثار ہے۔
7. اپنا فائدہ نظر انداز کر کے دوسرے کو فائدہ پہنچانا ایثار ہے۔
8. اللہ کی رضا کیلئے ہر وقت کام کرنا خواہ نفس اس میں راضی ہو یا نہ ہو۔
9. اللہ کی رضا کو تلاش کرنا ایثار ہے۔
10. محبت کے بغیر ایثار نہیں کیا جاتا۔ مخلوق سے اخلاص و محبت کے ساتھ پیش آنا ایثار ہے۔
11. اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں مخلوق کو حصے دار جاننا ایثار ہے۔

سوالات

سوال نمبر ۱ ایثار کیا ہے؟ اس کے کیا کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۲ مرشد، مرید کو ایثار سے کس طرح واقف کراتا ہے؟

سوال نمبر ۳ نور فراست اور عقل سلیم ایک سالک کیلئے کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۴ مختلف مذاہب میں ایثار کی کیا اہمیت ہے؟

ہماری زندگی ایک اجتماعی زندگی ہے۔ اس اجتماعی زندگی میں ہمارا تعلق صرف اپنی نوع کے افراد سے ہی نہیں بلکہ کائنات میں موجود تمام انواع کے افراد کے ساتھ ہے۔ کسی نوع کے ساتھ ہمارا تعلق جسمانی ہے کسی کے ساتھ ذہنی طور پر ہے۔ غرض کہ زندگی کے سفر میں ہم ساری مخلوق کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر خیال نہ رکھا گیا تو دوسروں کا نقصان بھی ہمارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اس کی مثال یوں

www.ksars.org

ہے کہ جیسے میں یا میری ذات ایک اینٹ ہے ظاہر ہے اینٹ کا مقصد حیات تو دیوار میں چنا ہوتا ہے جب تک اینٹ اس مقصد کو قائم رکھے گی وہ دوسری اینٹوں کے ساتھ تعاون کرے گی اور دیوار بن جائے گی جیسے ہی اینٹ اپنے مقصد سے یا مرکز سے ہٹی تو دوسری اینٹوں کے ساتھ تعاون نہیں کرے گی نہ ہی گارا سیمنٹ کے ساتھ تعاون کرے گا۔اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اینٹ کسی طرح دیوار میں فٹ نہیں ہو سکے گی اس کا نقصان خود اینٹ کو ہی تو ہو گا کہ اس کا مقصد حیات ادھورا رہے گا۔

یہی حساب ایک فرد کا ہے۔ہر فرد کی زندگی ایک مخصوص ڈگر پر رواں دواں ہے۔یہ مخصوص ڈگر ہی اس کی حیات ہے۔ اس مخصوص راستے سے ہٹ کر فرد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔یہی وجہ ہے کہ ہر فرد اپنے آپ کو اس راستے پر قائم اور متحرک رکھنے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے اور چونکہ فرد کی زندگی اجتماعیت کے اندر ہے جس کی وجہ سے اسے زندگی گزارنے کے مخصوص اصول اپنانے پڑتے ہیں۔ان اصولوں کے ساتھ وہ اپنے آپ کو دوسرے افراد کے ساتھ ایک توانائی کے ساتھ منسلک رکھتا ہے۔زندگی کے ان اصولوں میں سے ایک اصول ایثار ہے۔ایثار اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر شئے میں اعتدال رکھنے کا حکم دیا ہے۔اعتدال کا حکم نہایت ہی زبردست حکمت کے تحت ہے۔مثلاً آپ ایثار کو ہی لیجئے اگر آپ ہر وقت اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے رہیں گے تو خود آپ کے اہم تقاضے پورے ہونے سے رہ جائیں گے۔آپ کے ساتھ آپ کے گھر والے تعاون نہیں کر پائیں گے اور آپ کی گھریلو زندگی متاثر ہو جائے گی جس کے نتیجے میں ایسی بھلائی کرنے سے آپ کو خوشی کے بجائے پریشانی ہو گی اور آپ کے ساتھ ساتھ سارا گھر پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا۔ان چیزوں سے بچنے کے لئے سب سے پہلے اپنے اندر فراست اور عقل سلیم پیدا کرنے کی ضروت ہے۔فراست یقین سے پیدا ہوتی ہے۔یقین اللہ کا نور ہے۔اللہ کا نور جب دل میں جذب ہو جاتا ہے تو عقل اس نور سے سیراب ہو جاتی ہے۔دماغ کی نظر اس نور کی روشنی میں شئے کو دیکھتی ہے اور ذہن اسے صحیح معنی پہناتا ہے۔یقین ایمان ہے جو کام یقین سے کیا جائے اس میں کامیابی لازمی ہے۔یقین کے لئے مرکزیت کا ہونا لازمی ہے۔کوئی بھی مشن کوئی بھی امر جب آدمی کی مرکزیت بن جاتا ہے تو وہ اس کے لئے پورے یقین کے ساتھ کام کرتا ہے اس کا ہر قدم اپنے کام و مشن کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔ذہنی مرکزیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہر قدم منزل مقصود کی جانب ہے۔ذہنی مرکزیت سے ہمارے حواس کو یقین کے نور کی توانائی مل جاتی ہے اور وہ عملی طور پر پوری اسپیڈ کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں۔گویا ہمارا شعور ایک مشین ہے جس کو چلانے کے لئے توانائی کی ضرورت ہے۔یہ توانائی شعور دو ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ایک ذریعہ مادی روشنی ہے۔دوسرا ذریعہ روح کی روشنی یا نور ہے۔مادی روشنیوں میں کثافت ہے۔ روح کی روشنیوں میں لطافت ہے۔دنیا میں رہتے ہوئے ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ہم مکمل طور پر مادی روشنیوں سے کنارہ کش

www.ksars.org

ہو جائیں۔ پھر تو ہمارے ناسوتی تقاضے ہی بدل جائیں گے۔ البتہ ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ ہمارے ناسوتی حواس کے اوپر نورانی رنگ غالب رہے تاکہ مادی کثافتیں ہمیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔ زندگی گزارنے کے جتنے بھی اچھے اصول ہیں جب کوئی بندہ اللہ کی رضا کے ساتھ ان اصولوں پر عمل کرتا ہے تو اس عمل سے اس کے حواس کے اندر سے مادی کثافتیں ختم ہو جاتی ہیں اور حواس میں نورانیت آجاتی ہے۔ نورانی حواس ہی غیب میں کام کرتے ہیں۔ اس طرح زندگی کا ہر نیک عمل نیک غیب کے حواس کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک کامل انسان وہی ہے جو عالم ناسوت میں اپنے مادی حواس کے ساتھ رہتے ہوئے غیب کی دنیا سے اپنے نورانی حواس کے ساتھ رابطہ قائم رکھے۔ اسی کامل بشریت کا نمونہ پیغمبران علیہ السلام تھے اور ایک روحانی آدمی کو بھی انہیں کا نمونہ بننا چاہئے۔ تمام مذاہب میں انسانیت کے ایک ہی اصول ہیں۔ محبت، حسن سلوک، ایثار، قربانی، جھوٹ سے پرہیز، غیبت سے پرہیز وغیرہ وغیرہ۔ ہر انسان ایسی اخلاق سوز حرکات کو برا جانتا ہے جن سے دوسروں کو نقصان پہنچے اور ہر آدمی حسن سلوک اور نیکی کو اپنے اور دوسروں کے لئے پسند کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی کا یہ تصور لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ کے پیغام وہدایت کے مطابق پیغمبروں کا لایا ہوا ہے۔ پیغمبروں کی زندگی ہمارے لئے ایک ایسا نمونہ ہے جس کی پیروی ہمیں بھی اس مقصد حیات کی جانب گامزن کر دیتی ہے جس کے لئے ہماری تخلیق ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے ارادے میں بااختیار بنایا ہے۔ یہ اختیار خالق کا عطا کردہ ہے۔ جب کوئی بندہ اپنی دانست میں یقین کی وادیاں طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اختیار الٰہیہ اس کے اندر منتقل ہو رہا ہے تو وہ اللہ کے ارادے سے واقف ہو جاتا ہے کہ اللہ اس سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ اختیار الٰہیہ کو پہچان کر ایک بندہ لامحدودیت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ پس وہ انسان کی فضیلت کو پہچان لیتا ہے۔ انسان کی فضیلت اللہ تعالیٰ کے علوم حاصل کرنے اور اپنے اندر موجود صلاحیتوں کا صحیح طور پر استعمال کرنے میں ہے۔ ہر آدمی کے اندر ایثار کی صلاحیت موجود ہے۔ جب وہ اس صلاحیت سے کام لیتا ہے تو ایثار کے علوم سے پوری طرح باخبر ہو جاتا ہے۔ یہی باخبری اسے غیب کی دنیا میں بھی ایثار سے متعارف اور منسلک رکھتی ہے۔ غیب کی دنیا میں بھی وہ ایثار کی صلاحیت سے کام کرے گا اور اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ کے انعام سے مستفیض ہو گا۔ ایثار اپنی جان پر دوسروں کی جانوں کو ترجیح دینا ہے۔ خدمت خلق کی راہ میں اپنی جان ومال کا ایثار اللہ کے نزدیک مقبول ترین عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو ایک خاکی انسان کو نوری انسان بنا دیتا ہے۔ فنائیت کو ابدیت بخش دیتا ہے۔ آدمی اپنے نیک عمل کے حوالے سے صفحہ ہستی پر ابد تک اپنے نام کے ساتھ باقی رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

ذہنی مرکزیت۔ادراک۔نقطہ۔نقطہ ءذات

1. تمام خیالات کو فکر کے ایک نقطے پر مرکوز کرنے سے ذہن کی مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔
2. کسی ایک نقطے پر ذہن کی گہرائیوں سے غور و فکر کرنے کے عمل سے ذہن کی مرکزیت قائم ہوتی ہے۔
3. ہر طرف سے دھیان ہٹا کر ذہنی یکسوئی حاصل کرنا ذہن کی مرکزیت کا عمل ہے۔
4. اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کے مقصد سے مرشد کریم کی ذات کو ذہن کا مرکز بنا کر اس کے حکم کی تابعداری کرنے سے ذہن کی مرکزیت قائم ہو جاتی ہے۔
5. محبت کا دوسرا نام ذہن کی مرکزیت ہے۔
6. نقطہ ءفکر کے اندر ذہن کی تمام قوتوں کو جذب کر دینا ذہن کی مرکزیت کہلاتا ہے۔
7. ہر حال میں اللہ کی جانب نظر کرنا اور ہر کام میں اللہ کی جانب رجوع کرنا ذہن کی مرکزیت ہے۔
8. تمام خیالات کا نقطہ ءفکر پر جمع ہو جانا ذہن کی مرکزیت ہے۔
9. نور علی نور ذات میں تفکر کرنا ذہن کی مرکزیت ہے۔
10. اپنے اور مخلوق کے درمیان اللہ کی ذات کو واسطہ جاننا ذہن کی مرکزیت کا قائم ہونا ہے۔
11. مرکزیت نقطہ ءعلم ہے۔روحانی نقطہ ءنظر سے ذہن کی مرکزیت ظاہری رخ مرشد کی ذات سے وابستہ ہے اور باطنی رخ نقطہ ءعلم کے ساتھ وابستہ ہے۔نقطہ ءعلم اللہ تعالیٰ کی صفت علیم کی تجلی کا نقطہ ہے۔جس کے علوم آدم کو عطا کئے گئے ہیں۔
12. نقطہ ءذات سے شعور کا رابطہ قائم ہونا ذہن کی مرکزیت ہے۔
13. روحانیت میں شیخ کی طرز فکر کو اپنانے سے ذہن کی مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔
14. روحانی نقطہ ءنظر سے تصور شیخ ذہن کی مرکزیت ہے۔

www.ksars.org

15. مرشد کواللہ تعالیٰ کانائب جان کراس کے حکم کی دل وجان سے تعمیل کرنے سے ذہن کی مرکزیت قائم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱ ذہنی مرکزیت کیاہےاوراس کو ہم کس طرح حاص کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۲ ذہنی مرکزیت کے کیافوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳ تصور شیخ سے کس طرح شاگرد کو شیخ کی طرز فکر منتقل ہوتی ہے؟

سوال نمبر ۴ فنافی الشیخ، فنافی الرسول، فنافی اللہ اور باقی باللہ میں کیافرق ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

ذہن کی مرکزیت یقین کابنیادی اصول ہے جو ذہن کی تمام قوتوں کے ایک نقطہ ءفکر پر جمع ہو جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب ذہن کی تمام قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں تو ایک قوت بن جاتی ہے اور اس قوت کا نام یقین ہے۔ یقین کی قوت نقطہ ءفکر کے اندر داخل ہو کر اس نقطے سے فکر کے علوم شعور میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح عقل اسے پہچان جاتی ہے۔ علم حاصل کرنے کا جو سسٹم ظاہری علوم حاصل کرنے کے لئے ہے باطنی علوم حاصل کرنے کے لئے بھی انہیں اصولوں کو اپنانا ہوگا۔ جس طرح ذہن کی مرکزیت توجہ اور غور وفکر سے دنیاوی علوم حاصل ہو جاتے ہیں اسی طرح ذہن کی مرکزیت توجہ اور غور وفکر روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصور شیخ ذہن کی مرکزیت ہے جو روحانی طالب علم یا مرید کو اپنے مرشد کے تصور سے حاصل ہوتی

www.ksars.org

ہے۔ شیخ کا تصور جب مرید کے ذہن کا مرکز بن جاتا ہے تو شیخ کے علوم مرید کو منتقل ہونے لگتے ہیں۔ روحانی علوم کی منتقلی کے اسی اصول کے پیش نظر روحانی استاد کا ہونا ضروری ہے۔

ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے علم کا مظاہرہ ہے۔ انسان کا ہر عمل اور ہر ایجاد بھی اس کے اندر محفوظ علم کا نتیجہ ہیں۔ مثال کے طور کسی آدمی کے ذہن میں ٹیبل بنانے کا خیال آیا۔ یہ خیال ٹیبل کا علم ہے۔ خیال کے اندر ٹیبل کی مکمل صورت ہے۔ یہی خیال جب عمل کے دائرے میں آیا تو ٹیبل نظر کے سامنے آگیا۔ یعنی علم کا مظاہرہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شئے سوائے علم کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ کے علم میں کائنات ہمیشہ سے موجود تھی۔ کن کہہ کر علم کا مظاہرہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شئے سوائے علم کے کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ کے علم میں کائنات ہمیشہ سے موجود تھی۔ کن کہہ کر علم کا مظاہرہ ہو گیا۔ اس فکر پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ذہن کی مرکزیت در حقیقت علم کا وہ نقطہ ہے جو شیخ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے یا جو بھی توجہ کا مرکز ہو۔ یہاں سے مرکزیت کے دو رُخ سامے آجاتے ہیں۔ ایک مرکزیت کا ظاہری رخ یا صورت دوسرا باطنی رخ جو ظاہری رخ کے پس پردہ کام کر رہا ہے۔ مرکزیت کا عمل دونوں رخوں میں آدمی اندر کام کر رہا ہے۔ ایک رخ میں آدمی ظاہر کی شئے کو توجہ کا مرکز بنالیتا ہے اور اس کی فکر شئے کی گہرائی میں پہنچ کر اس کے باطن کے علوم حاصل کر لیتی ہے۔ دوسرے رخ میں آدمی کے ذہن پر کوئی خیال وارد ہوتا ہے۔ یہ خیال توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کے مادی حواس بھی ذہن کے خاکے کو مادی صورت میں لانے پر کوشاں ہو جاتے ہیں اور تصور کا خاکہ مظاہراتی جامہ پہن کر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ فکر کے دونوں رخوں میں مرکزیت علم کا نقطہ ہے۔ کبھی نگاہ اس نقطے کو ذہن کے اندر دیکھتی ہے اور کبھی اس نقطے کو باہر دیکھتی ہے۔ ظاہری رخ چونکہ محدودیت میں اپنا ڈسپلے کرتا ہے اس لئے مدت معینہ میں اپنا مظاہرہ ختم کر کے فنا ہو جاتا ہے۔ مگر باطنی رخ جو علم ہے وہ بقا ہے کیونکہ علم اللہ کی صفت ہے اور اللہ اپنی ذات و صفات میں ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ لامحدود ہستی ہے۔ لہذا لامحدود ہستی کے علم کا پھیلاؤ بھی لامحدودیت میں ہے۔ لامحدودیت میں ہر شئے علم کے ایک نقطے کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ نقطہ اللہ کی صفت علیم کی تجلی ہے۔ ہر شئے کی اصل ذات یہی تجلی کا نقطہ ہے۔ اسی نقطے میں ساری کائنات بند ہے۔ آدم کو اسی

www.ksars.org

نقطہ ءذات کے علوم عطا کئے گئے ہیں۔اسی نقطہ ءذات کی روشنیاں آدم کے اندر ادراک اور حواس بنتی ہیں۔روحانی علوم سیکھنے کے لئے دراصل اسی نقطہ ءذات کو ذہن کا مرکز (Focus) بناتے ہیں۔مرکزیت کے اعتبار سے اس نقطے کے چار مدارج ہیں۔فنافی الشیخ، فنافی الرسول، فنافی اللہ، باقی باللہ۔

مرید جب شیخ کو اپنے ذہن کا مرکز بنالیتا ہے تو شیخ کی طرز فکر اس میں منتقل ہو جاتی ہے۔اس کی سوچ بالکل شیخ کی سوچ کے مطابق ہو جاتی ہے۔ گویا دو ذہن شئے کو ایک ہی زاویئے سے دیکھتے ہیں۔ شیخ اور مرید کے ذہنوں میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے اور دونوں کو سوچنے اور سمجھنے کا انداز ایک ہو جاتا ہے۔ مرید کے اندر شیخ کی طرز فکر منتقل ہونے کو فنافی الشیخ کہتے ہیں۔اب پھر مرید اپنے نقطہ ءذات میں صعود کر کے فنافی الشیخ کے درجے سے اوپر اٹھتا ہے۔اس کی توجہ کا مرکز پیغمبر کی ذات بن جاتی ہے۔ وہ غیر ارادی وارادی طور پر پیغمبر کی طرز فکر کو اور ان کے اعمال وافعال کو اپناتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے سوچنے کا انداز پیغمبر کے ذہن کے مطابق بن جاتا ہے۔اس طرح پیغمبر کے ذہن کے متعلق دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ یہ فنافی الرسول کا درجہ ہے۔ پھر جس طرح پیغمبر نے اللہ کو جانا اور پہچانا اس کا ذہن بھی اس اندازِ پہچان کی جانب متوجہ ہونے لگتا ہے۔اس طرح آہستہ آہستہ اللہ کی صفات اور ذات کی جانب اس کا ذہن جانے لگتا ہے۔اور اللہ پاک کی صفات اس کے اندر منتقل ہونے لگتی ہیں یعنی اس کے اپنے نقطہ ءذات سے صفات کے انوار اس کے ذہن میں جذب ہونے لگتے ہیں۔وہ اللہ کے ذہن سے سوچتا ہے۔دوسرے لفظوں میں اس کا ذہن امر الٰہی کی حرکت کا میڈیم بن جاتا ہے۔ وہ اللہ کے ارادے اور مشیت ایزدی کی حکمتوں سے واقف ہو جاتا ہے۔اس کے ذہن کی ہر حرکت مشیت ایزدی کے تابع ہو جاتی ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ کے اسرار کھلنے لگتے ہیں۔اس درجے میں بندے کا ہر فعل اللہ کا فعل بن جاتا ہے اور بندہ اپنے اعمال کی خرابیوں سے بے پرواہو جاتا ہے۔ اسی کو روحانیت میں غیر مکلف ہونا یا سدا سہاگن کہا جاتا ہے۔اس اسٹیج پر بندے کے ارادے پر اللہ کا ارادہ غالب آجاتا ہے اس کا ادراک کل کا ادراک بن جاتا ہے۔ یہ فنافی اللہ کا درجہ ہے۔جب سالک اس مقام پر ٹھہر جاتا ہے یعنی اس کا اپنا ارادہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کا امر بن جاتا ہے۔اس کی اپنی ذات کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ وہ اسٹیج ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آدم یا کائنات پر ایک وقت ایسا بھی آچکا ہے جب وہ نا قابل تذکرہ شئے تھا۔اس صورت میں اس کی ذات

www.ksars.org

کے تمام ڈائی مینشن قطعی طور پر فنا ہو جاتے ہیں۔اس کی ذات فنا ہو جاتی ہے۔ پس ایک ماوراء ہستی باقی رہتی ہے جو اپنی ذات میں حی قیوم ہے۔ یہ باقی باللہ کا درجہ ہے۔ یہ وہ حالت ہے جو کن کہنے سے پہلے آدم یا کائنات اللہ کے علم میں موجود تھی۔ بندہ اپنے نقطہ ءذات میں صعود کرتا ہوا ازل کے اس مقام پر جا کھڑا ہوتا ہے جہاں اللہ کے علم میں اس کا وجود تھا۔ اللہ کے علم میں بندے کی موجودگی کا ادراک باقی باللہ ہے۔ یہ ادراک بحیثیت ذات واحد کے ہے۔ اس مقام پر آکر تجلی کے ادراک کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ ادراک یا یہ سفر کن کہنے سے اسی مقام پر شروع ہوا تھا اور اسی مقام پر ختم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ہر شئے اللہ کی جانب سے آتی ہے اور اللہ کی جانب لوٹ کر جانے والی ہے۔ روحانی علوم اسی دائرے کے علوم ہیں۔ جو آدمی کے باطن کے علوم ہیں۔ نقطہ ءذات کا ادراک روح کے اندر بہتا ہے۔ ایک روحانی طالب روح کی روشنی کے دریا میں سفر کرتا ہوا تجلی ذات کے نقطے تک پہنچ جاتا ہے۔ نزولی حالت میں تجلی کا ادراک اپنی آخری حد کو پہنچ کر شعور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ شعور سے پھر واپس روحانی شعور اپنی اصل ذات یا تجلی کے نقطے کی جانب لوٹتا ہے۔ روحانی انسپائریشن کے حساب سے شعور سے نقطہ ءذات تک بہتر ہزار پردے یا سیڑھیاں ہیں۔ ہر پردہ ادراک کا ایک زون ہے۔ یہ ادراک روح کا ادراک ہے جو کن کے بعد اسے حاصل ہوا۔ ہر زون ایک عالم ہے جس میں روح کا ادراک ہے جو کن کے بعد اسے حاصل ہوا۔ ہر زون ایک عالم ہے جس میں روح بستی ہے۔ اس اعتبار سے دنیاوی شعور جب بہتر ہزار گنا تیز ہو جاتا ہے تو اسے تجلی کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ روحانی راستہ روح کے ادراک کے ان پردون سے گزرتا ہے۔ سالک جس زون سے گزرتا ہے اسی زون کے حواس و کیفیات اس پر وارد ہوتی ہیں اور وہ ان میں معنی پہناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندے کو احسن تقویم ی اعلیٰ علیین کے حواس پر پیدا کیا ہے۔ اعلیٰ علیین، علیین کے حواس تجلی کا ادراک ہے جو دنیاوی شعور سے بہتر گنا زیادہ ہے۔

مرکزیت کیسے حاصل کی جاتی ہے

روحانی نقطہ ء نظر سے مرکزیت کا قانون ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ روحانی علوم سیکھنے کے لئے ایک روحانی استاد کی ضرورت ہے۔ جو سالک کی صحیح رہنمائی کر سکے اور شیخ کی صورت میں سالک کے ذہن کو روحانی نقطہ ءفکر نصیب ہو جاءے۔ فکر کے

www.ksars.org

اس نقطے پر سالک کے ذہن کے تمام خیالات مجتمع ہو جاتے ہیں اور پھر اس کا ذہن فکر کی گہرائی میں داخل ہو جاتا ہے۔اس سلسلے میں جو باتیں مرید کو فائدہ پہنچاتی ہیں وہ یہ ہیں۔

صحبت شیخ، تعمیل حکم، شیخ پر مکمل بھروسہ، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا، آداب مرشد کو ملحوظ خاطر رکھنا، شیخ کی طرز فکر کو اپنانا شیخ کے بارے میں ذرہ برابر بھی بدگمانی نہ کرنا چاہئے۔اس عمل سے شیخ کی طرز فکر منتقل ہو جاتی ہے اور مرید شیخ کی توجہ اور تصرف کے ساتھ اپنے ہی نقطہ ءذات میں صعود کرنے لگتا ہے۔مرید روحانی عالم میں جہاں جہاں سیر کرتا ہے مرشد کی توجہ اور اس کا تصرف سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتا ہے یعنی روحانی راستے میں مرید کو جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے وہ شیخ کی توجہ اور تصرف کے ذریعے ہوتا ہے۔روحانی دنیا میں شیخ اللہ کے نائب کی حیثیت سے مرید کو اللہ تعالی سے روشناس کراتا ہے اور غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے آداب سکھاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

محبت

1. محبت سے مراد یہ ہے کہ کسی سے ہمدردی کرے۔
2. کسی کی جانب بے لوث مخلوص اور جذبات کے بہاؤ اور ہمدردی کے جذبات کا اظہار محبت ہے۔
3. کسی سے انسیت، چاہت اور ہمدردی کے جذبات کا اظہار محبت ہے۔
4. محبت تسلیم ورضا کا نام ہے۔
5. دو اجسام کے درمیان قوت کشش کا نام محبت ہے۔
6. کسی کی ذات کو اپنے حواس پر محیط کر لینا محبت ہے۔
7. محبت ایک ایسا اندرونی جذبہ ہے جو پہلے تو آدمی کو کسی ہستی کی طرف راغب کرتا ہے اور اپنی انتہا میں اس بات کا متقاضی بن جاتا ہے کہ آدمی اپنے محبوب پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دے۔
8. محب کا محبوب کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا اور اپنی خواہشات پر اس کی خواہشات کو ترجیح دینا محبت ہے۔
9. دل میں گداز اور خلوص کا نام محبت ہے۔
10. محبت ایک ناقابل بیان جذبہ ہے۔
11. محبت نور کی لطافت کا نام ہے۔
12. اللہ اور مخلوق کے درمیانی رشتے کا نام محبت ہے۔
13. محبت فطرت ہے۔ محبت کائنات کی روح ہے۔ جس طرح روح کے بغیر جسم مردہ ہے محبت کے بغیر کائنات ادھوری ہے۔
14. تمام مثبت خیالات کا مرکز محبت ہے۔
15. محبت وہ نظر ہے جو شئے میں نقص نہیں دیکھتی۔

www.ksars.org

☆☆☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱ محبت کیا ہے؟ روحانیت میں محبت کی اہمیت کیا ہے؟

سوال نمبر ۲ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں یہ یقین ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۳ سالک کے لئے کیوں ضروری ہے کہ مرشد سے محبت کرے؟

سوال نمبر ۴ محبت فاتح عالم کس طرح ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

محبت فطرت ہے اور فطرت خالقیت کا مظاہرہ ہے۔ ہماری زندگی میں آئے دن اس کی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جیسے بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ماں کی پہلی نظر میں بچے کے لئے ممتا کی ساری محبتیں سمٹ آتی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی بھی دیکھنے والا اسے پہچان جاتا ہے۔ اللہ پاک کے عطا کردہ اختیار کے مطابق ماں اپنے بچے کی خالق ہے۔ اپنی تخلیق پر پہلی نظر خالقیت کی نظر ہے۔ جو ماں کے ذریعے سے بچے پر پڑتی ہے۔ اس نظر میں محبت کے جذبے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خالق کائنات نے بھی جب کائنات بنائی اور بنانے کے بعد اس پر نظر ڈالی تو اس نظر میں خالقیت کا سارا جمال سمٹ آیا اور یہ جمال کائنات کے ذرے ذرے میں محبت بن کر جذب ہو گیا یعنی خالق کائنات کا پہلا ادراک محبت ہے۔ یہ اسم رحیم کی تجلی ہے اور اس کا رنگ سرخ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ محبت ہمارے اندر کیا جذبات ابھارتی ہے۔

محبت ہمیں فرمانبرداری سکھاتی ہے۔ محبت انکساری و عاجزی پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے کی محبت میں آدمی اپنے نفس کو بھول جاتا ہے۔ محبت میں آدمی اپنا تن من دھن قربان کر کے بھی یہ سمجھتا ہے کہ کچھ بھی نہیں کیا۔ محبوب اگر

www.ksars.org

ایک نظر بھی دیکھ لیتا ہے تو محب یہ سمجھتا ہے کہ مجھے ہفت اقلیم مل گئے۔ محبت میں وفا و جفا مساوی نظر آتی ہیں۔ یعنی محبت اس قدر پازیٹو جذبہ ہے کہ محبوب کے کسی بھی طرز عمل و طرز سلوک کو نیگیٹیو معنی نہیں پہناتا ہے بلکہ جفا کے اندر بھی کوئی نہ کوئی حکمت تلاش کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور ہر حال میں محبوب کے ساتھ راضی اور خوش رہتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ذہن کے نیگیٹیو خیالات کو دبا دیتا ہے اور ان کا رخ پازیٹو کی جانب موڑ دیتا ہے۔ محبت ادراک کا پہلا عکس ہے۔ عدم سے وجود میں آتے ہی کائنات نے یعنی روحوں نے سب سے پہلے اللہ کی جس صفت کا ادراک کیا وہ محبت ہے۔ روحوں نے جان لیا کہ کوئی نہایت ہی محبت سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور اس لمحے روحوں کو نہ اپنی خبر تھی نہ اللہ کی۔ بس گمشدگی کے عالم میں محبت کا ایک ادراک ابھر آیا۔ جیسے سمندر کی تہہ میں پانی کی بوند کے اندر سرخ ذرہ چمک اٹھا۔ پس خالق کی نگاہِ محبت کا ادراک کائنات کی تمام روحوں کے ادراک کی بنیاد بن گیا۔ کائنات کی ہر مخلوق بنیادی طور پر اپنے خالق کو پہچانتی ہے۔ روح فطری طور پر اللہ پاک سے محبت رکھتی ہے۔ روح کی محبت کا عکس کائنات کے ذرے ذرے میں ہے۔ اسی جذبے کے تحت جانور بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ محبت فاتح عالم ہے۔ عالم محسوسات میں محبت ہی بنیادی حس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب محبت سے کام لیا جاتا ہے تو حواس کی گہرائی میں محبت کی لہریں متحرک ہو جاتی ہیں اور اس کے اثرات دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔ نظر تمام حواس کا مجموعہ ہے۔ روح پر اللہ کی وہ نظر جو ازل میں ڈالی گئی وہ نظر روح کے ادراک و حواس کی بنیاد بنی۔ روح کا ازل سے لے کر ابد تک کا سفر اللہ کی نظر کی روشنی میں ہے۔ اللہ کی نظر نے کائنات کی ہر شئے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اللہ کی نظر کے گھیراؤ کا تصور مرتبہ احسان کہلاتا ہے۔ حضور پاکؐ کا قول ہے کہ نماز کی حالت میں تصور کرو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے اور تم اللہ کو اللہ کی نظر کی روشنی میں دیکھ رہے ہو۔ ادراک ہی یقین ہے جیسے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ کے انوار نے ہمیں ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے اسی لمحے بندہ ان انوار کا ادراک کسی نہ کسی طرح کر لیتا ہے۔ کبھی نور کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے ہو جاتا ہے کبھی نماز میں سرور آجاتا ہے۔ کبھی اس قدر بے خبری ہو جاتی ہے کہ وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ کبھی نماز میں مادی جسم انتہائی لطیف محسوس ہوتا ہے۔ یہ ساری حالتیں اللہ کے نور کا ادراک ہیں جو مادی حواس کے دائرے میں بندہ کرتا ہے مگر یہ ادراک مادی حواس کی گہرائی کے رخ میں ہوتا ہے اور اس کی شرط پوری پوری ذہنی یکسوئی اور دھیان ہے۔

www.ksars.org

محبت ادراک کل ہے جیسا کہ آپ کو پہلے بتایا جاچکا ہے کہ نگاہ تمام حواس کا مجموعہ ہے۔جب کسی شئے کو دیکھا جاتا ہے تو بغیر چھوئے ہوئے بھی اس کی نرمی، گرمی، موٹائی، ٹھوس پن، لطافت غرض کہ ہر چیز کا تقریباً پتہ چل جاتا ہے۔یعنی نگاہ مکمل علوم رکھتی ہے۔ مگر اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ انسان کمزور ہے۔اس کے مادی حواس ناقص ہیں۔اس کا مطلب یہ کہ آدمی کی مادی نظر کمزور ہے۔ نظر کی کمزوری کے لئے چشمہ لگانا پڑتا ہے۔ چشمے یا عینک سے نظر کی کمزوری دور ہو جاتی ہے اور صاف نظر آتا ہے۔ چشمے یا عینک سے نظر کی کمزوری دور ہو جاتی ہے اور صاف نظر آتا ہے۔روحانی سفر میں کوئی طالب علم جب علم سیکھنے کی غرض سے مرشد کا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہے تو مرشد اپنے ادراک کی عینک اس کی آنکھوں پر لگا دیتا ہے۔ مگر جیسا کہ آپ جانتے ہیں عینک کے بے شمار لینس اور شیشوں کے نمبر ہوتے ہیں۔ کسی میں قریب سے صاف دکھائی دیتا ہے کوئی دور سے اچھی طرح دکھائی دیتا ہے۔

اعلیٰ علیین کے حواس اسمائے الٰہیہ کے حواس ہیں۔ہر شخص کی آنکھوں کا چشمہ مختلف نمبر کا ہوتا ہے۔ایک چشمہ دوسرے کو بہت کم ہی لگتا ہے۔روح کو اللہ پاک نے اعلیٰ علیین جس میں روح اسمائے الٰہیہ کی تجلیات کو دیکھتی اور پہچانتی ہے۔روح کی تمام صلاحیتیں اسمائے الٰہیہ کے انوار ہیں۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اللہ سمیع اللہ و بصیر۔اللہ ہی سنتا ہے اللہ ہی دیکھتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سماعت اور بصارت کی صفات اللہ پاک کی ہیں۔ بندہ اور تمام مخلوق اللہ کی سماعت سے سنتی ہے اور اللہ کی بصارت سے دیکھتی ہے۔اللہ پاک نے روح کے حواس کو معتبر قرار دیا ہے۔ اسمائے الٰہیہ کے انوار براہ راست روح کے حواس اور صلاحیتیں بنتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں روح کی آنکھ پر اسم بصیر کی عینک لگی ہے۔ جس طرح اللہ کی بصارت کائنات میں دیکھتی ہے۔روح بھی اسی طرح دیکھتی ہے اور روح کی سماعت اسم سمیع کی روشنی ہے۔کائنات میں جس طرح اللہ کی سماعت کام کر رہی ہے روح بھی ان آوازوں کو سنتی ہے۔مادی حواس کو کمزور اس وجہ سے کہا گیا کہ مادی آنکھ روح کی آنکھ کا بہتر ہزارواں لینس ہے۔روح کی آنکھ بہتر ہزار لینس کے ساتھ جب دیکھتی ہے تو اسے ہر شئے مادہ یا Matter کی دکھائی دیتی ہے۔اسی حوالے سے ہر حس کے اتنے ہی درجات ہوگئے۔ کوئی بھی حس جس درجے میں کام کرتی ہے وہی حواس آدمی پر مرتب ہوتے ہیں۔اللہ کی پہلے نظر کا ادراک جب روح کے ذریعے شعور تک پہنچتا ہے اس ادراک کو مرتبہ احسان کہا گیا ہے اور جب ناسوتی حواس میں اللہ کی نظر کی روشنی داخل ہو جاتی ہے تو شعور و عقل میں تفکر کا ایک نیا راستہ کھل جاتا ہے۔اسی فکر کو فکر وحدانی کہتے ہیں۔ جس کے ذریعے ناسوتی عقل و حواس نور سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ کل ذات اللہ ہے۔ادراک کل بھی اللہ ہی کا ادراک ہے۔ادراک کل محبت ہے۔اللہ پاک پیکر محبت ہے۔ باقی تمام ادراک اس

www.ksars.org

کی محبت کی تقسیم ہے۔روزمرہ زندگی میں ہر شخص اس بات کا بارہا تجربہ کرچکا ہوگا کہ محبت میں کشش ہے۔محبت کی ڈور دلوں کو باندھ دیتی ہے۔ایک دل دوسرے دل کی جانب محبت کی ڈور سے کھنچا چلا آتا ہے۔دل مرکز ہے اور مرکز وہ نقطہ ہے جہاں تمام حواس ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ تمام حواس کا مجموعہ نظر ہے۔ نظر کا فطری اور طبعی وازلی ادراک محبت ہے۔محبت دل کا ادراک ہے جب ایک بندہ اللہ کے لئے دوسرے بندے سے محبت کرتا ہے تو اللہ کی محبت کی ڈور ان دونوں کو آپس میں باندھ دیتی ہے۔ایک دل دوسرے دل کو پہچان لیتا ہے۔ایک روح دوسری روح کو دوست کی حیثیت سے جان اور پہچان لیتی ہے۔ محبت ہی وہ ادراک ہے جس سے ایک روح دوسری روح کے قریب ہوتی ہے۔محبت دوہستیوں کے درمیان فاصلہ مٹادیتی ہے۔محبت جس طرح ایک بندے کو دوسرے بندے کے قریب کرتی ہے ایک روح کو دوسری روح کے قریب کرتی ہے اسی طرح اللہ سے محبت کرنے والے بندے کو محبت کی کشش اللہ کے قریب کردیتی ہے۔آپ کے سامنے پیغمبروں کی طرز زندگی ہے۔اللہ والوں کی زندگی کے نقشے ہیں۔حضرت بلالؓ کا واقعہ یاد کیجئے۔لوگوں نے انہیں تپتی ریت کے اندر گردن تک دفن کردیا۔ چلچلاتی دھوپ میں سارا سارا دن اسی حالت میں رہے مگر اللہ کے عشق سے انکار نہ کرسکے۔ آہ! کیا آپ محبت کی اس گہرائی کو اپنے دل میں محسوس نہیں کرتے۔ آہ! کیا آپ کے دل کی نظر حضرت بلالؓ کے دل کو اللہ کی محبت کے نور کی ڈوریوں میں بندھا نہیں دیکھتی جو دل ہر طرف سے اللہ کی محبت میں جکڑا جاتا ہے۔وہ دل کیسے انکار کرسکتا ہے۔وہ دل اس کے قبضے میں رہتا ہی کب ہے۔اس پر تو اس کے محبوب کا قبضہ ہوجاتا ہے۔ محبت تو شمع اور پروانے کا کھیل ہے۔ محبت کے کھیل میں دونوں ہی جلتے ہیں۔ محبت کا ادراک عاشق اور معشوق دونوں پر یکساں رہتا ہے۔ محبت نظر کا ادراک ہے۔جب ایک فرد دوسرے کو محبت سے دیکھتا ہے تو دوسرا بھی اسے محبت سے دیکھتا ہے۔اللہ کی نظر کا مکمل ادراک روح میں موجود ہے۔ باقی ساری کائنات روح کے ادراک کا پھیلاؤ ہے۔ازل میں اللہ نے جب اپنی تخلیق روح کو دیکھا تو اللہ کی نظر کی روشنیاں روح کے اندر جذب ہوگئیں اور روح کے اندر روشنیوں کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ ایک خوبصورت گلاب کا پھول ہاتھ میں لیتے ہیں۔اسے دیکھ کر اور سونگھ کر آپ کو جو خوشی ہوتی ہے اس کا اظہار آپ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔آپ کے ہونٹ اسے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔اسی طرح آپ کی تمام حسیں خوشی کے اظہار میں شامل ہوجاتی ہیں۔ہر حس ایک مخصوص طرز پر اپنا اظہار کرتی ہے۔بالکل اسی طرح اللہ کے دیدار پر اصل میں روح نے جو خوشی کا اظہار کیا تو ساری کائنات وجود میں آگئی ۔ یہ اظہار حقیقت محمدیؐ روح اعظم کا اظہار ہے۔ جسے نور اول بھی کہا جاتا ہے اور اسی نور کو باعث تخلیق کائنات کہا گیا ہے۔کائنات کی ہر شئے حقیقت محمدیؐ یا روح محمدیؐ کا ادراک ہے جسے روح محمدیؐ کا اللہ کی تجلی کو دیکھ خوشی کا اظہار پھول ہے۔جب روح محمدیؐ اللہ

www.ksars.org

کے دیدار سے خوش ہوئی تو ساری کائنات میں پھول کھل گئے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں ہم نے ہر شئے کو اس کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ فطرت در حقیقت روح اعظم یا حقیقت محمدیؐ کا ادراک ہے جو روح کا ازلی شعور ہے اور ازلی حواس ہیں۔ یہی ازلی شعور اللہ سے قریب ہے۔ اسی کو اللہ نے کہا ہے کہ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ فطرت ہی خالق کی پہچان ہے۔ فطرت ہی روح اعظم کا شعور ہے۔ دین اسلام فطرت کے اصول و قوانین ہیں۔ ہر وہ ادراک جو فطرت میں داخل ہے وہ دین ہے اور فطرت بدل نہیں سکتی۔ اس لئے کہ فطرت اسمائے الٰہیہ کی روشنیوں کا ادراک ہے۔ کائنات کی ہر نوع کوئی ایک فطرت کا مظاہرہ عام طور سے کر رہی ہے۔ جیسے پرندے اپنی اڑان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اڑان ایک فطرت بن کر کام کر رہی ہے جو بدل نہیں سکتی۔ کوئی نوع درندگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ غرض کہ کائنات کی اشیاء کا مطالعہ کرنے سے فطرت سامنے آجاتی ہے۔ انسان فطرت کا مجموعہ ہے۔ اس کو کائنات کہا گیا ہے۔ فطرت کی بنیاد محبت پر ہے۔ یعنی دین کی بنیاد محبت پر ہے۔ دین سے محبت نکل جائے تو وہ دین باقی نہیں رہتا۔ بھلا بنیاد کے بغیر بھی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ تسخیر کائنات خود اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے اور اس فطرت سے اسی کے مطابق کام لیتا ہے تو ایسی صورت میں وہ کائنات کی تسخیر کر لیتا ہے۔ روحانی علوم تسخیر کائنات کے علوم ہیں۔ ایک روحانی علوم کا طالب یہ بات جانتا ہے کہ یہ کائنات ظاہر میں نہیں بلکہ اس کے اپنے باطن میں ہے۔ ورنہ ظاہری کائنات کو تسخیر کرنے کے لئے تو لاکھوں برس کی عمرؓ بھی آدمی کے لئے ناکافی ہے۔ وہ ساری کائنات میں کہاں گھوم سکتا ہے۔ البتہ باطن میں جو کائنات ہے اس میں اللہ کی محبت اور حضور پاکؐ کی رحمت سے ان کے فضل و کرم سے وہ جہاں بھی سیر کرادیں ان کے لئے زندگی کا ایک لمحہ بھی لاکھوں برس کے برابر ہے۔ محبت کا ادراک ٹائم اینڈ اسپیس کو ختم کر دیتا ہے۔ ایک روحانی آدمی کے ہر جذبے پر جب محبت کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو اس کا غصہ اور غضب بھی اللہ کا جلال بن جاتا ہے۔ اس سے دوسرے بندے کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس کے سفلی جذبات جل جاتے ہیں اور بندے کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ یہ سب رحمت للعالمینؐ کا وصف ہے۔ رحمت اللہ تعالیٰ کی محبت کا اظہار ہے جس کا وسیلہ حضور پاکؐ کی ذات اقدس ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

مجاہدہ

1. اپنی خواہشات پر رضائے الٰہی کا رنگ چڑھا مجاہدہء نفس ہے۔اس کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ کوئی کام رضائے الٰہی کے بغیر نہ ہو۔
2. اپنی عام روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر کچھ ایسی روٹین اپنانا جس سے مادیت سے ذہن ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی جانب راغب ہو۔
3. مادی اشیاء کی پروانہ کرتے ہوئے ہر شئے کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جان کر اس پر شکر گزار ہونا مجاہدہ نفس ہے۔
4. اپنے ارادے پر اللہ تعالیٰ کے ارادے کو ترجیح دینا مجاہدہ نفس ہے۔
5. اللہ کے سوا کسی سے توقعات نہ رکھنا مجاہدہ نفس ہے۔
6. ہر غم وخوشی میں اللہ کو شریک کرنا مجاہدہ نفس ہے۔
7. خواہشات کی تکمیل صحیح طور پر کرنا اور خیالات کا مفہوم مثبت انداز میں لینا جاہدہ نفس ہے۔
8. اللہ کے نور سے نفس کو پاک کرنا یعنی کثافت ختم کر کے لطافت بھرنا جاہدہ نفس ہے۔
9. ایثار کا نام جاہدہ نفس ہے۔
10. اپنی خواہشات کو اللہ کی رضا کے تابع کرنا اور ہر اس برائی سے دور رہنا جس قرآں منع کرتا ہے جاہدہ نفس ہے۔
11. اپنی طرز فکر کو اللہ کی رضا کے مطابق ڈھال لینا جاہدہ نفس ہے۔
12. بے جا خواہشات ہر کنٹرول کرنا جاہدہ نفس ہے۔
13. نامساعد حالات سے سمجھوتہ کر لینا جاہدہ نفس ہے۔
14. اپنے نفس کو تکلیف ورنج دے کر دوسرے کو خوش کرنا جاہدہ نفس ہے۔
15. غرور کا ترک کرنا جاہدہ نفس ہے۔

www.ksars.org

☆☆☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا اس حدیث کا مفہوم کیا ہے ؟
سوال نمبر ۲ جاہدہ نفس کیا ہے اور روحانیت میں اس کے کیا فوائد ہیں ؟
سوال نمبر ۳ سالک کے لئے جاہدہ نفس کیوں ضروری ہے ؟
سوال نمبر ۴ غرور اور حسد کے کیا نقصانات ہیں ؟

☆☆☆☆☆☆☆

مثل مشہور ہے کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ مگر آنکھ اسے سونا ہی سمجھ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظر کی اس اطلاع پر تمام اعضاء حرکت میں آجاتے ہیں اور آدمی اسے سونا سمجھ کر اٹھالیتا ہے۔ مگر جب عقل اس میں غور کرتی ہے تو پھر اس کی اصیت معلوم ہو جاتی ہے۔ دنیاوی نفس ہر شئے کو مادی حواس کے ذریعے سے پہچانتا ہے۔ مادی حواس ناقص ہیں۔ آنکھ دیکھ کر بھی دھوکہ کھا جاتی ہے۔ کان سن کر بھی بہرے بن جاتے ہیں۔ عقل غور و فکر کر کے بھی لاعلم اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ کان سن کر بھی بہرے بن جاتے ہیں۔ عقل غور و فکر کر کے بھی لاعلم اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ غرض کہ یہ دو حواس ہیں جو اللہ کے علوم اور کائنات کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ مجاہدہ نفس در حقیقت وہ مشقیں اور اعمال ہیں جن کے ذریعے نفس کی کمزوری دور ہو۔ مجاہدہ نفس بھی وہ خاصل غذا ہے جو کمزور اور ناقص نفس کو دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے سے قوت پکڑے۔ انسان کے جسم میں دماغ ہی وہ مشین ہے جس کے ذریعے سے انسان خود اپنی ذات سے بھی اور کائنات کے ساتھ بھی اور اللہ کے ساتھ بھی رابطہ رکھتا ہے۔ یعنی ہر شئے کو انسان عقل سے پہچانتا ہے۔ دنیاوی عقل اتنی ناقص ہے کہ اس کی فکر شئے کی گہرائی میں مشکل سے ہی پہنچتی ہے۔ اللہ تک پہنچنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ روحانی راستے پر چلنے والے کا منشاء اور کوشش و جستجو یہی ہوتی ہے ک اسے اللہ کا سراغ مل جائے اور اللہ کے علم میں بندے کا جو مقام ہے وہ اسے پہچان جائے۔ جب اس کام کے لئے وہ اپنی دنیاوی عقل سے کام لیتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس عقل کے ساتھ تو وہ مکھی اور مچھر کے اندر بھی کام کرنے والی روشنیوں کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ کجا اللہ کا نور کہ جس کی وہ جستجو میں ہے۔ جیسے جیسے اس کے

www.ksars.org

اندر نور کو پانے کی جستجو بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اسے اپنے نفس کی کمزوریوں کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ دوسری جانب عقل کی کمزوری اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہے۔ ایسی صورر میں جب تجسس چاروں طرف سے عقل کو گھیر لیتا ہے تو آدمی اپنے کمزور نفس کو اللہ کی جانب قدم بڑھانے پر آمادہ کر لیتا ہے اور اس کی کمزوریوں پر نظر رکھتے ہوئے اسے ان مجاہدوں سے گزارتا ہے جو نفس کے نقائص کو دور کر کے اسے اللہ کے راستوں پر چلنے میں مدد دیتے ہیں۔ یعنی وہ مادی عقل کو مادی روشنیوں کی بجائے نورارنی روشنیوں سے سیر اب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عقل کی مادی روشنی نور میں گم ہو جاتی ہے اور اس کا روحانی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔

قرآن نے مجاہدہء نفس کے لئے صلوۃ اور زکوۃ کا پروگرام بنایا ہے۔ صلوۃ کے ذریعے آدمی اپنے جسم اور ذہن کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگاتا ہے اور زکوۃ کے ذریعے زندگی کو آرام و آسائش فراہم کرنے والے وسائل کو صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی آرام و آسائش پہچانے کے لئے استعمال کرنا سیکھتا ہے۔ انسان تقاضوں کا مجموعہ ہے۔ دیناوی نفس کے اندر دنیاوی ضروریات کے تقاضے ابھرتے رہتے ہیں اور روحانی نفس کے اندر روح کے تقاضے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا میں آدمی چونکہ ظاہری حواس واحساسات کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے اس لئے دنیاوی تقاضوں کی شدت حواس کے دائروں میں زیادہ محسوس کرتا ہے۔ اس شدت کے پردے میں روحانی تقاضے حواس سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اب جب تک باطنی حواس کو ظاہری حواس پر غالب نہ کیا جائے گا روح کے تقاضوں کا پتہ نیں چلے گا۔ دنیاوی نفس چونکہ مادی شعور ہے اس لئے مادی دنیا کی ہر شئے کے لئے اس کے اندر ایک کشش پائی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو آخرت کی دنیا کے طالب ہیں وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر ان کا دھیان مادی دنیا ہیں لگ گیا تو جسمانی زندگی ختم ہونے کے بعد یہ سارے عیش بھی ختم ہو جائیں گے اور آخرت مین وہ تہی دست ہوں گے۔ اس لئے وہ اپنے اوپر جبر کر کے اپنی خواہشات کو کنڑول کرتے ہیں اور اپنے نفس کو عبادت و ریاضت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اللہ کی جانب راغب رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے اللہ پاک فرماتے ہیں کہ "وہ لوگ جنہوں نے کوشش کی ہمارے دین میں ہم ان کو اپنے راستے دکھا دیتے ہیں۔"

www.ksars.org

خواہش نفس کا ترک کرنا مجاہدہ ہے۔ کیونکہ جب نفس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو نفس بہت تلملاتا ہے۔ ایسی صورت میں صبر وضبط کے ساتھ کام لیناپڑتا ہے۔ صبر نفس کے لئے ایسا ہے جیسے موم بتی کے لئے آگ کہ اس کے جلانے سے موم بتی پگھل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جل جل کے بالکل ہی ختم ہو جاتیہ ے۔ صرف پگھلا ہوا موم باقی رہتا ہے مگر موم بتی کی صورت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اس موم کو موم بتی نہیں کہا جاسکتا۔ مجاہدہء نفس میں آدمی اس قدر صبر وضبط سے کام لیتا ہے کہ رفتہ رفتہ موم بتی کی عدم نفس بھی جل جل کر اپنے آپ کو ختم کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نفسانی خواہشات پر روحانی تقاضے غالب آجاتے ہین اور روح اللہ کے امر کی ادائیگی نفس کے ساتھ آسانی سے کر لیتی ہے۔

نفس کی سب سے بڑی خرابی اور بیماری غرور ہے جو خواہش نفس کی پیروی سے پیدا ہوتا ہے۔ غرور سے حسد جیسی بیماری بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ حسد آگ ہے جو آدمی کی نیکیوں کو جلا کر تباہ کر دیتی ہے۔ شریعت کے جتنے بھی اصول ہیں وہ سارے کے سارے نفس کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے ہیں۔ ہر مذہب میں روزے فرض کئے گئے ہیں۔ مادی نفس کی ظاہری صورت جسم ہے اور باطنی صورت عقل ہے۔ مادی نفس اپنی ایندھن اور انرجی غذا کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ کھانا کھانے سے جسم بھی توانا ہوتا ہے اور مادی شعور بھی مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس طرح غذا کے ذریعے مادی نفس کے دونوں رخ تقویت حاصل کرتے ہیں۔ روزے میں جب غذا نہیں ملتی تو جسم بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شعور و عقل بھی ناتوں ہو جاتی ہے۔ مگر اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر شئے کو متعین مقداروں میں بنایا ہے۔ پس جیسے ہی ظاہری حواس کے دائروں میں مادی روشنیوں کی کمی ہو جاتی ہے روح کی روشنیاں اس کی جگہ لے لیتی ہیں۔ مسلسل روزے رکھنے سے آہستہ آہستہ نفس کی روشنیوں کی جگہ روح کی روشنیاں نفس کے دائرے میں منتقل ہوتی جاتی ہیں۔ جیسے جسم کا گندا خون نکال کر ساتھ ہی ساتھ دوسرا خون ڈالا جاتا ہے۔ روح کی روشنیاں نور ہیں۔ نور عقل کو سوچنے سمجھنے کی ایسی صلاحیتیں مہیا کرتا ہے کہ عقل مادی دنیا کی چمک اور کشش سے آزاد ہو کر فکر کرتی ہے اوشئے کی حکمتوں میں غور کرتی ہے۔ گذشتہ زمانے کے لوگ اپنے نفس کو بڑے کٹھن مجاہدوں سے گزارتے تھے۔ جیسے جاڑوں کی ٹھنڈی راتوں میں سرد پانی سے غسل کرنا، لذیذ کھانوں سے پرہیز کرنا صرف روکھی سوکھی غذا کھانا، ٹاٹ اور گدڑی کا لباس پہننا، اس کے علاوہ گھروں سے دور جنگل میں نکل کر عبادت وریاضت کرنا، لوگوں کے درمیان نفس کو ذلت ورسوائی میں دیکھ کر صبر کرنا، ان کے

www.ksars.org

علاوہ ایسی ہی بے شمار ریاضتیں تھیں جن کے ذریعے ہمارے بزرگوں نے روحانی راستوں میں کامیابی حاصل کی۔ ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ تقاضوں کی مناسبت سے اعمال وافعال بھی بدل جاتے ہیں۔ آج کے دور میں روحانی علوم سیکھنے کے لئے نفس کو جن مجاہدوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ پہلے ادوار کی نسبت بالکل مختلف ہیں۔ آج کے دور میں جنگل بیابان ہی جانے کا تصور نہیں ہے۔ روکھی سوکھی غذا کھانے اور ٹاٹ یا گدڑی پہننے کا تصور بھی ختم ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں سائنسی ترقی کی وجہ سے عقل مادی راستوں پر بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ آدمی انواع واقسام کی دنیاوی اشیاء میں ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر حاوی روشنیوں کا دباؤ پڑتا رہتا ہے۔ عقل ہر وقت اس بوجھ تلے دبی رہتی ہے۔ آج کے دور میں معاشرے میں عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے گھر میں ہی آدمی کو بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لئے نفس کو مجاہدوں کی چکی میں پسنا پڑتا ہے۔ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ روحانی علوم سیکھنے کے لئے اور اللہ تک پہنچنے کے لئے نفس کو تکلیف دینا ضروری ہے۔ سو یہ سنت پہلے بھی تھی اور پہلے وقتوں میں بھی اس پر عمل ہوتا رہتا ہے اور آج کے دور میں بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ بس نفس کے آزاد کے سامان بدل گئے ہیں۔ اللہ نے شریعت کے جو احکامات تمام لوگوں پر فرض کئے ہیں مثلاً روزہ، نماز، زکوۃ، صدقہ، خیرات، حقوق العباد، حلال حرام میں تمیز غرض کہ وہ احکامات جو ہر مذہب میں ضروری قرار دیئے گئے ہیں وہ نفس پر قابو پانے کے لئے اور اس کی پاکی کے لئے ضروری ہیں۔ ترک خواہشات اللہ کی رضا کی نیت سے ہونی چاہئے۔ تاکہ نفس کی ضرورت کے تحت مثلاً بیماری کے خوف سے کوئی کھانا چھوڑ دے تو یہ روزہ نہیں کہلائے گا۔ نا ہی اس کا فائدہ روزے کا ہوگا۔ کمزوری بدن وشعور تو ضرور ہوگا مگر چونکہ اللہ کا تصور نہیں ہے اس لئے ایسے بھوکے رہنے سے ناتواں عقل باغی ہو کر اور بھی غلط انداز میں سوچنا شروع کر دے گی۔ ایسے بھوکے رہنے سے روحانی شعور نہیں بڑھتا۔ نہ ہی روحانی صلاحیتیں غالب آتی ہیں۔ یہی بات اللہ بھی اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ اللہ تک تمہاری نیت پہنچتی ہے، عمل نہیں۔ نیت ارادے کی وہ قوت ہے جو عمل کے لئے توانائی فراہم کرتی ہے۔ اگر نیت اللہ کی رضا ہوگی تو ارادے کے اندر اللہ کے نور سے عمل کو حرکت کی توانائی منتقل ہوگی اور اگر نیت میں نفس کی خوشی ہے تو نفس کی روشنیوں سے کام کرنے کی قوت عمل میں منتقل ہوگی۔ جن روشنیوں سے حرکت ہوگی عمل کی حرکت بھی اس مناسبت سے ہوگی۔ اللہ کی رضا کی نیت بندے کے عمل کو اللہ کے قریب کر دیتی ہے

www.ksars.org

اور نفس کی نیت بندے کے عمل کو نفس سے قریب کر دیتی ہے۔ بندے کی محبت ان اعمال کی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے جس طرف کا پلڑا بھاری ہو گا اسی طرف راہ ملے گی۔

آج کے دور میں جب کہ دنیاوی مصروفیات حد سے بڑھ گئی ہیں، معاشرتی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے آدمی کو ہر وقت روزگار سے ہر فرصت نہیں ملتی۔ عورتوں کو گھریلو کام دو منٹ چین نہیں لینے دیتے۔ بے شک یہ ساری الجھنیں ہیں اور ضرور ہیں مگر جتنا حق ہمارے نفس کا ہم پر ہے اتنا ہی حق ہمارے خالق کا بھی ہماری جانوں پر ہے۔ اگر ہم نفس کے آرام کی خاطر بارہ گھنٹے کام کر سکتے ہیں تو روح کے آرام کی خاطر بھی تو اپنے رب کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کر سکتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سے ایسا روٹین بنانا چاہئے کہ بندہ نفس کو اللہ کی جانب اور اپنی روح کی جانب متوجہ کرنے کا بھی کچھ سامن کرے۔ جیسے صلوۃ۔ قرآن کا باترجمہ پڑھنا اور اس کی آیات میں غور کرنا، مراقبہ کرنا، خدمت خلق کے لئے کوئی کام کرنا علم روح کی غذا ہے۔ روح کی توانائی کے لئے روحانی اور بزرگوں کے واقعات پر مبنی لٹریچر پڑھنا۔ ہر کام کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں اللہ کا تصور قائم رکھنا۔ یہ ساری ایسی مشقیں ہیں جنہیں اگر پابندی کے ساتھ روزمرہ زندگی کے کاموں میں شامل کر لیا جائے تو نفس ان کے ذریعے ادب سیکھے گا اور روحانی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں گی۔ نفس کا ایک حربہ مکر کرنا بھی ہے۔ وہ انسان کے نیک ارادوں کے ارد گرد مکر کا ایک جال بن دیتا ہے۔ ایک روحانی شخصیت نفس کے اس فریب سے دھوکہ نہیں کھاتی بلکہ ایسے موقع پر نفس کی مخالفت کر کے نیک ارادوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ نفس کو کنٹرول میں رکھنے کا بہترین ذریعہ اللہ کا ذکر اور اللہ کا تصور ہے۔ جب اللہ کا تصور قلب وذہن میں اس طرح جاگزیں ہو جاتا ہے کہ دل میں اس کی محبت جڑ پکڑ لیتی ہے تب نفس پر اللہ کی محبت کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور نفس کا رنگ اس کے پردے میں چھپ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نفس مخالف نہیں بلکہ موافق ہو جاتا ہے اور بندہ اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.ksars.org

خدمت خلق

1. خلق خدا کی بے لوث خدمت کرنا اور اس راستے میں ہر قسم کی تکالیف برداشت کرنا خدمت خلق ہے۔
2. اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کسی بھی قسم کی اجرت لئے بغیر اپنے آپ کو خدمت خلق کے لئے وقف کر دینا۔
3. اللہ پاک کی طرز فکر اپنا کر بغیر کسی تعصب کے بے لوث خدمت کرنا خدمت خلق ہے۔
4. مخلوق یعنی انسانوں کے علاوہ ہر نوع کی بھلائی کے لئے وسائل اور تقاضوں کا صحیح استعمال کرنا خدمت خلق ہے۔
5. بغیر کسی لالچ کے اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا اور صلہ کی توقع نہ رکھنا سوائے اللہ کے خدمت خلق ہے۔
6. ضرورت مند سے دامے درمے سخنے تعاون کرنا خدمت خلق ہے۔
7. خلق کے لئے کام کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ جو اپنے لئے چاہے وہ دوسروں کے لئے بھی چاہے، یہی خدمت خلق ہے۔
8. سارے انسانوں کی بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت محض رضائے الٰہی کے لئے خدمت کرنا، مقولہ ہے " عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔" حدیث شریف ہے کہ انسانوں میں بہتر وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔
9. محبت کا دوسرا نام خدمت ہے۔ محبت کے بغیر خدمت نہیں کی جاسکتی خدمت خلق صفت ربوبیت کا عکس ہے۔
10. نائب حیثیت سے خدا تعالیٰ کی محبت اور ضروریات زندگی کے وسائل مخلوق میں تقسیم کرنا خدمت خلق ہے۔
11. اپنے دارہ اختیار میں مخلوق خدا کی ضروریات کا اس طرح خیال رکھنا جیسے اللہ رکھتا ہے، خدمت خلق ہے۔
12. لوگوں کے فائدے کے لئے اپنے نفس کو بے آرام کرنا خدمت خلق ہے۔
13. اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اپنی ذات ہر تقاضے سے بے نیاز ہونے کے باوجود مخلوق کے تقاضے پورے کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ ہر خواہش سے بے نیاز ہو کر بھی مخلوق کو حاجتوں کو پورا کر رہا ہے

www.ksars.org

اور مخلوق کی بغیر کسی معاوضے کے خدمت کر رہا ہے۔جب کوئی بندہ اللہ کے ذہن سے یا اللہ کی طرز فکر سے کام لیتے ہوئے مخلوق کی بے لوث خدمت کرتا ہے تو وہ اللہ کے کاموں میں اس کا معاون و مددگار بن جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

سوال نمبر ۱ خدمت خلق کیا ہے؟
سوال نمبر ۲ خدمت خلق کر کے ہم اللہ سے کس طرح قریب ہو سکتے ہیں؟
سوال نمبر ۳ خدمت کے کیا کیا فوائد اور نقصانات ہیں؟
سوال نمبر ۴ نفس کو کس طرح خدمت خلق پر آمادہ کرنا چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆

خدمت خلق اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا عکس ہے۔یوں تو کائنات کی تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہے مگر انسان کے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ اس کے ذریعے صفات کا جو بھی مظاہرہ ہو رہا ہے،اس کے علوم سے انسان کو واقفیت عطا کی گئی ہے. آدمی اس بات سے باخبر ہے کہ اس کے اندر جو صلاحیتیں موجود ہیں ان سے اپنے اردے سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسے ہی آدمی ان کی طرف توجہ دیتا ہے اور ان کو استعمال کرنا سیکھ لیتا ہے،اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات کائنات کے اندر کام کر رہی ہیں،ان تمام صفات کے انوار کی ترتیب سے روح آدم وجود میں آتی ہے۔اسمائے الٰہیہ کے انوار روح کی صلاحیتیں ہیں۔اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔اس کی ربوبیت کی تجلیات تمام مخلوق کو زندگی کے وسائل فراہم کر رہی ہیں۔ ربوبیت کا وصف روح کے ذریعے انسان کے اندر بھی منتقل ہو رہا ہے۔ جس طرح اللہ اپنی مخلوق کے لئے ضروریات زندگی کی ہر شے فراہم کرتا ہے اسی طرح آدمی بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت سے کام لے وہی کام کرتا ہے جو رب اپنی مخلوق کے لئے کر رہا ہے۔رب ہر قسم کی احتیاج سے بے نیاز ہونے کے باوجود بھی مخلوق کی حاجتوں کی پوری طرح پاسداری کرتا ہے۔ خدمت خلق رب کے کاموں میں شریک ہونا ہے۔ جس طرح رب العالمین تمام مخلوق کی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے ان کے لیے سہولتیں فراہم کرتا ہے، کوئی بندہ جب اپنے رب کی اس صفت سے کام لیتا ہے، یعنی خود اپنے اندر ربوبیت کی صفت کے انوار کو متحرک کر لیتا ہے، تو اس کی چھپی صلاحیتیں بیدار ہو کر آدمی کو اسی کام کی ترغیب دلاتی ہیں جو

www.ksars.org

کام رب کر رہا ہے۔اس طرح آدمی کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بڑھتا ہے۔صلاحیت اسی کام کی تواانرجی ہے۔جتنی زیادہ توانائی کام میں خرچ کی جائے گی، اتنا ہی زیادہ کام بھی ہو گا۔ایک روحانی آدمی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جو بھی کام کرے،اپنی انتہائی سکت کے مطابق کرے، جیسا کہ پیغمبران علیہ السلام اوران کے پیروکارنے کیا کہ بغیر کسی دنیاوی غرض کے، اللہ کی مخلوق سے محبت رکھتے ہوئے ان کی سہولت کے لیے جس طرح بھی ممکن ہوامدد کی۔انتہائی سکت آدمی کے اپنے ارادے کی آخری حد ہے۔اس حد سے اللہ کاارادہ شروع ہوتا ہے۔جب کوئی کام اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے اوراس کے اندر بندہ اپنی سکت کے مطابق اپنی آخری حد تک کام کرتا ہے،اس حد تک جس کے بعد وہ اپنے آپ کو قطعی طور پر بے بس اور مجبور سمجھ لیتا ہے، یہی وہ حد ہے جہاں سے اللہ تعالیٰ کاارادہ یعنی امر شروع ہوتا ہے۔غیب میں اللہ کے امر کے تجلیات و انوار کام کر رہے ہیں،اور وہ انوار انسان کے ارادے میں منتقل ہونے لگتے ہیں،اس طرح بندے کے ارادے میں اللہ کاارادہ شامل ہو جاتا ہے اوراُس پر رضائے الٰہی کادروازہ کھل جاتا ہے۔

آدمی جب کسی کے لیے کوئی کام کرتا ہے تواُس میں نفس کو تکلیف بھی اُٹھانی پڑتی ہے۔مادی نفس میں محدودیت کاشعور ہے اوراس محدودیت کے اندر صرف اپنی ہی ذات سمائی ہوئی ہے۔خدمتِ خلق کرتے ہوئے نفس کی جانب سے بارہااحتجاج ہوتا ہے۔آدمی اپنے اوپر ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی خوش اور مطمئن رہتا ہے، مگر کسی دوسرے پر تھوڑا سامال بھی خرچ کر کے جب نفس کی عینک سے اُسے دیکھتا ہے تو نفس بڑا چڑھا کر دکھاتا ہے۔جاننا چاہیے کہ نفس کی عینک کے لینس کی کیا فطرت ہے۔یہ عینک اپنی محدود حد سے باہر نہیں دیکھ سکتی،اپنی حد میں جو کچھ دیکھتی ہے،وہ نارمل سائز سے بڑا کر کے دکھاتی ہے،یعنی یہ محدب شیشہ ہے جو چھوٹے کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی پیچھے سے آنے والی روشنی کوایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے۔جیسا کہ محدب شیشے کو سورج کی روشنی کے سامنے رکھا جائے تو سورج کی روشنی اُس میں سے گزر کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور مرکز پر جمع ہونے کی وجہ سے ان کی حدت بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے اگر کاغذ اُس کے نیچے رکھا جائے تو جل اُٹھتا ہے۔اللہ کا جو نظام ظاہر میں کام کر رہا ہے،وہی باطن میں بھی کام کر رہا ہے۔مادی نفس جو انسان کو بُرائی کی طرف راغب کرتا ہے، جسم مثالی کی آگ کا محدب شیشہ ہے۔اس شیشے سے جب آنکھ دیکھتی ہے تو ناسوتی روشنی اُس شیشے سے گزر کر ایک مرکز پر پڑتی ہے، جس میں مثالی نفس کی لہروں سے بنا ہوا جسم ہے جو مادی لہریں ہیں،اُن کی طبّی

www.ksars.org

خاصیت آگ یا نار ہے۔ نسمہ کے جسم کی نگاہ کی روشنی بھی نسمہ کی لہریں ہیں، جن کے اندر حدت ہے۔ جب کوئی آدمی اپنی اَنا کے خول میں بند ہو جاتا ہے تو گویا کہ اُس کے نسمہ کا جسم اپنی آنکھوں کے اوپر محدب لینس چڑھالیتا ہے۔ نسمہ کا جسم ہماری مادی جسم کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ آدمی کی بینائی نسمہ کے جسم کی آنکھ کی روشنی ہے۔ انانیت کا غلبہ محدب نہیں ہے۔ نسمہ کی روشنی جب اس لینس سے گزرتی ہے تو اَنا کا غلبہ اُس کی تمام شعاعوں کو اکھٹا کر کے محدود نقطے پر جمع کر دیتا ہے۔ نسمہ کی لہریں ہی جسم کی اور مادی دماغ کی حرکت بنتی ہیں۔ مادی لہریں جب خیال کے ایک نقطہ پر ٹھہر جائیں گی تو قدرت کے قانون کے مطابق اس نقطے میں آگ جمع ہو جائے گی۔ بس آگ کا اثر آدمی کے عمل میں بھی ضرور آئے گا۔ اس کے مزاج سے ان لہروں کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ خود پسندی و خود نمائی، کبر و نخوت، حسد، جلن غرض کہ بہت سے بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ جس سے جسمانی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ جسمانی حرکت کی یہ لہریں اپنا کام ختم کر کے واپس نسمہ میں جذب ہو جاتی ہیں۔ یہی اعمال کا ریکارڈ ہے جسے طرز فکر بن جاتی ہے اور یہاں کی طرز فکر وہاں منتقل ہو جاتی ہے۔ وہی ریکارڈ مسلسل چلتا رہتا ہے یعنی اعراف میں بھی جسم مثالی یا نسمہ کا ہر عمل خود پسندی وانا کے دائرے میں ہو گا۔ نسمہ کا جسم اپنے اندر داخل ہونے والی آگ کو محسوس بھی کرے گا۔ یہی سزا ہے۔ خدمتِ خلق کے کاموں میں جب نفس کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور اگر آدمی اُس تکلیف کی طرف متوجہ نہ ہو اور نفس کی جانب دھیان نہ دے تو آہستہ آہستہ انا کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر نفس کسی کی خدمت میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ گویا نسمہ کی آنکھوں سے محدب لینس اتر جاتا ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں رب العالمین ہوں، سارے عالمین میں اس کی ربوبیت کے انوار پھیلے ہوئے ہیں۔ مخلوق اپنے خالق کو اس کی ربوبیت کے حوالے سے پہچانتی ہے۔ انسان بہت سے تقاضوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے اندر ہر وقت تقاضے اٹھتے رہتے ہیں۔ اس کا ذہن ہر وقت ان تقاضوں کو پورا کرنے کی جانب لگا رہتا ہے۔ جب وہ اپنے تقاضے میں ناکام رہ جاتا ہے تو پھر اس پر اپنی بے بسی اور لاچاری ظاہر ہوتی ہے۔ اپنی محتاجی سے وہ اپنے رب کی بے نیازی کو پہچانتا ہے۔ کائنات کی ہر شے رحمت کے انوار میں لپٹی ہوئی ہے۔ ہر شئے کو اس کی زندگی کی انرجی انہی انوار سے فراہم ہو رہی ہے۔ یہی انوار مخلوق کو اپنے خالق کی پہچان کراتے ہیں۔ خدمت خلق میں جب کوئی بندہ اپنے رب کی خوشی کے لیے، اپنے نفس کی پروا کیے بغیر مخلوق کے فائدے کے لیے کام کرتا ہے تو اس کا رابطہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ان انوار سے ہو جاتا ہے اور وہ جتنا زیادہ

www.ksars.org

وہ کام کرتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ اسے ان انوار سے انرجی ملتی جاتی ہے، اس کے وسائل میں وسعت آتی جاتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی مہربانیوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی مخلوق کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ وسائل میں وسعت کا مطلب یہ ہے کہ رب اس سے راضی ہے۔ ایک روحانی طالب علم کے لئے اس بات سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ اس کا رب اس سے راضی رہے۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی ہی خدمت خلق کا سب سے بڑا صلہ ہے جو بندہ اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ خدمت خلق ایسی نیکی ہے جس کا صلہ بندے کو اپنی ہی زندگی میں مل جاتا ہے۔ وہ جب کسی کے لئے کام کرتا ہے تو دوسرا فرد بھی اس کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے کوشاں ہو جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے آپس کے تعلقات مضبوط اور خوش گوار ہوتے ہیں۔ لوگوں میں محبت و عزت بڑھتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ میل جول ہوتا ہے۔ جس نفس ادب سکھتا ہے۔ اللہ پاک نے رُہبانیت کو پسند نہیں کیا۔ جیسا کہ قرآن میں اس نے فرمایا ہے کسی بھی پیغمبر نے رُہبانیت اختیار نہیں کی، بلکہ ہر پیغمبر لوگوں کے درمیان رہے اور اللہ تعالی کی پہچان کرانے کا اختیار کیا وہ خدمت خلق ہے۔ ہر پیغمبر لوگوں کے درمیان رہے اور اللہ تعالی سے لوگوں کو متعارف کراتے رہے۔ ان سب نے جو راستہ مخلوق کو اللہ تعالی کی پہچان کرانے کے لئے اختیار کیا وہ خدمت خلق ہے۔ ہر پیغمبر نے اللہ کے بندوں کے فائدے کے لئے ساری زندگی کاوشوں اور کوششوں میں گزار دی۔ اپنی جان پر تکلیف جھیل کر لوگوں کو خوش کرتے رہے۔ نتیجے میں اللہ ان سب سے راضی رہا اور انہیں وہ مقام عطا کیا جو دوسروں کو نہیں ملا۔ خدمت خلق تمام پیغمبروں کی ہی عادت رہی ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کو دیکھئے کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کا اللہ سے واسطہ اور رابطہ قائم رکھنے کے لیے خانہ کعبہ بنا دیا تاکہ بندے اپنے رب کے گھر آتے جاتے رہیں اور اس طرح ان کے قلب میں اللہ بس جائے۔ اللہ اینٹوں کے گھر میں نہیں بستا مگر بندہ جب اس حرم پاک کے پاس پہنچتا ہے تو اللہ بندے کے دل میں بس جاتا ہے۔ بندوں کے لیے ذہنی مرکزیت قائم کرنے کا اس سے بڑا اور کیا نظام ہو سکتا ہے بلاشبہ یہ بہت عظیم خدمت ہے اور قیامت تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، ان شاءاللہ۔

اللہ کا پیغام بندوں تک پہچانے میں پیغمبروں نے جو تکالیف و آوازاٹھاءی اسے کون نہیں جانتا۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ کو پڑھیں۔ بار بار ان کی قوم کی ان سے غداری کا مظاہرہ کرتی تھی۔ بار بار وہ انہیں ڈرا کے دھمکا کے اور محبت و معافی ہر طرح

www.ksars.org

سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔انہوں نے اللہ کی خوشنودی اور مخلوق کے فائدے کے لئے فرعون جیسے ظالم اور جابر سے ٹکرانا پسند کر لیا اور جن لوگوں نے کا ساتھ دیا اور ان کی خدمات کو قبول کیا انہیں اس ظالم کے شکنجے سے بچا کر لے گئے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر غور کیجئے۔ نبوت سے پہلے کی زندگی کے حالات پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کی پوری زندگی کا مقصد خلق خدا کو فائدہ اور آرام پہنچانا تھا۔بیواؤں کا سودا سلف لانا، یتیموں کی ضروریات کا خیال رکھنا، تجارت میں مالک کو نفع دلانے کے لئے پوری محنت سے کام کرنا، امانتوں کی پوری حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ۔یہ سارے وہ اوصاف ہیں جو تمام کے تمام لوگوں کو فائدہ پہچانے کے لئے ہیں۔اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں: "اگر تم میری خوش نودی چاہتے ہو تو پہلے میرے بندوں کو خوش رکھو۔یعنی اللہ کی خوشی اس کی مخلوق کی خوشی میں ہے۔ مخلوق کو آرام وراحت پہنچانا اور اسے خوش دیکھنا اللہ نے اپنا شعار بنا لیا ہے۔جب کوئی بندہ اللہ کے شعار کو اپنا بنا لیتا ہے اور وہ بھی اپنے رب کی طرح اس کی مخلوق کو آرام وراحت پہنچانے اور خوش رکھنے میں اپنی خوشی جان لیتا ہے، تو اللہ بھی اس سے خوش ہو جاتا ہے اور مخلوق بھی اس خوش ہو جاتی ہے۔خود اس کا اپنا نفس بھی مطمئن ہو جاتا ہے چونکہ تمام پیغمبروں کا مشترکہ شعار اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا اور انہیں آرام پہنچانا رہا ہے۔روحانی راستوں کا متلاشی جب پیغمبروں کے شعار کو اپنا لیتا ہے تو اس کو تمام پیغمبروں کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے اور پیغمبروں کے ذریعے سے اللہ تک پہنچنے میں اسے آسانی ہو جاتی ہے۔اللہ پاک ہم سب کو خدمت خلق کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

www.ksars.org

تقویٰ

زہد علم کا ثمر ہے۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں۔ "جس کو اللہ تعالیٰ زاہد بناتا ہے اس کے قلب میں حکمت القاء فرماتا ہے اور دنیاوی بیماری وعلاج سے آگاہ کرتا ہے اور اس جہان فانی سے بے لوث باہر نکال کر دارالسلام میں پہنچا دیتا ہے۔"

زاہد کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ کی جانب سے بندے کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے اور جس سے سینہ کھل جاتا ہے۔ یعنی شرح صدر ہو جاتا ہے۔ جس کی نشانی یہ ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب توجہ اور موت سے پہلے موت کا انتظام کرنا ہے۔

حرص اور وس سے بچنے کو زہد کہتے ہیں۔

غیب پر ایمان زہد و تقویٰ ہے۔

زہد ایسی عبادت ہے جو محض رضائے الٰہی کے لئے کی جائے۔ متقی وہ لوگ ہیں جنہیں غیب پر یقین حاصل ہے یعنی غیب ان کے مشاہدہ میں ہے اور وہ اللہ کے ساتھ ایک مستقل رابطہ میں ہیں۔ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں یہ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ ہے اور وہ تمام ادیان کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہیں اور آخرت کی زندگی ان کے مشاہدے میں ہے۔

ہر عمل رضائے الٰہی کے لئے کرنا زہد ہے۔

امر الٰہی سے منسلک ہونا تقویٰ ہے۔

اللہ کے ہر حکم پر دل کی گہرائیوں سے عمل کرنا تقویٰ ہے۔

ایمان کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔

خوشی سے ہر چیز کو قبول کرنا تقویٰ ہے۔

اللہ کی رضا کے مطابق عمل کرنا زہد ہے اور اللہ کی ناپسندیدگی سے بچنا تقویٰ ہے۔

اللہ کی راہ میں ہر چیز کو قربان کرنا اور ہر اس چیز سے دور رہنا جس اللہ منع فرمائے، تقویٰ ہے۔

اللہ کے لئے اپنے نفس کو کثافت سے پاک کر کے لطافت سے بھر دینا زہد ہے۔

اللہ پر کامل بھروسہ اور یقین رکھنا اور ہر کام میں اسے اپنا مددگار سمجھنا تقویٰ ہے۔

www.ksars.org

Relate every action to God

اپنی نفسانی خواہشات کو محدود رکھ کر قناعت اختیار کرنا زہد ہے۔

اپنی انا کی نفی کر کے پیغمبرانہ اوصاف پیدا کرنا زہد ہے۔

پیغمبرانہ طرز فکر کو اپناتے ہوئے اللہ کی کسی مخلوق کو نقصان نہ پہچانا اللہ پر مکمل بھروسہ رکھنا اور اللہ کے سوا کسی سے امید نہ رکھنا تقویٰ ہے۔

زاہد اور متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے خاص فضل و کرم سے اللہ کی راہ میں متقیں برداشت کرتے ہوئے اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز ان پر کھل جاتے ہیں۔

Full dependability upon God, deep contentment in every thing

☆☆☆☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱ زہد و تقویٰ کیا ہے؟

سوال نمبر ۲ روحانیت میں تقویٰ کی کیا اہمیت ہے؟

سوال نمبر ۳ ایک سالک تقویٰ حاصل کر کے روحانیت میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے؟

سوال نمبر ۴ زہد و تقویٰ کے کیا کیا فوائد ہیں؟

زہد علم کا ثمر ہے۔ جب آدمی کے اندر روحانی علوم کا ذخیرہ ہو جاتا ہے تو اس کے اندر زہد پیدا ہو جاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں۔ ''جس شخص کو اللہ پاک زاہد بناتا ہے اس کے قلب میں حکمت القاء فرماتا ہے اور دنیا کی بیماریوں اور علاج سے اسے آگاہ کر دیتا ہے اور اس جہان فانی سے بے لوث باہر نکال کر دار السلام میں پہنچا دیتا ہے۔'' یعنی زاہد وہ ہے جس کے قلب میں حکمت القاء ہوتی ہے۔ حکمت شئے کے پس پردہ کام کرنے والی حقیقت کو کہتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ کی اس حدیث کی رو سے زاہد وہ ہے جو اپنے قلب کی آنکھ سے شئے کے پس پردہ کام کرنے والے اس حقائق کو دیکھ لیتا ہے۔ ہر شئے کے پردے میں اللہ کا امر کام کر رہا ہے۔ اس کی نگاہ شئے کی گہرائی میں اللہ کے امر کی حرکات سے واقف ہو جاتی ہے۔ اس کا روحانی شعور اور روحانی طرزِ فکر شئے کے اندر موجود روح سے رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر میں کام کرنے والی حرکات کے محرکات سے واقف ہو جاتا ہے اور اپنے روحانی شعور کے ذریعے غیب کے اسرار کا سراغ لگا لیتا ہے۔

www.ksars.org

اللہ پاک نے اپنے کلام میں متقی کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جن کے مشاہدے میں غیب ہوتا ہے۔ یومنون بالغیب کے معنی ہی غیب میں دیکھنے والی نظر ہے۔ اللہ پاک نے اپنے کلام میں مومن کی تعریف اس طرح بیان کی ہے کہ مومن وہ ہے جس کے سینے میں نور داخل ہو گیا ہے۔ نور اللہ ہے اور اللہ کی نظر زمینوں اور آسمانوں میں ہر جگہ دیکھتی ہے۔ اللہ کا نور اللہ کی نظر ہے۔ مومن کے سینے میں جب اللہ کا نور جذب ہو جاتا ہے تو یہ نور اپنی فطرت کے مطابق مومن کے قلب کی نظر بن جاتا ہے۔ پس نور کی نظر ہر شئے کے اندر موجود نور کو دیکھتی ہے اور مومن کا تفکر اللہ کی حکمتوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ ظاہر کی تمام حرکات پس پردہ کام کرنے والے نور کی وجہ سے ہے۔ وہ ہر شئے کی وابستگی نور کے ساتھ دیکھ لیتا ہے اور ہر شئے کی وابستگی ایک حقیقت واحدہ کے ساتھ پہچان لیتا ہے۔

زہد کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ کی جانب سے بندے کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس نور کی وجہ سے شرح صدر ہو جاتا ہے۔ شرح صدر کے معنی کو آپ اس مثال سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں جیسے رات بھر چاند اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرتا ہے مگر صبح کو جب سورج نکل آتا ہے تو چاند غائب ہو جاتا ہے۔ دراصل سورج کی روشنیاں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ چاند کی مدہم روشنی ان تیز روشنیوں میں چھپ جاتی ہے گویا چاند کی روشنی سورج کی روشنی میں ہی مل جاتی ہے۔ اس طرح جہاں جہاں سورج کی روشنی پڑ رہی ہے اس کی اطلاع چاند کو بھی مل رہی ہے۔ گویا چاند سورج کی نظر سے دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ شرح صدر کے لفظی معنی ہے وسعت قلبی۔ قلب میں جو خیال بھی آتا ہے آدمی خیال کی اس تصویر کو نہایت واضح طور پر پہچان لیتا ہے۔ اسی کو تصور کہتے ہیں۔ تصور بھی ہمارے شعور کا دائرہ ہے۔ ہماری عقل تصور کے خاکے کو دیکھ کر ہی عمل کا فیصلہ کرتی ہے۔ عقل یا شعور اپنی فطرت میں محدود ہے۔ اسی محدودیت کی وجہ سے آدمی غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ یعنی عقل کوتاہ نظری ہے یا نظر کا محدود دائرے میں دیکھنا ہے۔ جیسے موم بتی کی روشنی کا دائرہ بلب کی روشنی کے دائرے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ جب قلب میں اللہ کا نور داخل ہو جاتا ہے تو نور عقل کی روشنی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس طرح عقل کی روشنی میں نورانیت جذب ہو جاتی ہے۔ اب یہ نور عقل کی نظر بن جاتا ہے۔ اسی کو فراست کہا گیا ہے۔ نور کا دائرہ حدود عقل کی روشنی سے بہت زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وسعت نظر اور فکر دونوں کو کھول دیتی ہے۔ اس کو شرح صدر کہتے ہیں۔ جس کی نشانی یہ ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی جانب توجہ ہو جاتی

www.ksars.org

ہے۔آدمی موت سے پہلے موت کے انتظام میں لگ جاتا ہے۔روشنی ہی نظر ہے۔روشنی کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔آپ کہیں گے اگر روشنی کے بغیر دکھائی نہیں دیتا یا روشنی ہی نظر ہے تو چمگاڈر اور الو کس طرح اندھیرے میں دیکھ لیتے ہیں۔ جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ چمگاڈر اور الو کے کمپیوٹر میں اندھیرے کو اجالا اور اجالے کو اندھیرا فیڈ ہے۔یعنی ان کے لئے اندھیرا بھی ایک روشنی ہے۔لہذا وہ اس روشنی میں موجود اشیاء کو دن کے اجالے کی طرح دیکھ لیتے ہین۔اصول تو وہی رہا کہ دیکھنے کے لئے نظریاتی بینائی روشنی بنتی ہے۔یہ روشنی خواہ اندھیرا ہو یا اجالا،آنکھ جس روشنی میں بھی دیکھ لے وہی آنکھ کی بینائی ہے۔روشنی جتنی شفاف ہو گی آنکھ اتنا ہی صاف دیکھے گی۔نور اللہ کا پرتو ہے۔نور کے اندر اللہ کی بے شمار صفات کام کر رہی ہیں۔جب نور آدمی کے قلب میں داخل ہو جاتا ہے تو قلب کی آنکھ عالم تصور میں ہر شئے کو بالکل صاف دیکھ لیتی ہے۔ نور لا محدودیت کا جز ہے۔جب نور قلب کی نظر بن جاتا ہے تو قلب کی نگاہ لا محدودیت میں دیکھنے لگتی ہے۔لا محدودیت ہی غیب ہے جو شعور کے لئے اندھیرے کی صورت ہے۔غیب میں کام کرنے والی روشنیوں اور انوار کو شعور کی نظر اندھیرے کی صورت دیکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ غیب کے علوم سے بے خبر رہتی ہے۔جب قلب کا نور شعور کی نظر بن جاتا ہے تو شعور گویا اندھیرے میں دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔زاہد اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب میں دیکھتے اور غیب مین دیکھنے والی چیزوں کو ان کے علوم کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ہر آدمی کا شعور نور کی مقداریں جذب کر کے پھیلتا ہے۔جس طرح ایک غبارے میں ہوا بھری جاتی ہے تو وہ پھیلتا ہے ایک حد ایسی بھی آتی ہے جب غبارے میں مزید ہوا بھری جائے تو غبارہ پھٹ جاتا ہے۔یہی آخری حد غبارے کی انتہائی وسعت ہے۔اسی طرح ہر آدمی کا شعور بھی غبارے کی مانند ہے کہ اس کے اندر نور جذب کرنے کی مقداریں مختلف ہیں۔ہر شعور اپنی سکت کے مطابق نور کو جذب کرتا ہے اور اپنی سکت کے مطابق وسعت اختیار کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ غیب یا لا محدودیت میں ہر شخص اپنے ہی عقل وشعور کی حد میں دیکھتا ہے۔البتہ یہ عقل لا محدودیت کو اپنی نظر کا مرکز بنا لیتی ہے۔علم الادم الاسماء کلہا کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم آدم کی سکت کے مطابق عطا کئے گئے۔یہ کل آدم کا کامل ہے نہ کہ اللہ کا۔اللہ تو لا محدود ہستی ہے۔اس کے علوم بھی لا محدود ہیں۔آدم کے اندر جتنی سکت تھی اس کی سکت کے مطابق اللہ نے اسمائے الٰہیہ کے علوم اسے عنایت کر دیئے۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

www.ksars.org

ہر آدم یا ہر بشر ایک مخصوص پیمانہ ہے۔ کائنات کی بنیاد وحدت فکر پر ہے۔ کائنات کی ہر شئے وحدت کا ایک پیمانہ ہے۔ ہر پیمانہ اپنی فطرت کے مطابق یکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی دو شخص ایک سے نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص اپنی سکت کے مطابق روشنیوں کو جذب کرتا ہے۔ اسی کے مطابق اس کی عقل و فہم کام کرتی ہے۔ اگر ہر آدمی کی ایک ہی سکت ہوتی تو سب کے علوم برابر ہوتے۔ سب کی ہر صلاحیت بالکل ایک سی ہوتی۔ پھر ایک دوسرے میں کوئی پہچان نہ ہوتی۔ مگر اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔'' قلب انسانی کی مثال پانی بھرنے والی مشک کی طرح ہے۔ جیسے جیسے نور بھرتا جاتا ہے سینہ پھیلتا جاتا ہے۔ قلب جب انوار سے لبریز ہو جاتا ہے تو ان انوار کی روشنی انسان کے نفس کا بھی احاطہ کر لیتی ہے اور نفس کی کمزوریوں کو اپنے انوار کی چادر میں چھپا لیتی ہے۔ آدمی کا نفس نورانی ہو جاتا ہے اور اس کے حواس سے نور جھلکنے لگتا ہے۔ اس کے حواس ہر شئے کے اندر موجود نور کو پہچاننے لگتے ہیں۔ نور علم ہے۔ اس طرح باطن کے علوم آدمی کی عقل پر آشکار ہو جاتے ہیں اور ہر شئے میں نور کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ نور آدمی کی صلاحیت بن جاتا ہے۔ نور غیب ہے۔ لہذا غیب سے رغبت ہو جاتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے آدمی مرنے سے پہلے موت کی تیاری میں لگ جاتا ہے اور غیب میں کام کرنے والے اصولوں کو اپنا لیتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر زہد اور تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے۔ متقی اور زاہد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ صرف اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق حصہ حاصل کرتے ہیں۔ زندگی کے تقاضوں کو اللہ کی رضا کے مطابق پورا کرتے ہیں اور زندہ رہنے کے لئے دنیا کی چیزوں کو اس نیت سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ چیزیں انسان کی ضرورت کے مطابق اللہ نے بنائی ہیں۔ ان کے ذہن میں دنیا کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور دنیا بنانے والے کی حیثیت اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی شئے سے انہیں نقصان نہیں پہنچتا۔ جس طرح وہ اللہ کو اپنا دوست اور اپنا مالک جانتے ہیں اللہ بھی انہیں اپنا دوست جانتا ہے اور ہر قدم پر ان کا محافظ بن جاتا ہے۔ متقی اور زاہد وہ ہے جو اپنی انا (Self Ego) کی نفی کر کے اللہ کی انا کے ساتھ زندہ اور قائم ہو۔

اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ہم نے رہبانیت کو ان کے لئے پسند نہیں فرمایا۔ مگر انہوں نے اسے خود پسند کر لیا اور پھر اس کی شرائط کو نبھا بھی نہ سکے۔ اس کلام میں اللہ پاک نے ایک قانون بیان کیا ہے وہ یہ ہے

www.ksars.org

کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے ارادے اور پسند کے خلاف اپنے ارادے اور پسند سے کام لیتا ہے تو یہ کام وہ کبھی بھی پورا نہیں کر پایا۔ کام وہی مکمل ہوتا ہے جس کے اندر اللہ کا ارادہ اور اس کی رضا شامل ہو۔ رہبانیت سے مراد دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کر لینا ہے اور ان چیزوں کو ترک کر دینا ہے جو چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اس کی بھی مذمت فرمائی ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا اللہ کی رضا کے خلاف ہے۔ عام طور سے لوگوں میں جب بھی زہد و تقویٰ کا تذکرہ آتا ہے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایک زاہد و متقی آدمی تارک دنیا بھی ہوگا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ زاہد و متقی وہ ہے جس کے مشاہدے میں غیب ہے۔ وہ غیب کے حقائق سے آگاہ ہے۔ وہ قدرت کے نظام سے واقف ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے اور گذشتہ ادوار میں ہوتا آیا ہے کہ روحانی علوم سیکھنے کے لئے لوگوں نے بڑے بڑے مجاہدے کیے۔ اسی تربیتی دور میں ایک دور اولیاء اللہ اور صوفیوں پر ایسا بھی آیا ہے کہ انہوں نے لوگوں کے ہجوم سے ہٹ کر زندگی گزاری۔ مگر یہ پوری زندگی نہیں بلکہ زندگی کا کچھ حصہ ہے۔ جب ان کی تعلیم و تربیت پوری ہو گئی تو اللہ نے انہیں لوگوں کے اندر رہنے کا حکم دیا تاکہ لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچے اور اللہ کا مشن چلتا رہے اور اللہ نے اور اللہ کے رسولوں نے ان سے مشن کے بڑے بڑے کام لئے۔ قرآن میں جتنے بھی پیغمبروں کے ذکر ملتے ہیں کسی ایک بھی پیغمبر کے متعلق یہ اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ تارک الدنیا تھے۔ سب نے ہی لوگوں کے درمیان اپنی زندگی گزاری۔ ان سے دکھ بھی اُٹھائے۔ ان کے لئے پھر بھی ایثار و قربانی سے منہ نہ موڑا۔ زہد و تقویٰ حاصل کرنے کا سب سے بڑا منشاء یہی ہونا چاہیے کہ روحانی علوم حاصل کر کے اپنے اندر کی روحانی صلاحیتیں بیدار کرے اور پھر دنیا والوں کے سامنے آئے تاکہ اس کے نیک اعمال و افعال دوسرے کے لئے مشعل راہ بن جائیں۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

اتباع سنت

۱۔ اتباع سنت سے مراد حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر کو اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جس نے میری سنت سے رو گردانی کی وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔''اس میں واضح طور پر طرزِ فکر کی جانب اشارہ ہے نہ کہ محض چند اعمال کی طرف۔

۲۔ پیغمبران علیہ السلام کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنے اوپر لاگو کرنا اتباع سنت ہے۔

۳۔ اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا اتباع سنت ہے۔

۴۔ پیغمبروں کی سنت کو اپناتے ہوئے انسان کو چاہیے کہ ہر انسان کی بلا تفریق مذہب وملت بے لوث خدمت کرے۔

۵۔ ہر وہ عمل جو حضور پاک ﷺ نے کیا اس پر عمل کرنا اتباع سنت ہے۔

۶۔ حضور پاک ﷺ کے افعال واعمال اور ان کے پردے میں اللہ پاک کی حکمتوں کو پہچان کر ان پر عمل کرنا اتباع سنت ہے۔

۷۔ حضور پاک ﷺ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اس کا مظاہرہ کرنا اتباع سنت ہے۔

۸۔ پیغمبرانہ طرزِ فکر چونکہ اللہ کی طرزِ فکر ہے اس لئے ہر وہ کام جو حضور پاک ﷺ نے کیا اس نیت سے کیا جائے کہ اس کے انوار وروشنیاں ہمارے اندر منتقل ہو جائیں اتباع سنت ہے۔

۹۔ قرآن میں غور وفکر کرنا اور ہر وہ کام جو اللہ کو پسند ہے اس پر عمل کرنا اتباع سنت ہے۔

www.ksars.org

۱۰۔ Adopt the way of thinking and act of our prophet

۱۱۔ حضور پاک ﷺ کے علوم وصفات کی پیروی کرنا اتباع سنت ہے۔

۱۲۔ حضور پاک ﷺ کا ہر عمل سنت ہے اور سنت وہ قوانین اور اصول ہیں جو کائنات میں جاری وساری ہیں اور جن اصولوں پر کائنات کا نظام قائم ہے۔ اپنے اعمال وافعال میں حضور پاک ﷺ کے طرزِ فکر کو اپناتے ہوئے کائناتی اصولوں کو پہچاننا اتباع سنت ہے۔

۱۳۔ نبی کریم ﷺ چونکہ رحمت اللعالمین ہیں اس لئے آپ کے اقوال وافعال کو کائناتی شعور سے سمجھنا اور عمل پیرا ہونا اتباع سنت ہے۔

۱۴۔ اللہ پاک کی مخلوق سے بے لوث محبت کرنا اتباع سنت ہے۔

۱۵۔ حضور پاک ﷺ کی زندگی قرآن کا عملی نمونہ ہے۔ آپ ﷺ کی پیروی کرنا اور آپ ﷺ کی طرزِ فکر کو اپنانا اتباع سنت ہے۔

۱۶۔ زندگی کے ہر شعبے میں حضور پاک ﷺ کی پیروی کرنا اتباع سنت ہے۔

۱۷۔ حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر کے مطابق اپنے نفس کو کنٹرول رکھنا اور دنیاوی آلائشوں سے پاک رکھنا اتباع سنت ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ اتباع سنت کیا ہے؟ اس کا مفہوم واضح کریں۔

www.ksars.org

سوال نمبر ۲۔ اتباع سنت کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ سالک اتباع سنت ادا کر کے روحانیت میں کس طرح ترقی کر سکتا ہے؟

سوال نمبر ۴۔ تفکر کیا ہے؟ تفکر کر کے روح سے کس طرح قریب ہوا جا سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ''پیغمبر علیہ السلام جو آپ کو دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے رک جا۔''

اس ایت میں واضح طور پر حکم دیا جا رہا ہے کہ پیغمبر کا ہر قول و عمل باعثِ اتباع ہے۔ قرآن میں حضور پاک ﷺ کے علاوہ بھی بہت سے پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ جن کی قوموں کے زوال و عروج کی داستانیں پڑھ کر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جب بھی قوم نے اپنے پیغمبر کی بات سے انحراف کیا اور اپنی من مانی کی وہ تمام اقوام یا تو قطعی طور پر صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں یا پھر سالہا سال اللہ تعالیٰ کے عتاب کا شکار رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کا یہ قانون تمام ہی پیغمبروں سے متعلق ہے کہ جس دور میں جو پیغمبر آئے وہ عقل و شعور میں اپنی تمام قوم سے افضل تھے۔ اس کے ساتھ ہی سب کا رابطہ خالق کے ساتھ براہ راست تھا۔ ایسی صورت میں وہ جو کچھ بھی کہتے اللہ ہی کی جانب سے کہتے رہے۔ جس نے ان کی بات مانی وہ دنیا و آخرت میں سرخرو رہا۔ جس نے نہ مانی اس نے اپنی زندگی میں ہی نافرمانی کا نقصان دیکھ لیا۔ اللہ پاک سے رابطہ قائم ہونے کی وجہ سے پیغمبر اللہ کے ساتھ حضور میں زندگی گزارتے ہیں۔ ایسی صورت میں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ پیغمبر کی بھول بھی اللہ کی حکمت کے زیرِ اثر ہوتی ہے نہ کہ نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر۔ پیغمبر تو اپنی انا کی نفی کر کے اللہ کی انا کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ پس اس کی انا پر اللہ کی انا کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس غلبے کی وجہ سے انفرادی انا کا کام بھی کل کی رضا سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حکمت ظاہر ہو جاتی ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ پر اللہ نہ کہنے سے کچھ عرصہ وحی بند رہی بعد میں اللہ پاک نے یہ اصول بنا دیا کہ ہر شخص مستقبل کے کسی کام کے پورا ہونے کے لیے ان شاءاللہ ضرور کہے۔

www.ksars.org

پیغمبر کی زندگی عملی ہے۔ علم بذاتِ خود روشنی ہے۔ علم کی روشنی سینے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جب ہی اس روشنی کے ساتھ آدمی بار بار ان علوم کا مظاہرہ کرتا ہے۔ علم کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رخ علم کی روشنی ہے دوسرا رخ علم کی روشنی سے خالی ہے۔ پہلے خالی رخ سامنے آئے گا پھر اس خلاء کو روشنی پُر کرے گی تب علم باقی رہے گا۔ اللہ کے سوا باقی تمام اشیاء دو رخوں میں کائنات کے اندر موجود ہیں۔ یہی تخلیقی قانون ہے۔ پہلے نیگیٹو رخ سامنے آتا ہے پھر پازیٹو۔ پس اسی اصول کے مطابق پیغمبر ﷺ کی بھول کا بھی نیگیٹو رخ پہلے ظاہر ہوا۔ یہ رخ انفرادی انا ہے۔ ہر بھول انفرادی انا کی کمزوری ہے۔ انفرادی انائی یا مادہ کا خول ہے جو روشنی سے خالی ہے۔ اسی کو کھنکھناتی بجنی مٹی کہا گیا ہے۔ جب تک انفرادی انا یعنی شعور علم کی روشنی سے خالی تھا تو حضور پاک ﷺ کی زبان سے ان شاء اللہ کے الفاظ ادا نہ ہوئے کیونکہ انفرادی انا کا اظہار ظاہری حواس کے ساتھ ہے۔ جیسے ہی لاشعور کی روشنیاں یا وحی کے انوار شعور میں منتقل ہو گئے شعور ان سے واقف ہو گیا۔ انفرادی شعور کی کمزوریاں ظاہر کرنے میں اللہ کی ایک یہ بھی حکمت ہے کہ اللہ پاک یہ بات اپنے بندوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ بندہ ذاتی طور پر علم سے خالی ہے۔ بندے کا ظاہری شعور و عقل علم کی روشنی سے بالکل خالی ہے۔ عقل و شعور کا سارا علم اللہ کی جانب سے ہے۔ پیغمبر ان علوم کو بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ دنیا والوں تک جو علوم بھی پہنچے ہیں وہ تمام علوم پیغمبروں کے لائے ہوئے ہیں۔ لہذا دنیا والوں کو پیغمبروں کی اتباع کے سوا چارہ ہی نہیں ہے۔ پیغمبروں کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں جو انہیں دنیا میں رہنے کے اصول سکھائے اور اللہ پاک سے متعارف کرائے۔ پیغمبری کا سلسلہ بند ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا والوں کو جن علوم سے اللہ آشنا کرنا چاہتے تھے وہ تمام علوم

اور تخلیقی فارمولے پیغمبروں کے ذریعے نازل کر چکے تھے اب کوئی نیا قانون یا نیا فارمولا باقی نہیں ہے۔ پیغمبروں کے بعد لوگوں میں رشد و ہدایت کا مشن چلانے والے تمام کے تمام وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو پیغمبروں کے لائے ہوئے اصولوں اور ہدایتوں پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور لوگوں میں بھی ان کا پرچار کریں۔ قرآن میں جابجا یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا، ہے کوئی سمجھنے والا۔'' اس جگہ سمجھنے سے مراد اس کے اندر بیان کردہ علوم کو اچھی طرح جان کر ان پر

www.ksars.org

عمل کرنا بھی ہے۔ کیونکہ قرآن نے یہ اصول بہت واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ بغیر عمل کے دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی گنجائش نہیں ہے۔ عمل حرکت ہے اور انسان کی پوری زندگی حرکت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ماں بچے کے منہ کے اندر نوالہ ڈالتی ہے تب بچے کو چبانا اور نگلنا خود ہی پڑتا ہے۔ اگر نالی کے ذریعے غذا معدے میں پہنچائی جاتی ہے تو معدے کو ہضم تو کرنا پڑتا ہے۔ زندگی دنیاوی ہو یا آخرت کی زندگی اور حیات کا مطلب ہی حرکت ہے۔ پس اللہ کے بیان کردہ علوم کو سمجھ کر جو کوئی ان پر عمل کرتا ہے وہ اللہ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اتباع سنت کر رہا ہے۔ کسی بھی مذہب میں مذہبی اختلاف اور فرقہ بندیوں کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کے لائے ہوئے مذہب میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ اگر تبدیلی نہ ہوتی تو اختلافات نہ ہوتے۔ پانی کو شربت آپ اس لئے کہتے ہیں کہ پانی میں شکر ملا دی جاتی ہے۔ خواہ شکر پانی میں کتنی ہی گھل مل جائے مگر پانی تو اس کے خواص کو اجاگر کر ہی دیتا ہے۔ چکھنے والا ایک قطرہ زبان پر رکھتے ہی پہچان جاتا ہے کہ پانی خالص نہیں ہے۔ یہی مثال دین کی ہے۔ جب پیغمبروں کے لائے ہوئے دین میں لوگوں نے اپنی عقل شامل کرنا شروع کر دی تو دین خالص نہ رہا۔ خالص کیسے رہتا۔ جب کہ دین کو سمجھنے والے شعور پر آپ نے اپنی عقل کو مسلط کر دیا۔ دین کو صحیح طرح سے سمجھنے والی عقل و شعور تو پیغمبروں کی ہے۔ پہلا آدم جو اس دنیا میں تشریف لایا وہ اللہ کا پیغمبر تھا۔ اسی آدم کی نسل آج تک چلی آ رہی ہے یعنی آدم و حوا کا شعور نسل انسانی میں منتقل ہو رہا ہے۔ آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک آدم کے شعور کے ارتقائی مدارج ہیں۔ آدم کا شعوری ارتقاء مختلف ادوار ہیں۔ ہر دور میں پیغمبران علیہ السلام اس دور کے لوگوں کی اصلاح کے لیے آتے رہے تاکہ انسانی شعور کی صحیح خطوط پر نشو نما ہوتی رہے۔ جس طرح دسویں جماعت کا طالب علم گزشتہ نو جماعتوں کے علوم سے واقف ہوتا ہے کیونکہ وہ گزشتہ جماعتوں سے گزر کر ہی دسویں میں پہنچا ہے۔ یعنی اس کا تعلق گزشتہ نو جماعتوں کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ہر دور کے پیغمبر کا شعور گزشتہ ادوار کے لوگوں کی ذہنی سطح سے بھی واقف ہوتا ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آخری پیغمبر ہونے کی حیثیت سے آدم سے لے کر آخر تک کے نوع انسانی کے شعور سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر عالم کا اور ہر مخلوق کا پیغمبر ﷺ رسول ﷺ کہا گیا ہے۔ کیونکہ حضور پاک ﷺ کا شعور بشری شعور کا مکمل عروج (Growth) ہے۔ اللہ کے ذہن میں بشر کا جو تصور تھا۔ حضور پاک ﷺ کی ذات اقدس اس تصور کا مکمل نمونہ ہیں۔ اس طرح آدم سے لے کر بشری شعور کی مکمل

www.ksars.org

Growthتک جس کی تصویر حضور پاک ﷺ ہیں۔ شعوری ارتقاء کے تمام ادوار کا ریکارڈ خود حضور پاک ﷺ کے شعور کے اندر ہے۔ اگر ہم اس بات کو عام فہم زبان میں کہیں گے تو یوں کہیں گے کہ حضور پاک ﷺ آدم سے لے کر رہتی دنیا تک کے لوگوں کے Mental analyses سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے لائے ہوئے علوم اور پیغام ہر دور کے لئے ہیں اور ہر ایک کے لئے ہیں۔

ہر پیغمبر کی زندگی دو رخوں پر مشتمل ہے۔ ایک رخ روزمرہ زندگی کے اشغال ہیں جو بشری تقاضوں کے تحت ہیں جس میں کھانا پینا، اُٹھنا بیٹھنا، لوگوں کے ساتھ میل جول وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے رخ میں زندگی کا وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحی کا اتباع کرتے ہوئے ان کے علوم لوگوں تک پہنچانا ہے۔ بشری تقاضوں کے تحت حرکات جبلی یعنی فطری حرکات ہیں۔ جو ہر بشر کا فطری تقاضہ ہے۔ کھانا پینا، سونا جاگنا، رفع حاجت وغیرہ، اس میں عام خاص بڑے چھوٹے کی خصوصیت نہیں ہے۔ ان تقاضوں کے مجموعے کا نام ہی بشر ہے۔ دراصل جبلی تقاضے دنیا کی ہر مخلوق کے اندر موجود ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہر مخلوق ان تقاضوں کو مختلف طور پر پورا کرتی ہے۔ مثلاً شیر گوشت کھا کر اپنی بھوک مٹاتا ہے جب کہ بکری گھاس کھاتی ہے۔ جو تقاضے جبلی طور پر مختلف انواع میں پائے جاتے ہین۔ وہ تمام تقاضے بشر میں پائے جاتے ہیں۔ بشر گوشت بھی کھاتا ہے پتے بھی کھاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے بشر دوسری مخلوق سے ہر حالت میں ممتاز رہتا ہے۔ ورنہ پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ اسی نظریئے سے پیغمبر کی زندگی کا ہر لمحہ عام لوگوں کے لئے باعث اتباع ہے۔ ہر پیغمبر اس دور کے شعور کے مطابق لوگوں کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرتے رہے تاکہ انسان کا رہن سہن دوسری مخلوق سے مختلف اور اعلیٰ رہے۔ مثلاً شادی بیاہ کے اصول، رشتے ناطوں کے ادب آداب، کھانے پینے کے طور طریقے، کتنی باتیں ہیں جن میں آدمی جانوروں کی نسبت ہر لحاظ سے مہذب نظر آتا ہے۔ جبلی تقاضوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کا روحانی ارتقاء بھی پیغمبر کی زمہ داری ہے جس کی وجہ سے معاشرتی اصولوں کے ساتھ ساتھ ایسے اصول بھی بنانے لازمی تھے جن کے ذریعے آدمی کا رابطہ اپنے خالق کے ساتھ قائم رہے۔ یہی رخ زندگی کی وہ طرز ہے جس کی بنیاد وحی پر ہے۔ وحی ایک ایسی فریکوئنسی ہے جس فریکوئنسی پر بندے کا رابطہ اللہ سے جاملتا ہے۔ جیسے ٹیلی فون کی لائن پر لوگوں سے رابطہ ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ٹیلی فون پر آپریٹر کال ملاتا ہے اس کا کام صرف کال ملا دینا ہوتا ہے۔ باقی

www.ksars.org

باتیں دونوں فریق آپس میں کرتے ہیں۔ان باتوں سے آپریٹر کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اسی طرح جبرئیل علیہ السلام فرشتہ بھی پیغمبر اور اللہ کے درمیان اللہ کا کلام پہنچانے کا باعث بنا۔اس کا کام صرف رابطہ قائم کرانا تھا۔یعنی پیغمبر کے شعور تک اللہ کے کلام کی روشنی کا پہنچانا۔ جیسے ہی اللہ کے کلام سے پیغمبر کے شعور کا رابطہ ہوا اللہ اور بندے کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ وحی ہے۔وحی کے مفہوم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام واقف نہیں۔اگر وہ وحی کے تمام مفہوم اور علوم جان لیتے تو وہ خود پیغمبر کہلاتے۔حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی کی ترسیل کا کام کرتے ہیں۔تمام پیغمبروں کے پاس وحی لانے کا کام آپ کے سپرد ہے۔

اس دوسرے رخ میں پیغمبروں کی زندگی عام انسانوں سے ہٹ کر ہے۔اس کی وجہ بھی اب آپ بخوبی جان گئے ہوں گے۔عام آدمی کا تعلق نہ وحی سے ہے نہ وحی لانے والے سے۔وحی کی وجہ سے ایک پیغمبر کی زندگی براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسلک ہے۔پس اس کی زندگی کی ہر حرکت لاشعور کے تابع ہے۔جس کی وجہ سے عام لوگوں کی طرح ان کی زندگی میں نفسانی کمزوریوں کا احتمال نہیں ہے۔پیغمبر کی پیدائش ہی مخصوص کام کے لئے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچپن ہی سے ان کے اندر وہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں جن کے ذریعے وہ وحی کے انوار کو آسانی کے ساتھ جذب کر لیں۔کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کے لئے سب سے ابتدائی چیز اس چیز کو حاصل کرنے کی لگن اور جستجو ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ تمام پیغمبروں کے اندر بچپن ہی سے اللہ پاک کو جاننے کی لگن تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں رائج الوقت معبودوں کی پرستش سے دور رہے اور ایک اللہ کی جانب متوجہ رہے۔پس ذہن کی مرکزیت نے ان کے اوپر غیب کے دروازے کھول دیئے۔اللہ نے انہیں اپنا پیغمبر چن لیا اور اپنے مشن کی ذمہ داریاں ان پر سونپ دیں۔اللہ کا مشن مخلوق میں خالق کا تعارف کرانا اور خالق کی جانب سے مخلوق پر جو احکامات نازل کیے گئے ہیں ان احکامات پر مخلوق کی عملی زندگی کا سیٹ کرانا ہے۔ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے لئے یا جن لوگوں پر وہ بھیجے گئے تھے ان کے لئے معاشرتی زندگی کو بھی وحی کے مطابق نئے اصولوں پر ڈھالا اور روحانی طرزِ فکر بھی پیدا کی۔روحانی طرزِ فکر کا بنیادی اصول قائم الصلوٰۃ ہے جو ہر دور میں ہر پیغمبر کے لئے اولین قرار دیا گیا ہے۔قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ تم سے پہلے کی امتوں پر بھی نماز اور روزے فرض کیے گئے تھے۔ہر پیغمبر نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنے کے اصول بتائے۔اللہ سے رابطہ قائم کرنا ہی قائم

www.ksars.org

الصلوٰۃ ہے۔ عبادت اللہ کے سوا کسی کو جائز نہیں ہے۔ جب معبود سے رابطہ ہی نہ ہو گا تو عبادت کیسے کی جائیں گی۔ معبود سے رابطہ ذہنی طور پر اور قلبی طور پر ہے یعنی باطنی حواس خالق سے رابطہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی نماز پڑھتا ہے اس کے دل اور دماغ میں خالق کا نہیں بلکہ دنیا کی کسی بھی چیز کا خیال آرہا ہے تو یہ نماز تو اس شخص یا اس شئے کی عبادت ہو گئی جس کا تصور ذہن میں ہے۔ جب ذہن و دل کا رابطہ خالق سے جا ملتا ہے تب بندہ اگر حالتِ نماز میں نہ ہو تو تب بھی اس صلوٰۃ قائم ہو جاتی ہے۔ اسی مضمون کو اللہ پاک نے اپنے کلام میں یوں فرمایا ہے کہ میرے وہ بندے جو چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرا ذکر کرتے ہیں میں ان سے قریب ہوں۔ رابطہ قائم ہونا، حضوری ہے۔ حضوری میں تمام حواس مخاطب کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ مخاطب ہی تمام حواس کا مرکز ہوتا ہے۔ قائم الصلوٰۃ بھی تمام حواس کا اللہ کی جانب متوجہ ہونا ہے۔ ذہن و دل کی مرکزیت جب اللہ ہو جاتا ہے تو اللہ کے انوار حواس کے دائروں میں جذب ہو جاتے ہیں اور صلوٰۃ میں اللہ کی حضوری اور قربت کو حواس محسوس کر لیتے ہیں۔ صلوٰۃ قائم کرنے کے جو اصول پیغمبروں نے لوگوں کو بتائے وہ تمام اصول اللہ سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ حضور پاک ﷺ کے اور دوسرے پیغمبروں کے لائے ہوئے اصولوں میں فرق یہ ہے کہ جو قوم جس پیغمبر کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہے جب اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے اس کے لائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتی ہے تو اس عمل کے نتیجے میں اس پیغمبر کے ذریعے ہی اس قوم کا رابطہ اللہ سے ہو گا۔ گویا ہر پیغمبر اللہ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے اور پیغمبر کے لائے ہوئے اصول وہ راستہ جو اللہ تک پہنچاتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ لوگ پیغمبروں کی ہدایات کو بہت جلد مصلحتوں کا رنگ دے دیتے ہیں۔ جو اصول ان کے نفس کو بھاری لگتے ہیں ان اصولوں کو اپنی نفسانی اغراض کے سانچے میں ڈھال کر ان کی شکل ہی بدل دیتے ہیں۔ آخری پیغمبر علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ ابھی چودہ سو سال گزرے ہیں اور مسلمانوں کا خدا جانتا ہے کہ کتنے ہی فرقے بن گئے ہیں۔ میں یہ پوچھتی ہوں جب خدا ایک ہے۔ پیغمبر ایک ہے پھر ایک ہی پیغمبر کو ماننے والے اتنے سارے مختلف فرقے کیسے ہیں۔ مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کو درست نہیں جانتا۔ ہر فرقہ دوسرے کو غلط کہتا ہے یعنی ہر فرقہ ہی غلط ہے۔ پھر اتباع سنت پر کون قائم ہے۔ کوئی بھی نہیں بنا۔ یہ نہایت ہی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کرنے کا مقام ہے۔ اے نسلِ انسانی! اتباع سنت کا پہلا اصول بندگی ہے اور بندگی کی بنیاد قائم الصلوٰۃ پر ہے۔ قائم صلوٰۃ اللہ پاک سے روحانی رابطہ قائم کرنا ہے۔ روح

www.ksars.org

امر ربی ہے۔ روح کے ذریعے یا روحانی حواس کے ذریعے جب اللہ سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے تو شعوری طور پر بندہ اللہ کے امر کو پہچان لیتا ہے جس کی ادائیگی کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ قائم الصلوٰۃ کے ذریعے پیغمبروں کی طرزِ فکر شعور میں منتقل ہوتی ہے اور روحانی طور پر ان کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اتباع سنت کا تقاضہ یہ ہے کہ سب سے پہلے پیغمبروں کے ان اصولوں کو اپنایا جائے جن اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے انہیں اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا۔ ہر پیغمبر نے پہلے اللہ سے رابطہ قائم کیا۔ اللہ کی صفات کو اپنی صلاحیت بنا کر انسانیت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اپنی انا کو مغلوب کر کے اللہ کی انا کے ساتھ اپنی شخصیت کو ابھارا۔ یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن پر عمل کر کے انہوں نے اللہ کا قرب حاصل کیا اور بنی نوع انسانی کے لئے ایک نمونہ بن گئے۔ اتباع سنت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی زندگی

شروع سے آخیر تک ایک ایسی فلم ہے جس کی کاپی کرنے کی ضرورت ہے۔ جس نے اپنی سکت کے مطابق جتنی کر لی اللہ کے نزدیک قابل ستائش ہے۔ دین میں فرقہ بندیاں اسی وجہ سے ہیں کہ ہر فرقہ پیغمبر کے کسی نہ کسی اصول پر کاربند ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس کی نظر صرف اپنے نفس میں عمل کو دیکھ رہی ہے جس کی وجہ سے اپنا عمل اسے دوسروں سے اچھا لگتا ہے۔ نفس کی خودستائی دوسروں کو برا کہنے پر اکساتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر پیغمبر بشریت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ کوئی بھی قوم اور کوئی بھی امت ان کی زندگی کے تمام اعمال کی مکمل کاپی نہیں کر سکتی۔ مگر اپنی سکت کے مطابق آدمی پر یہ لازم ہے کہ پیغمبروں کے لائے ہوئے اصولوں کو اپنائے۔

روحانیت میں اسلام کا مطلب وہ دین ہے جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر لے کر آئے ہیں۔ یعنی ہر پیغمبر کا مشن دین اسلام ہی ہے۔ اگر آج ہمیں دوسرے مذاہب میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ پس اس تبدیلی کو پہچاننے کے لئے اور پرکھنے کے لئے قرآن موجود ہے۔ سنت کے جو اصول ہم پیغمبروں سے منسوب کرتے ہیں اگر قرآن میں ان کا تذکرہ موجود نہیں ہے تو اس کی پیروی کرنا آدمی پر فرض نہیں ہے۔ نسل انسانی کو ایک کے بعد دوسرے پیغمبر کی اسی لئے ضرورت پڑی کہ سالہا سال کے عرصے میں لوگوں نے پیغمبر کی تعلیمات کو بھلا دیا تھا اور ان کے لائے ہوئے اصولوں میں تحریف کر دی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدم سے لے کر اب تک نسل انسانی اسی وضع پر چل رہی ہے کہ جب پیغمبر کو آئے ہوئے ایک مدت گزر جاتی ہے تو اس کی تعلیمات میں

www.ksars.org

مصلحتیں شامل کر دی جاتی ہیں اور پھر ایک مدت بعد یہ مصلحتیں نسل انسانی کے شعور کا ایک جز بن جاتی ہیں اور وہ اسے مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔اج بھی یہی صورت حال ہے۔ہر پیغمبر کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔اج ہمارے پاس اصل کو پرکھنے کی ایک ہی کسوٹی ہے اور وہ ہے قرآن۔بجائے اس کے کہ باریک باریک مسئلوں میں الجھا جائے۔قرآن کے واضح اصولوں پر عمل کریں۔حضور پاک ﷺ کی ساری زندگی قرآن کا عملی نمونہ ہے۔اگر ہم اس بات کو ہر وقت ذہن میں رکھیں اور قرآن کو سمجھ کر اس کے اصولوں کی پیروی کریں تو اتباع سنت کا حق بھی ادا ہو جائے اور اللہ بھی ہم سے راضی ہو جائے۔۔۔اللہ پاک ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

www.ksars.org

سخاوت

۱۔ اللہ کی راہ میں کھلے دل سے اپنے مال، جان، وقت اور صلاحیتوں کا استعمال کرنا جود و سخا ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ اصل غنا دل کا غنا ہے۔

۲۔ ہر کسی کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا جود و سخا ہے۔

۳۔ اللہ کے دیئے ہوئے میں سے مالی طور پر، عملی طور پر اور علمی طور پر اپنے بھائیوں کی مدد کرنا جود و سخا ہے۔

۴۔ سخاوت یہ ہے کہ آدمی اپنی ضرورت کا کفیل اللہ کو مان کر اس کی رضا کے لئے خرچ کرے اور اللہ کی مخلوق کی ضروریات کو پورا کرے۔

۵۔ جان سے بڑھ کر کوئی شئے نہیں ہے۔ اپنی زندگی اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دینا جود و سخا ہے۔

۶۔ حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر کو اپناتے ہوئے اپنی جان و مال سے لوگوں کی مدد کرنا جود و سخا ہے۔

۷۔ Give in the ways of God with me thought of any wordly gains

۸۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور نعمتوں کو صحیح طریقے سے خرچ کرنا جود و سخا ہے۔

۹۔ انسان کے پاس ہر شئے اللہ کی امانت ہے۔ امانت کو اصل مالک تک پہنچانا جود و سخا ہے۔

۱۰۔ ایسا کام اللہ کی مخلوق کے لئے کرنا جس میں ذاتی مفاد شامل نہ ہو سخاوت ہے۔

www.ksars.org

۱۱۔ کسی شئے کی خود کو سخت ضرورت ہوتے ہوئے بھی دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا جود وسخا ہے۔

۱۲۔ وسعت قلبی کا نام جود وسخا ہے۔

۱۳۔ اللہ کی راہ میں اپنی عزیز ترین چیز کی قربانی جود وسخا ہے۔

۱۴۔ اللہ رب بن کر ساری کائنات کی کفالت کر رہا ہے۔ اپنے اندر موجود ربوبیت کی صلاحیتوں کا ستعمال جود وسخا ہے۔

سوالات

سوال نمبر ۱۔ سخاوت کیا ہے اور اس کے کیا کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ سخاوت ایک سالک کے لئے کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۳۔ سب سے بڑے سخی اللہ تعالیٰ ہیں، ہم کس طرح یہ طرزِ فکر حاصل کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۴۔ کیا سخاوت میں اعتدال بھی ضروری ہے، وضاحت کریں۔

☆☆☆☆☆

جود وسخا ایک ہی صفت کے دو رخ ہیں۔ جیسے سمندر کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ پانی کے اوپر والی سطح ہے۔ دوسرا رخ پانی کی گہرائی ہے۔ اسی طرح جود وسخا اللہ کی صفت کا سمندر ہے۔ ہم اس سمندر کے اوپر والی سطح کو سخا کہتے ہیں اور گہرائی کو وجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اسم ہے جواد۔ یہ اسی اسم کی سفت ہے۔ جود کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی مدد کرنے میں آدمی اپنے یا پرائے کی کوئی تمیز نہ کرے۔ اسم جواد کی فطرت، سخاوت اور فیاضی ہے۔ زمین پر بستے ہوئے ہم اللہ کی اس صفت کا مظاہرہ ہر طرف اور ہر وقت دیکھتے ہیں۔ اللہ کی ہر سفت ایک مستقل نظام کی سورت میں ہمارے سامنے جاری و ساری ہے۔ ہوا، پانی، رزق، وسائل غرضیکہ ہر شئے مخلوق کی ضروریات سے بڑھ کر ہی ہیں۔ جہاں کہیں

www.ksars.org

کسی چیز کی کمی ہوتی ہے وہاں اللہ کی جانب سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مخلوق کی جانب سے ہوتی ہے۔ انسان کی نااہلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان جب اللہ پاک کی عطا کی ہوئی نعمتوں میں سخاوت کی جائے کنجوسی کرنے لگتا ہے تو اللہ بھی اپنے وسائل سمیٹ لیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسمائے الٰہیہ کا نور صرف روشنی نہیں ہے بلکہ نور ایک مستقل نظام کی صورت ہے۔ اس کے اندر تخلیقی سلاحیت ہے۔ اس کے اندر شعور ہے اور یہ نظر بھی ہے۔ ہر اسمائے الٰہیہ کی ایک مخصوص فطرت ہے۔ اس فطرت میں ردوبدل ناممکن ہے۔ انسان کے ذریعے اسمائے الٰہیہ اپنی فطرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے اگر آدمی سخاوت وفیاضی کرتا ہے تو اسم جواد کے انوار اس کے اس عمل کی حرکت کے لئے انرجی بنتے ہیں۔ جب تک آدمی نیک نیتی سے یہ عمل کرتا ہے اسے اسم جواد کی طرف سے سپلائی ملتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے وسائل میں ترقی اور برکت ہوتی رہتی ہے۔ مگر جیسے ہی نیت میں فتور آتا ہے خود غرضی و کنجوسی مزاج میں آجاتی ہے اسم جواد کی روشنیاں منہ موڑ لیتی ہیں جس کی وجہ سے خلاء رہ جاتا ہے۔ خلاء شعور یا نفس ہے۔ اب آدمی جو عمل کرتا ہے وہ روشنی سے خالی ہوتا ہے۔ روشنی سے خالی ہونے کی وجہ سے اس عمل کو انرجی نہیں ملتی بلکہ اس کا محدود ارادہ اور عقل ہی اس کی انرجی مہیا کرتے ہیں۔ اس کا عمل نفسانی خواہش کے زیر اثر ہوتا ہے جو نہ دنیا میں مقبول ہوتا ہے نہ اللہ کے یہاں۔

تمام پیغمبروں نے اپنی اپنی سکت کے مطابق اللہ کی اس صفت کا مظاہرہ کیا۔ قصہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بغیر مہمان کے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک دفعہ تین دن تک کوئی مہمان نہ آیا۔ اپ نے بھی اپنی عادت کے مطابق بغیر مہمان کے کھانا نہ کھایا۔ مگر جب بشری تقاضے نے ستایا اور بھوک لگنے لگی تو اللہ سے دعا کی اے اللہ کوئی مہمان بھیج تاکہ میں کھانا کھاؤں اور اپنی بھوک مٹاؤں۔ پیغمبر کی دعا تھی جلد ہی قبول ہوگئی کسی نے دروازے پر صدا لگائی، بھوکا ہوں کوئی کھانا کھلادے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا نام پوچھا۔ اس بوڑھے نے نام بتایا۔ پوچھنے پر یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا اتش پرست ہے۔ آپ علیہ السلام کے ذہن میں آیا یہ اللہ تعالیٰ کو خالق نہیں مانتا اسے روٹی کیوں دی جائے اس خیال کے تحت انہوں نے اس بوڑھے کو بغیر کھانا کھلائے رخصت کر دیا پھر اللہ سے درخواست کی کہ کسی موحد کو بھیج تاکہ وہ میرا مہمان بنے۔ اللہ پاک نے اپنے پیغمبر سے فرمایا۔

www.ksars.org

''اے ابراہیم سن! میں ستر برس سے اس بوڑھے کو کھانا کھلا رہا ہوں ان ستر برسوں میں اس نے ایک دن بھی مجھے اپنا خالق نہ کہا مگر اس کے باوجود بھی میں اسے روٹی دیتا رہا۔ تجھ سے ایک دفعہ کی روٹی بھی نہیں کھلائی گئی۔''

یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے معافی مانگی۔اس بوڑھے کو تلاش کیااور روٹی کھلائی ۔جب اس بوڑھے نے یہ واقعہ اللہ پاک کی ناراضگی کا سنا تو آتش پرستی چھوڑ کر ایمان لے آیا۔بلاشبہ پیغمبروں کے ہر عمل میں اللہ کی حکمت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا درجہ فیاضی میں سخاوت پر تھا۔جود پو نہیں۔اس موضوع پر دوسری مثال حضور پاک ﷺ کی ہے۔آپ ﷺ کے پاس موحد اور غیر موحد آتے ہی رہتے ہیں۔آپ ﷺ کا سلوک سب کے ساتھ برابر کا تھا۔ایک مرتبہ یہودیوں کا سردار آپ ﷺ کے پاس آیا۔آپ ﷺ نے اپنے کندھے سے چادر اتار کر اس کے لیے زمین پر بچھادی۔اور اس پر اسے بیٹھنے کو کہا۔وہ شخص بھی اپنی قوم کا سردار تھا۔اس کا قبیلہ اس کی عزت کرتا تھا۔ حضور پاک ﷺ کی نظر فراست نے دیکھ لیا کہ اللہ نے اس شخص کو عزت دی ہے۔مجھے اس کی عزت برقرار رکھنی چاہیے۔پس اس نے جب حضور پاک ﷺ کا یہ حسن سلوک دیکھا اور اپنے لیے ایسی عزت دیکھی تو بہت متاثر ہوا اور اپنی قوم میں جا کر حضور پاک ﷺ کی تعریف کی۔ جس کے نتیجے میں تمام قوم مسلمان ہو گئی۔ حضور پاک ﷺ کا عمل سخاوت میں جود پر تھا جو سخاوت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ جس میں اپنے پرائے کا خیال تک نہیں آتا۔سخاوت کے درجہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل سے ایک بوڑھا فرد ایمان لایا اور جود کے درجے میں حضور پاک ﷺ کے عمل سے پورا قبیلہ ایمان لے آیا۔

سخاوت میں اپنے پرائے کا فرق کرنا اللہ کو پسند نہیں ہے۔کیونکہ یہ اسم جواد کی فطرت کی منافی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ فطرت اسمائے الٰہیہ کی صفات ہے۔کائنات کی ہر شئے اسمائے الٰہیہ کی صفات کا ڈسپلے (Display) کر رہی ہے۔ڈسپلے وہی درست ہو سکتا ہے جو فطرت پر ہو۔فطرت سے ہٹ کر کوئی بھی عمل اسلام کے دائرے سے خارج سمجھا جائے گا۔کیونکہ دین اسلام ہے ہی فطرت کا مظاہرہ۔فطرت کا سب سے بہترین مظاہرہ روح کر رہی ہے کیونکہ روح کی فطرت اسمائے الٰہیہ کے انوار ہیں۔آدم کو جن اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کیے گئے ہیں ان تمام اسمائے

www.ksars.org

الٰہیہ کے انوار روح کے اندر کام کر رہے ہیں۔ یہی انوار روح کی فطری صلاحیتیں ہیں۔ انسان کے عمل میں جب فرد کا ارادہ غالب آجاتا ہے تو پھر عمل میں نقص پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ انفرادی شعور محدودیت ہے جب کہ روحانی شعور لامحدویت ہے۔ روحانیت سیکھنے کے لئے روحانی شعور اور روحانی صلاحیتوں کا بیدار کرنا ضروری ہے۔ روحانی صلاحیتیں اسی وقت بیدار ہو سکتی ہیں جب بندہ روح کی فطرت کے مطابق عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت دو قسم کی ہے۔ ایک معرفت ذات دوسری معرفت صفات۔ صفات کی معرفت یہ ہے کہ کوئی بندہ اپنے اندر کام کرنے والی صلاحیتوں کو ان کی فطرت کے مطابق استعمال کرتا ہے اور اس عمل میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنا فعل اسے اللہ کا فعل دکھائی دیتا ہے۔ وہ پہچان لیتا ہے کہ میرے اندر کی صلاحیت میری اپنی ذاتی نہیں بلکہ اس کا مالک اللہ ہے۔ تب اس صفت کے ذریعے اس کا رابطہ اللہ پاک سے ہو جاتا ہے اور وہ بندوں میں اسی صفت کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے جیسے حاتم طائی۔ اگرچہ قبیلے کے سردار کا نام تھا مگر اپنی سخاوت کی وجہ سے ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے۔ اب سارا زمانہ حاتم طائی کے نام سے سخاوت کو پہچانتا ہے۔

سخاوت ایسی صفت ہے جو ہمارے اندر کی بے پناہ کثافتیں دور کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آدمی کے اندر سے مال کی محبت اور طمع نکل جاتی ہے۔ مال کو اللہ نے فتنہ کہا ہے یعنی اس کی محبت میں فساد ہے۔ اس کا مشاہدہ اس دنیا میں تقریباً ہر شخص کو ہو چکا ہو گا۔ مال و دولت کے پیچھے اپنا خون جانی دشمن ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ مال کی محبت آدمی کا دل اتنا سخت کر دیتی ہے کہ آدمی قتل جیسا گناہ کبیرہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جھوٹ، حسد، دکھاوا، جنجوسی اور جانے کن کن بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر دم جب مال میں ذہن اٹکا رہے گا تو اللہ کا دھیان کب آئے گا۔ مال کی محبت آدمی کے دل سے اللہ کی محبت نکال دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں جہاں قائم الصلوٰۃ کا حکم قرآن میں آیا ہے ساتھ ہی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھی ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنا بھی صلوٰۃ کی طرح فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ بندہ جس طرح نماز ادا کرنے کا عادی ہو جائے اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کا بھی عادی ہو جائے اور مال و دولت کی محبت دل سے نکال کر اپنی عبادت کو خالص اللہ کے لیے مخصوص کر دے۔ قرآن نے سورہ بقرہ میں طاغوت کا ذکر کیا ہے۔

www.ksars.org

''اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف اور جنہوں نے کفر کیا۔ان کے ساتھ طاغوت ہیں۔ نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے اندھیروں کی طرف۔یہی لوگ دوزخی ہیں۔وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

(آیت ۲۵۷)

طاغوت کا مطلب ہے خدا کے سوا کوئی اور جس کی پرستش کی جائے وہ طاغوت ہے۔کوئی بندہ مال کی محبت میں قدرت کے بنائے ہوئے قانون کی پاسداری نہیں کرتا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں مال کی محبت اللہ کی محبت سے زیادہ ہے۔دین عمل کا نام ہے۔زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ عملی طور پر جب آدمی مال کی محبت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اسے اللہ کی رضا کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تو مال اس کے لئے طاغوت بن جاتا ہے۔پرستش کا عمل ذہن کی مرکزیت سے ہے۔سیدھی سی بات ہے اگر ذہن کی مرکزیت اللہ ہے تو آپ اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور اگر ذہن کی مرکزیت اللہ کے سوا دنیا کی کوئی شئے ہے تو آپ اس شئے کی پرستش کرتے ہیں۔اللہ کے سوا باقی سب کی محبت پرستش کی حد تک کرنا طاغوت کی پرستش کرنا ہے۔طاغوت میں سب سے بڑا طاغوت آدمی کی اپنی انا اور مال ہے۔انسان کی اپنی انا خود پسندی میں انسان کو اتنا دور لے جاتی ہے کہ آدمی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔اسی طرح مال کی محبت بھی آدمی کو اتنا دور لے جاتی ہے کہ آدمی اللہ کے بنائے ہوئے سارے اصول توڑ کر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اور جب پوری قوم اس بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اللہ اسے اپنے غضب کا نشانہ بنالیتا ہے۔اللہ رحم فرمائے۔مال کی محبت آدمی کو خود غرضی کی طرف مائل کر دیتی ہے۔آدمی اتنا خود غرض بن جاتا ہے کہ خود اپنی ذات سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا۔اللہ پاک کی ہستی ایسا لامحدود خزانہ ہے کہ جس خزانے سے ہر شئے کو اس کی زندگی کی ضروریات فراہم ہو رہی ہیں اللہ پاک کی صفات اس کا خزانہ ہے اور اس انمول خزانے میں سے اللہ نے انسان کو بھی ایک حصہ عطا کیا ہے۔انسان کو اس حصہ کا وارث بنا دیا ہے۔آدمی کی تمام سلاحیتیں اس کی وراثت کا خزانہ ہے جس کے علوم اور اس کے استعمال کا طریقہ بھی اللہ نے سکھا دیا ہے۔اصل سخاوت اور جود اللہ کے خزانے میں ہے۔قدرت نے جو نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں خواہ وہ مال ہو، علم ہو، جسمانی قوت ہو، حسن سلوک ہو، محبت ہو، کوئی بھی چیز جس سے خلق خدا کو فائدہ پہنچے جس میں قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق سخاوت سے کام

www.ksars.org

لینا فطرت کے عین مطابق ہے۔یہی وہ دین جس کا پیغام تمام پیغمبر لے کر آئے۔دین اسلام انسان کے اندر کام کرنے والی فطرت کے علوم ہیں۔روحانی طالب علم اپنے اندر کی فطرت کو ابھارتا ہے۔ہمارے سامنے کتنی ہی مثالیں ہیں ان لوگوں کی جنہوں نے اپنے اندر اس حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس مختصر سی زندگی میں حق کو پالیا۔

بزرگوں کے قصے،اولیاءاللہ کے واقعات اور پیغمبروں کے حالات زندگی ہمارے لئے اسباق کی حیثیت رکھتے ہیں۔انہیں بار بار پڑھ کر ان کی تقلید کرنے سے ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہو جاتا ہے جو ان ہستیوں کو اس عمل سے حاسل ہوا۔سخاوت کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں مگر عمل کے بغیر علم بے کار ہے۔اس لئے کہ تخلیقی قانون کے مطابق ہر شئے دو رخوں میں تخلیق کی گئی ہے۔کن کے بعد کا تمام مظاہرہ دو رخوں مین ہے۔اللہ پاک کے کن کہنے سے علم کا مظاہرہ بھی دو رخوں میں ہوا ہے۔ایک رخ علم ہے دوسرا رخ علم کی حرکت یا عمل ہے۔جو رخ علم ہے اس میں کوئی تبدیلی اور تغیر نہیں ہے۔یہ اللہ کی سفت ہے اور جو رخ عمل ہے یہ حرکت ہے۔جو ہر آن تغیر پذیر ہے۔کائنات تغیر اور حرکت کا نام ہے۔کائنات کا جوہر انسان ہے پس انسان مجموعہ ہوا کائنات کی کل حرکات کا۔فطرت کائنات کی وہ حرکات ہیں جن کا ظہور کن کہنے سے ہوا۔ان حرکات کا دائرہ ہی کائنات ہے۔جب کوئی بندہ اپنی انا کو کائناتی انا کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے یعنی وہ جان لیتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ ایک خالق کا تخلیق کردہ ہے اور جس طرح میرے اندر خالق کی پہچان کام کر رہی ہے اسی طرح ہر ذرے میں خالق کو پہچاننے والا شعور موجود ہے۔اسی شعور کے ذریعے ساری کائنات ایک دوسرے کو پہچانتی ہے۔پس کائناتی شعور سے منسلک ہونے والا بندہ فطرت کے اصولوں کو جان لیتا ہے اور فطرت خود اس کی ہر حالت میں حفاظت کرتی ہے۔اس سلسلے میں حضرت رابعہ بصریؒ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔

ایک مرتبہ آپ کثرت عبادت کی وجہ سے تھک کر سو گئیں۔ایک چور آیا اور آپ کی چادر لے کر چلا۔راستہ بھول گیا۔مجبوراً چادر جہاں سے اُٹھائی تھی وہیں رکھ دی پھر واپس چلا تو راستہ مل گیا۔اس کو پھر طمع نے گھیرا وہ واپس پلٹا اور چادر اُٹھالی پھر جو پلٹا تو پھر راستہ کھو گیا۔اس طرح کئی بار ہوا جب بھی چادر اُٹھا کر چلتا دروازہ ہی نہ ملتا۔یہاں تک کہ اس نے ایک غیبی آواز سنی کہ :

www.ksars.org

''اے شخص! تو اپنے اپ کو کیوں افت میں ڈالتا ہے اس لئے کہ جس کی یہ چادر ہے وہ کئی برس سے اپنے آپ کو میرے سپرد کر چکی ہے۔ جب سے شیطان بھی اس کے پاس نہیں ایا پھر چور کی کیا مجال ہے کہ اس کی چادر کو چرا لے جائے۔ گو ایک دوست سو رہا ہے مگر دوسرا دوست اس کی حفاظت کے لئے موجود ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ اس کی چیز چرا لے جائے۔''

بزرگوں کے واقعات ہماری زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں۔ جب انسان دنیا کی طمع چھوڑ کر اللہ کی محبت اپنے دل میں بسا لیتا ہے تو اللہ اسے اپنی ایسی نعمتیں اور ایسے انمول خزانے عطا کرتا ہے جس کی سخاوت اسے تونگر بنا دیتی ہے۔ انسان ان خزانوں کا دفینہ ہے۔

www.ksars.org

بے مقصد گفتگو

۱۔ خاموشی عبادت ہے۔

۲۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جس نے خاموشی اختیار کی وہ کامیاب ہو گیا۔

۳۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی زبان کی حفاظت کا کفیل ہو گیا میں اس کے لئے جنت کا کفیل ہو گیا۔

۴۔ اللہ کی یاد بندے کو فضول گوئی سے دور رکھتی ہے۔

۵۔ خاموشی تفکر کی جانب مائل کرتی ہے اور تفکر خدا کی جانب مائل کرتا ہے۔ فضول گوئی تفکر سے دور ہٹاتی ہے اور تفکر سے دور ہو کر آدمی خدا سے دور ہو جاتا ہے۔

۶۔ فضول گوئی اور کثرت کلام سے آدمی کا شعور متاثر ہوتا ہے اور روحانی شعور سے جو انفارمیشن آرہی ہے آدمی اس سے بے خبر رہتا ہے اور فضول گوئی سے پرہیز حضور پاک ﷺ کی سنت بھی ہے۔

۷۔ فضول گوئی ضیاع قوت ہے۔ اس سے آدمی کی زندگی پر نہایت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۸۔ کثرت کلام اور فضول گوئی سے آدمی دنیاوی مشغولیت مین پھنسا رہتا ہے جس کی وجہ سے روحانی راستوں میں رکاوٹ آجاتی ہے۔

۹۔ کثرت کلام سے آدمی پر شعور کا غلبہ رہتا ہے جو روحانیت کے بالکل برعکس ہے۔

۱۰۔ کثرت کلام سے وہ قوت ضائع ہو جاتی ہے جو عمل کا بعث بنتی ہے لہذا گفتار کا غازی کردار کا غازی نہیں بن سکتا۔

www.ksars.org

۱۱۔ خاموشی بہترین حکمت ہے۔

۱۲۔ کثرت کلام سے نفس میں غرور تکبر پیدا ہوتا ہے۔اس سے بہتر ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی یاد میں مشغول رکھے۔جیسے سلطان باہو نے فرمایا۔''جو دم غافل سو دم کافر۔''

۱۳۔ فضول گوئی ایک مرض ہے جس سے دل افسردہ اور ذہن منتشر ہو جاتا ہے۔

سوالات

سوال نمبر ۱۔ فضول گوئی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ کم بولنا، کم کھانا، کم سونے کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ تفکر سے کیا مراد ہے؟اس کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۴۔ حدیث شریف ہے جس نے خاموشی اختیار کی وہ کامیاب ہو گیا اس کی تشریح کریں۔

☆☆☆☆☆

ہماری روز مرہ زندگی میں جو اصطلاحیں اور محاورے عام طور سے استعمال ہوتے ہیں وہ بہت سے لوگوں کا تجرباتی نچوڑ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے تمام لوگوں کا اس پر اتفاق ہو جاتا ہے اور یہ فطرت کے اصول کی حیثیت اختیار کر لیتے ہین بلکہ اگر اسے دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو کہا یوں جائے گا کہ لوگوں نے اپنے اندر کام کرنے والی فطرت کو جب پہچانا تو اسے الفاظ میں بیان کر کے اس کے معنی و مفہوم کو اصولی صورت میں ڈھال دیا تاکہ اس اصول کو لوگ اپنا کر اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھائیں کہ فطرت تو ہر فرد کے اندر ایک ہی طرز پر کام کر رہی ہے۔مثلاً بزرگوں کا قول ہے کہ ''خاموشی عبادت ہے۔''جب ہم بزرگوں کے اس قول میں غور و فکر کرتے ہیں تو اس قول کے اندر مراقبہ کا اصول چھپا ہوا نظر آتا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ زبان خواہ کتنی ہی خاموش رہے، دماغ کبھی خاموش نہیں رہتا۔دماغ میں تصورات

www.ksars.org

کی فلم چلتی ہی رہتی ہے۔ دماغ میں اگر اللہ کا تصور ہو اور زبان خاموش ہو تو یہ حالت عین مراقبہ کی ہے۔ پھر توجہ پوری طرح اللہ کی جانب ہو جاتی ہے اور اللہ کے وہ تصورات جس میں اللہ اور بندے کا ساتھ ہے اور جو کچھ اللہ نے اپنے بندے کو مشاہدہ کرانا چاہتا ہے وہ تصورات دل کے آئینے میں ابھرتے ہیں۔ بندگی کے آداب سے واقفیت ہوتی ہے جو لمحہ اللہ کے ساتھ گزر جائے وہی عبات ہے۔ پس اس قول کی سچائی پر کسے شک ہو سکتا ہے۔ زبان قلب کی ترجمانی کرتی ہے۔ قلب میں اللہ کا تصور ہو گا تو لب پر بھی ذکر الٰہی ہو گا جس طرح ہر شئے دو رخوں پر ہے کلام بھی دو رخوں پر ہے۔ ایک تو وہ جو اللہ کے امر کی جانب سے ہے۔ اللہ کا امر اللہ کا کلام کن ہے۔ اس آواز کی روشنی کائنات کے اندر موجود ہے اور سمندر کی لہروں کی طرح متحرک ہیں۔ ہر لہر کے اندر اللہ کا مخصوص کلام بند ہے اور اس کی روشنی میں کن کے بعد کے ظہورات علم کائنات کی صورت میں موجود ہیں۔ روح کے اندر یہ لہر جذب ہوتی ہے اور اللہ کی آواز اور اس کے علوم کا مظاہرہ روح کے ذریعے کائنات میں ہوتا ہے۔ روح کا تعلق چونکہ جسم سے بھی ہے لہذا جب آدمی اپنی

توجہ اللہ کی جانب لگا لیتا ہے تو روح کی روشنیوں کا عکس قلب کے آئینے میں پڑنے لگتا ہے۔ یہی مراقبہ کی کامیابی ہے اور عبادت ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جو شخص اپنے حال کو بیان نہیں کر سکتا اس کو صحیح حال ہی نسیب نہیں ہوتا کیونکہ تیرے حال کو بیان کرنے والا خود تیرا حال ہی ہے۔ یہاں حال سے مراد قلب کے تصورات ہیں۔ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ قلب کے تصورات روشنی ہیں اور روشنی اللہ کے امر کی روشنی ہے جس میں اس کے علوم ہیں۔ تفکر اس روشنی کے علوم ہیں معنی پہناتا ہے اور انہیں الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ چناچہ قلب کے آئینے میں عکس کا دیکھ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کا مفہوم و معنی سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ شعور ان کے علوم سے واقف ہو۔ ایسی صورت میں کلام انسان کے لئے فائدے مند ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے حال کو بیان کر سکتا ہے اور اللہ کے علوم لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ وہ کلام ہے جو حق کی جانب سے ہے اور جن کا ظاہر کرنا احسن ہے۔ دوسرے رخ میں قلب کے آئینے پر دنیاوی حالات و لمحات کا عکس پڑتا رہتا ہے اور قلب ہی ان لمحات کی تصویری فلم چلتی رہتی ہے جو دل میں ہو گا وہی زبان پر آئے گا۔ پس ضرورت سے زیادہ دنیا کا ذکر کرنے سے دل دنیا کی طرف مائل ہوتا جاتا ہے اور اللہ کی جانب سے ہٹتا جاتا ہے۔ مسلسل یہ کیفیت دل کو ایک روٹین پر قائم کر دیتی ہے کہ جس کے اندر بس ہر وقت دل کے آئینے میں دنیا ہی کا عکس پڑتا رہتا ہے اور اللہ کی جانب توجہ

www.ksars.org

ہوتی ہی نہیں ہے۔ایسے میں آدمی کا کلام نہایت ہی فضول بن جاتا ہے جس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا نہ ہی خود نفع ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی غزوہ میں ایک نوجوان شخص شہید ہو گیا۔لڑائی سے فراغت کے بعد شہیدوں کی نعشوں میں اس کی نعش بھی ملی اور دیکھا گیا کہ اس کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ماں آئی اور فاقہ کی حالت میں اللہ کے نام پر جان دینے والے شہید بیٹے کے پاس بیٹھ کر اس کے منہ سے مٹی پونچھی اور کہا کہ

''بیٹا تم کو جنت مبارک ہو۔'' یہ سن کر حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ :''کیا خبر ہے ممکن ہے کہ بے فائدہ کلام کرنے کا عادی ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ فضول گوئی کی عادت انسان کے مرتبہ کو گھٹا دیتی ہے۔کلام حق وہ ہے جو اللہ کے امر کی ترجمانی کرتا ہے۔

بزرگوں کا ایک قول یہ بھی بہت عام ہے کہ ''کم بولو، کم کھاؤ، کم سوؤ'' بولنا' کھانا اور سونا تینوں چیزیں زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ چھوڑی تو نہیں جا سکتیں البتہ اس عمل کو زندگی کے روٹین میں اس طرح شامل رکھنا چاہیے کہ یہ مقصد حیات نہ بنے۔آج کل کے زمانے میں یہ تینوں باتیں لوگوں نے زندگی کا مقصد بنالی ہیں۔کوئی بھی اصول جن کا حقیقت پر دار و مدار ہے وہ کبھی پرانے نہیں ہوتے کیونکہ یہ فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو پیدا کیا ہے۔اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہے۔کسی مشین کو ہی دیکھ لیں۔انجینئر نے جن اصولوں پر اسے بنایا ہے وہی اس کے چلانے اور استعمال کا طریقہ بھی مقرر کرتا ہے۔اس کے مقرر کردہ طریقے سے ہٹ کر مشین کو چلانے کی کوشش کی جائے گی تو مشین ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔زیادہ بولنا طبّی نقطہ نظر سے بھی مضر صحت ہے۔ قلب میں جو روشنی ذخیرہ ہوتی ہے وہ ہماری انرجی کا کام بھی کرتی ہے جب زیادہ بولیں گے اور فضول بے مقصد بے معنی گفتگو کی جائے گی تو انرجی حرکت کی لہروں میں تبدیل ہو کر اعضاء کو حرکت میں لانے میں خرچ ہوتی جائے گی اور قلب روشنی سے خالی ہو جائے گا۔اسی عمل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ زیادہ بولنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔دل کا تعلق ہمارے جسم مثالی سے ہے جو روشنیوں کا جسم ہے۔دل کا شعور جسم مثالی کا شعور ہے جو مادی جسم کی انرجی بنتا ہے۔اگر

www.ksars.org

مادی جسم زیادہ حرکت کرے گا تو اسے انرجی کی ضرورت بھی زیادہ پڑے گی۔ زیادہ انرجی استعمال ہو گی تو انرجی کا ذخیرہ کم رہ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم فضول گوئی اور کثرت کلام کے ذریعے اپنے روشنیوں کے جسم کو کمزور بنانے میں پوری طرح مستعد رہتے ہیں۔ یہی جسم تو مرنے کے بعد میں اعراف میں زندگی بسر کرتا ہے۔ گویا ہم اسے پیدائش کمزور اور اپاہج و معذور بناتے ہیں جیسا جسم ہم وہاں لے کر جائیں گے ویسا ہی تو رہے گا۔ اللہ بھی یہی کہتے ہیں جس حالت میں مرو گے اسی میں اُٹھائے جاؤ گے۔ ایک روحانی طالب علم سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اس پر عمل کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ روحانی طالب علم کو اپنا ذہن و دل اس طرح سیٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی طرزِ فکر دنیا سے ہٹ کر ہو۔ وہ چیزیں جو روحانی علوم سیکھنے کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں وہ اختیار نہ کئے جائیں۔ روحانی علوم سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ وحی کے انوار جو مرشد کے سینے میں موجود ہیں وہ مرشد کے ذریعے سے مرید کے سینے میں جزب ہو گئے۔ ان علوم کی منتقلی کا قانون اور اصول وہی ہے جو وحی کا قانون ہے۔ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ۔

''اور وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اس کو جلد یاد کر لو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔''

یہاں یہ بات بتائی جارہی ہے کہ وحی اللہ کا کلام ہے۔ اس کلام کے معنی اور الفاظ بھی مخصوص ہیں۔ جب وحی نازل ہونے کے وقت زبان میں حرکت ہو گی تو ذہن یعنی اپنا شعور بھی حرکت میں آجائے گا اور وحی کے الفاظ میں اپنے شعور و عقل سے ہو سکتا ہے کوئی لفظ داخل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ میاں نے فرمایا کہ پوری توجہ دو۔ اسی اصول کے تحت جب روحانی علوم سیکھے جاتے ہیں تو بھی ان کی منتقلی کے لئے تصور شیخ کا مراقبہ کہا جاتا ہے اور اپنی پوری توجہ شیخ کے تصور پر لگائی جاتی ہے کہ شیخ کے انوار مرید کے سینے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اس عمل کے لئے انخلائے ذہن کی مشق ضروری ہے تاکہ ذہن پوری طرح یکسو ہو کر شیخ کی جانب لگ جائے۔ انخلائے ذہنی کے لئے اور ذہن کو یکسو رکھنے کے لئے کم بولنا اور فضول باتوں سے پرہیز بہت ضروری ہے۔ یکسو ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذہن کے اندر خیالات کی یلغار کو روکا جائے اور ذہن پر اتنا کنٹرول آجائے کہ خود بخود آنے والے خیالات کو اپنے ارادے سے کنٹرول

www.ksars.org

کیا جائے اور جس خیال کو چاہے جتنی دیر چاہے ذہن میں رکھے اور جب چاہے ذہن سے نکال دے۔ خواہ یہ بات کتنی ہی عجیب محسوس ہو۔ مگر انخلائے ذہنی کی مشق سے خیالات پر کنٹرول ہو جاتا ہے۔ مگر خیالات پر کنٹرول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ارادے کی قوت کو دماغ کے روٹین کے خلاف استعمال کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنے معمول کی حرکت چھوڑ کر آپ کے ارادے کا تابع ہو جائے۔ یہ سب اسی وقت ہو گا جب آپ کے ارادے میں قوت ہو گی۔ ارادے کا مقام دل ہے۔ دل کا نمائندہ زبان ہے۔ زبان جب زیادہ استعمال کی جائے گی تو دل سے ارادے کی قوت زبان کو حرکت دینے میں خرچ ہو جائے گی پھر ارادہ کس طرح ذہن کو کنٹرول کرے گا اس کے علاوہ چونکہ زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے اور دل کی نمائندگی کرتی ہے۔ زبان کا اثر سب سے زیادہ دل پر ہوتا ہے۔ بعض وقت ساری زندگی کے اچھے بھلے تعلقات چند جملے کہہ دینے سے آن کی آن میں ختم ہو جاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ زیادہ باتیں کرتے ہیں وہ اکثر ہی بے معنی اور فضول باتیں کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی قوتوں کو بولنے میں خرچ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے خیال کے اندر نورانیت ختم ہو جاتی ہے اور محض حرکت کی لہریں ہی رہ جاتی ہیں۔ خیال کی نورانیت ہی خیال کا اصل مفہوم و معنی ہے۔ جب اسے ضائع کر دیا جائے تو پھر الفاظ کے حروف محض خول رہ جاتے ہیں۔ جیسے بادام کا جوہر اس کا تیل ہے۔ تیل نچوڑ لینے سے بادام محض ایسے چھلکے رہ جائیں گے کہ جس میں کوئی قوت نہ ہو گی۔ جھوٹ، غیبت، لعن طعن، بے جا خوشامد، مذاق اڑانا یہ سب فضول گوئی اور کثرت کلام میں آتا ہے اور اخلاقیات سے گری ہوئی حرکت ہے۔ جسے کوئی بھی مذہب گوارا نہیں کرتا اور معاشرے کے سکون و امن میں ان سے خرابیاں آتی ہیں۔ ہمارے پیارے رسول پاک ﷺ نے فرمایا۔

"وہ چیز جس کی نسبت میں امت کے بارے میں سب سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے۔"

حضور پاک ﷺ کے اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ فضول گوئی انسان کو جن آفتوں میں مبتلا کرتی ہے دنیاوی بھی اور روحانی بھی۔ اس کے لئے رحمت اللعالمین سخت فکر مند ہیں۔ ایسا کوئی بھی کام جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشی نہ ہو وہ کام کیسے قبولیت کی منزل طے کر سکتا ہے۔

www.ksars.org

ایک روحانی طالب علم کے اندر استاد غیب میں داخل ہونے کا شوق پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ ''موتو قبل انت موتو''یعنی مر جاؤ مرنے سے پہلے،اس کے مطابق مرنے سے پہلے اپنی زندگی میں ہی غیب کو پہچان لے اور اپنے ارادے کے ساتھ اس میں خوشی خوشی داخل ہو۔ایسی صورت میں ہر وہ کام جس میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا اور خوشی شامل ہو اس پر عمل کرنے سے روحانی طرزِ فکر اور ذہن بنتا ہے۔ گزشتہ وقتوں میں لوگ ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے برے بڑے چلے کاٹتے تھے۔ مہینوں اور سالوں تنہائی میں رہ کر خاموشی کے ساتھ اللہ کی جانب اپنی پوری توجہ رکھتے تھے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ حضرت صابر کلیر بارہ برس کلیر شریف میں گولر کے درخت کے نیچے مراقب رہے۔ان کے درجات وکرامات سے کون انکار کر سکتا ہے۔

آپ □ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ آپ □ کے خدمت گزار نے پوچھا۔''یاحضرت! فنا وبقا کیا ہے۔فرمایا۔

''پھر بتائیں گے۔''کچھ دنوں بعد آپ □ کا انتقال ہو گیا۔آپؓ نے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ لاش کو ایک پتھر پر رکھ دینا۔خود ہی کوئی آئے گا اور تجہیز وتدفین کا بندوبست کر دے گا۔یہ بات آپ نے اپنے خلیفہ سے کہی جو سالہا سال آپ کی خدمت میں رہے جنہوں نے فنا بقا کا مسئلہ پوچھا تھا۔انتقال فرمانے پر وصیت پر عمل کیا گیا۔اس وقت جنگل میں اور کوئی نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ آئے اور ان کے ساتھ ایک نقاب پوش گھوڑا سوار بھی تھا۔ جسد خاکی کی تدفین کی گئی۔ان خلیفہ کو بہت رشک آیا کہ ساری زندگی میں نے خدمت کی اور آخری وقت یہ کون سبقت لے گیا۔اتنے میں جاتے جاتے گھوڑا سوار نے چہرے سے نقاب ہٹائی۔

فرمایا۔قبر کی جانب اشارہ کر کے۔وہ فنا ہے اپنی جانب اشارہ کر کے کہا۔یہ بقا ہے۔یہ گھوڑا سوار خود مخدوم پاک صابر احمد کلیریؒ تھے۔

بزرگوں کے واقعات پڑھ کر اور ان کی عبادات وریاضت کو جان کر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آدمی جتنی زیادہ سے زیادہ جسمانی اور ذہنی انرجی کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور اپنا دھیان اپنے رب کی جانب لگاتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے اندر باطنی صلاحیتیں متحرک اور پیدا ہو جاتی ہیں۔ بزرگوں کے ہر واقعہ میں ہمارے لئے سبق ہے۔ایک کا تجربہ

www.ksars.org

دوسرے کے لئے نصیحت بن جاتا ہے۔ضروری نہیں کہ ہر شخص اس تجربے سے گزرے اور پھر سیکھے۔بلکہ دوسرے کے تجربے سے سیکھے ہوئے نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کٹھن وادیوں سے گزرنے سے بچا جا سکتا ہے۔جن سے گزر کر انہوں نے نتائج حاصل کئے ہیں۔اللہ پاک روحانی علوم حاسل کرنے کے لیے ہامرے سینے کھول دے۔آمین۔

www.ksars.org

عقل سلیم

۱۔ عقل سلیم سے مراد نور فراست ہے۔ جس کے متعلق اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''جس کو ہم نے عقل سلیم عطا کی اس کو بہت بڑی خیر عطا کی۔'' نور فراست یہ ہے کہ نظر ظاہر سے باطن میں داخل ہو کر شئے کی حکمت کو پہچان لیتی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو صحیح معنی پہچاننے کا نام عقلِ سلیم ہے۔

۳۔ اسمائے الٰہیہ کی روشنیوں کے حواس سے کام لینا عقلِ سلیم ہے۔

۴۔ اللہ پاک نے حضور پاک ﷺ کو عقلِ سلیم عطا کی۔ حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر کو اپنانا عقلِ سلیم ہے۔

۵۔ اپنی توجہ اللہ پاک پر مرکوز رکھنے سے عقلِ سلیم حاصل ہوتی ہے جس سے ہر شئے کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

۶۔ کسی چیز کی فطرت اور حکمت کو پہچان لینا عقلِ سلیم ہے۔

۷۔ عقلِ سلیم ایسی صلاحیت ہے جس کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کے دماغ کو سمجھ سکتے ہیں یعنی معرفت الٰہیہ حاصل کر سکتے ہیں۔

۸۔ The mind that understand the reality of things

۹۔ پاکیزہ خیالات اور مثبت سوچ کی گہرائی میں کائنات کو جاننا عقلِ سلیم۔

۱۰۔ عقل اور ذہنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کرنا عقل سلیم سے کام لینا ہے۔

۱۱۔ ایسی عقل جو قدرت کی رضا سے ہم آہنگ ہو اور بندگی کے وصف کو پوری طرح قبول کرے عقلِ سلیم ہے۔

www.ksars.org

۱۲۔ اپنے ضمیر کی آواز سننااوراس پر عمل کرنا عقلِ سلیم ہے۔

۱۳۔ علم حضوری سے عقلِ سلیم حاصل ہوتی ہے۔

۱۴۔ عقل سلیم سے مراد وہ طرزِ فکراور سوچ ہے جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہ ہو۔

۱۵۔ اللہ کی نظر یاانوار قلب میں جا گزیں ہو کر عقلِ سلیم پیدا کرتے ہیں۔

۱۶۔ اللہ کی صفات کامشاہدہ کرنے سے عقلِ سلیم پیدا ہوتی ہے۔

۱۷۔ غم اور وہم سے بچنے اور چیزوں کی اصلیت پہچاننے سے عقلِ سلیم پیدا ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات۔

سوال نمبر۱۔ عقلِ سلیم سے کیامراد ہے اور نور فراست کیا ہے؟

سوال نمبر۲۔ اسمائے الٰہیہ کیا ہے اس سے ہم کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ معرفت الٰہیہ کیا ہے؟

سوال نمبر۴۔ ضمیر کیا ہے؟ ضمیر کی آواز کس طرح سنی جاسکتی ہے؟

سوال نمبر۵۔ علم حضوری سے عقل سلیم کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

عقل سلیم اللہ پاک کی جانب سے خیر ہے۔ یعنی ایسی مثبت فکر جس میں منفیت کا دخل نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں۔

''مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

حضور پاک ﷺ کی اس حدیث میں غور کرنے سے عقلِ سلیم کی مکمل پہچان ہو جاتی ہے۔ مومن کے متعلق قرآن یوں کہتا ہے کہ ''مومن وہ ہے جس کے سینے میں نور داخل ہو۔''

حضور پاک ﷺ کے معراج کی خبر دیتے ہوئے قرآن یہ کہتا ہے کہ۔ ''دل نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔'' اس آیت میں دل کو آنکھ یا نظر کہا گیا ہے۔ اب اس کی تشریح یوں بنی کہ جب آدمی کے دل میں اللہ کا نور ذخیرہ ہو جاتا ہے تو وہ مومن کہلاتا ہے۔ اللہ کے نور کی صفت نظر یا بینائی ہے۔ دل میں جا کر یہ نور دل کی نظر بن جاتا ہے۔ دل کی نظر غیب میں دیکھی ہے۔ جیسا کہ معراج میں حضور پاک ﷺ نے جو دیکھا اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا۔ نظر کا دوسرا رخ تفکر ہے۔ نظر روشنی ہے اور تفکر اس روشنی میں معنی پہناتا ہے۔

دونوں رخ ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ اگر آدمی کی بینائی یا نظر نور ہے تو تفکر بھی نور میں ہی کام کرے گا اور اگر بینائی مادی روشنیاں ہیں تو تفکر بھی مادی روشنی میں کام کرے گا۔ یہی نگاہ کا قانون ہے۔ مومن وہ ہے جس کے قلب کی آنکھ کھلی ہو۔ یہ آنکھ غیب میں نور کے عالم میں دیکھتی ہے اور ہر چیز کو دیکھ کر اس کی حقیقت کا مشاہدہ کرتی ہے۔ نور کا تفکر ہی عقل سلیم ہے جو ہر شئے کی گہرائی میں دیکھتا ہے اور اس کی حکمتوں کو پہچان لیتا ہے۔ خبیر، علیم، بصیر نور کی صفات ہیں۔ خبیر سے مراد باخبر ہونا ہے یعنی اللہ کا نور باشعور ہے۔ وہ جہاں بھی ہوتا ہے اپنی موجودگی سے اور اپنے گرد و پیش سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ علیم یعنی نور کو اپنی ذات اور صفات کا پورا پورا علم ہے۔ وہ اپنے ظاہر و باطن سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ بسیر یعنی بینائی یا نگاہ، نور بینائی یا نگاہ رکھتا ہے۔ یہ تینوں صفات نور کی صفات ہیں۔

www.ksars.org

جس طرح سمندر کا ایک قطرہ بھی پانی ہے اور سمندر سارا کا سارا پانی ہے۔اسی طرح یہ تینوں صفات نور کی فطرت یا ذات میں داخل ہیں نور خواہ پورا لامحدودیت کا عالم ہو یا نور خواہ اس لامحدودیت کے عالم کا ایک ذرہ ہو۔ یہ تینوں صفات نور کے سارے عالم میں بھی موجود ہیں اور نور کے ایک ذرے میں بھی موجود ہے۔ نور کا ایک ایک ذرہ کائنات کی ایک ایک روح ہے۔ روح اپنی ذات میں خبیر، علیم، بصیر ہے۔ روح سے یہی انوار نزول کر کے جسم کی اور دماغ کی حرکات بنتے ہیں اور جسمانی حواس بنتے ہیں۔ اس طرح سارے حواس روح میں موجود ہیں۔ روح اپنے علوم اور حواس شعور میں منتقل کرتی ہے اور روح جو کچھ نور کے عالم میں دیکھتی ہے آدمی عالمِ ناسوت میں رہتے ہوئے اپنے قلب کی آنکھ سے نور کے عالم میں مشاہدہ کر لیتا ہے۔ عقل سلیم نور کی وہ صفت ہے جو اسم خبیر ہے، علیم ہے اور بصیر ہے۔

اس طرح نور کی تینوں صفات عقل سلیم کے حواس بناتی ہیں۔ان ہی حواس کے ذریعے حضور پاک ﷺ نے معراج میں اللہ پاک کی تجلیات کا مشاہدہ کیا۔ قرآن میں مسلمان اور مومن کی پہچان الگ الگ بیان کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ابھی تم صرف مسلمان ہو، مومن نہیں ہو۔ابھی ایمان تمہارے سینوں میں داخل نہیں ہوا۔"

قرآن کی رو سے مسلمان وہ ہے جو مادی آنکھ یا نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے حواس مادی روشنی میں کام کرتے ہیں اور مومن وہ ہے جو دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور ہر شئے کے اندر نور کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس کے دل کا نور اس کی نگاہ اور حواس بنتی ہے۔

اب ہم عقلِ سلیم کی روشنی میں ایک مسلمان اور ایک مومن کے کردار کا موازنہ کرتے ہیں تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان اور مومن کی مکمل پہچان کیا ہے اور چونکہ ایک مومن کا کردار ہی روحانی کردار ہے اس وجہ سے یہ ہمارے موضوع کے لئے مفید ترین بھی ثابت ہو گا۔ مسلمان وہ ہے جو ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے ہی اس کے ماں باپ نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ مسلمان ہے اور ایک مخصوص عقائد کا پابند ہے۔ماں

www.ksars.org

باپ بچے کے ذہن میں مذہب سے متعلق وہی باتیں منتقل کرتے ہیں جن علوم پر وہ خود عمل پیرا ہیں یا جن مذہبی عقائد سے وہ واقف ہیں۔ بچہ اسے قبول کر کے مسلمان کہلاتا ہے۔ گویا بچہ مذہبی امور پر جو بھی عمل کر رہا ہے وہ اپنے ماں باپ کی پیروی ہے۔ نہ اس میں اس کے اپنے ارادے کا دخل ہے اور نہ اسے اللہ کی رضا اور ارادے کا کچھ علم ہے۔ ایسی تقلید میں محض ماں باپ کی فرماں برداری کا تو دخل ہے مگر عقل سلیم کا دخل نہیں ہے۔ جب بچہ اپنا ارادہ استعمال کرتا ہے اپنی عقل سے اللہ کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے تو ماں باپ کے عطا کردہ نظریات کو وہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے نہ کہ عقیدت کی نگاہ سے۔ عقیدت فرمانبرداری سے پیدا ہوتی ہے اور تنقید غیر جانبداری ذہن کی فکر ہے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ بت تراش تھے۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذہن قطعی طور پر غیر جانبدار تھا۔ اس نے ماں باپ کے اور ساری قوم کے مزہبی عقائد کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ ذہن کی غیر جانبدار فکر اپنے باپ کے فعل کو جب تنقیدی نظر سے دیکھتی ہے تو اس فکر کا نور ان کی عقل کو روشن کر دیتا ہے۔ اس نور کی روشنی میں عقل باپ کے مذہبی عقائد کو گہرائی میں دیکھتی ہے اور حقیقت سے واقف ہو جاتی ہے اور پھر اپنے باپ کی فرمانبرداری کرنے سے انکار کر دیتی ہے کیونکہ عقلِ سلیم اللہ کے ارادے کی حکمت کو دیکھ لیتی ہے جب وہ اللہ کے ارادے اور ماں باپ یا اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے لوگوں کے ارادے میں تضاد دیکھتی ہے تو کسی طور پر بھی عقل تسلیم نہیں کرتی کیونکہ خالق کا ارادہ مخلوق کے ارادے پر سبقت رکھتا ہے اور عقلِ سلیم خالق کے ارادے کا پہچاننا ہے۔ پس اس واقعہ کی روشنی میں ایک مسلمان اور مومن کا فرق واضح ہو جاتا ہے کہ ماں باپ بچے کو مذہبی عقائد منتقل کرتے ہیں جب بچہ ان کی تقلید کرتا ہے تو وہ اپنے ماں باپ کے ذہن پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ دین اسلام ہو، عیسائیت ہو، یہودیت ہو، یا ہندوازم ہو یا اور بھی کچھ ہو اس سے غرض نہیں۔ ہمیں تو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اللہ پاک کس دین کی تقلید کا حکم دیتے ہیں اور وہ کون سے عقائد اور اصول ہیں جو پیغمبر لے کر آئے ہیں اور اس دین کی رہنمائی کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس ہی واقعہ سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ انفرادی طور پر ہر آدمی و عورت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی اندھی تقلید کے بجائے دین کے معاملات میں خود اپنی غیر جانبدارانہ فکر کے مطابق غور و فکر کرے اور وہی ذرائع اس کے لئے استعمال کرے جن کے لئے اللہ اور اس کے پیغمبروں نے حکم دیا ہے، یعنی کتاب اور سنت۔ کیونکہ ہر فرد اپنی زندگی کے اعمال کا ایک جداگانہ ریکارڈ یا فلم

www.ksars.org

بنارہاہے اور اس ریکارڈ یا فلم کا مین کردار فرد کی اپنی ذات ہے نہ کہ ماں باپ یااور کسی دوسرے کی ذات۔ قرآن میں ایک سے زیادہ پیغمبروں کا تذکرہ ملتاہے۔ بہت سے پیغمبروں کے متعلق تفصیل سے ذکر آیاہے کہ ان کی پیدائش بت پرستی کے ماحول میں ہوئی۔ اس کا مطلب پیغمبروں کی عقل نے شروع ہی سے دنیاوی روشنیوں کو قبول نہیں کیابلکہ اس نور کو تلاش کرنے لگے جو نور انہیں اور ساری دنیا کو قوت بخشنے والا ہے۔ حضور پاک ﷺ کی حدیث ہے کہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتاہے۔ فطرت ہی دین اسلام ہے۔ پھر بعد کو اس کے ماں باپ اور ماحول سے یہودی اور نصرانی بنادیتے ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ ہر بچہ ایک ہی عقیدے پر پیدا ہوتاہے۔ اس بات کو قرآن بھی اس طرح کہہ رہاہے کہ ہم نے ہر شئے کو اس کی فطرت پر پیدا کیاہے۔ اس کا مطلب یہ کہ جو عقل فطرت کو پہچانتی ہے اور فطرت کی روشنی میں پیغمبروں کے لائے ہوئے اصولوں کو مانتی ہے وہی عقل درست راستے پر ہے۔ خواہ ساری دنیا اسے رد کردے۔ جیسا کہ پیغمبروں کے ساتھ ہوا کہ ساری قوم میں سے ایک شخص واحد اپنا الگ نظریہ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا مگر چونکہ اس کا نظریہ حق پر تھا۔ فطرت کے تمام اصول اس کی رہنمائی کرنے لگے اور وہ ایک آدمی ساری قوم سے ٹکرا گیا۔

عقلِ سلیم کا ایک اور نمونہ قران میں آیاہے جو پیغمبرانہ فراست کا آئینہ دار ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اللہ کا پیغام لے کر نمرود کے دربار میں پہنچے تو توحید کے منکر کو قائل کرنے کے لئے عقلی دلیلیں پیش کیں تاکہ اس کی گمراہ عقل صحیح راہ پر لگے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے نمرود! تو اپنے آپ کو خدا کہتا ہے مگر خدا کے ذمہ تو ایسے کام ہیں جو مخلوق نہیں کرسکتی۔ مثلاً خدا روز روز مشرق سے سورج طلوع کرتاہے تو صرف ایک دن مغرب سے سورج کو طلوع کردے تو پھر تیری خدائی قوت مانی جائے۔"

قرآن یہ کہتاہے کہ یہ بات سن کر نمرود کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

فطرت کے حقائق کو سمجھنے والی عقل کو عقلِ سلیم کہتے ہیں۔ انسان کے اندر اس کا نزول ضمیر کے مقام پر ہورہاہے۔ اس مقام پر یہ عقل شئے کے پس پردہ کام کرنے والے حقائق کو آشکار کردیتی ہے اور پھر آدمی اپنا اختیار

www.ksars.org

شعوری ارادہ مجبت یا منفی طور پر اختیار کرتا ہے۔ ضمیر کا مقام قلب کی گہرائی ہے۔اسی مقام پر آدمی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ فیصلہ کرتے وقت کام کی نوعیت کا دل پر انکشاف ہو جاتا ہے۔اسی کو بصیرت کہتے ہیں۔ بصیرت عقلِ سلیم کے ہم معنی ہے۔اس کے ذریعے ہمارے کردار میں نظم وضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے اعمال وافعال میں اعتدال اور تنظیم آجاتی ہے۔ دراصل ضمیر قلب کی وہ گہرائی ہے جہاں روح کی فکر کا نور نزول کرتا ہے۔ یہ روح کی انفارمیشن ہے جو وہ شعور کو دیتی ہے۔اس مقام پر ناسوتی حواس اس اطلاع یا نور کو جذب کر کے شعور میں پھیلا دیتے ہین۔آدمی یا اس نور کو جذب کر لیتا ہے یا رد کر دیتا ہے۔ ضمیر کی آواز پر کان دھرنا قبول کرتا ہے اور ضمیر کی آواز سے منحرف ہونا نور کا رد کرنا ہے۔اللہ اپنی زات میں خبیر ہے۔ لہذا نور کا ہر ذرہ باشعور ہے۔ جب آدمی نور کو جذب کر لیتا ہے تو نور کے اندر موجود شعور خود اس کی اپنی ذات کا شعور بن جاتا ہے جیسے دریا کے پانی کو بالٹی میں بھریں تو اب بالٹی بھر پانی کہیں گے۔ گویا بالٹی کی حدود میں انے سے پانی بالٹی سے منسوب ہو گیا۔اب اسے سدر یا نہیں کہتے۔ نور جب شعور انسانی میں جزب ہو جاتا ہے تو وہ انسان کا شعور کہلاتا ہے۔ یہ اللہ کی کاریگری ہے کہ اس نے لامحدودیت یعنی نور کو محدودیت یعنی آدمی کے شعور میں منتقل کر دیا ہے۔ لامحدودیت کا شعور محدودیت میں آکر اللہ پاک کے سبحانیت اور پاکی کا اعتراف کر رہا ہے۔ شعور کی منتقلی کن کہنے سے عمل میں ائی اور تجلی کا شعور ٹھوس حالت میں ظاہر ہو گیا۔ عالم ناسوت کے حواس ٹھوس یا مادی حواس ہیں۔ تجلی لا لطیف ترین شعور چار درجات سے گزر کر مادی شعور میں تبدیل ہوا۔ شعور اول، شعور دوئم، شعور سوئم اور شعور چہارم۔ مادی حواس شعور چہارم کا زون ہے، جس میں ہم رہتے ہیں۔ اللہ کا ہر فعل ایک مربوط نظام کے تحت ہے۔ لطیف ترین شعور کا کثیف ترین شعور مین تبدیل ہو جانا بھی ایک نظام یا سسٹم کے تحت ہے۔اس نظام کو بدائیت کہتے ہیں۔ بدائیت شعوری دباؤ یا حیاتی دباؤ کے تحت عمل میں آتی ہے۔ حیات بذات خود ایک ایسی حرکت ہے جو اللہ کے حکم سے شروع ہوئی۔اللہ کے حکم یا امر کی حرکت حیات ہے اور حیات کا ادراک بدائیت ہے۔ بدائیت حیاتی دباؤ یا حیات کے ادراک کے دباؤ کا نام ہے۔ جیسے جیسے اللہ پاک کے کن کہنے سے امر کی تجلی لامحدودیت سے محدودیت کی جانب سفر کرتی جاتی ہے محدودیت کی وجہ سے اس کی رفتار میں فرق آتا جاتا ہے۔ رفتار میں فرق انے سے ادراک کی کیفیات واحوال بدل جاتے ہیں اور ادراک کی مسلسل تبدیلی حواس کو جنم دیتی ہے۔ چناچہ مادی حواس حیاتی دباؤ کا نتیجہ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آدمی شعوری

www.ksars.org

اعتبار سے اپنے آپ کو جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ عقل سلیم وہ نور ہے جو مادیت میں جکڑے ہوئے اس شعور کو دنیاوی غلبے سے آزاد کرتا ہے اور شعور کو نور کی رفتار کی طرف لے جاتا ہے جس سے حواس لطیف ہو جاتے ہیں اور امر ربی یا روح کے کندھوں سے حیاتی دباؤ کم ہو جاتا ہے۔

بدائیت کا عمل اور اس کی تمثیل اس دنیا میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ جیسے شبنم کا قطرہ جب سیپی کے اندر قید ہو جاتا ہے تو قطرے کا شعور جو کہ پانی کا شعور ہے اور پانی کا شعور مائع ہونے کی وجہ سے ٹھوس کے مقابلے میں لطیف ہے۔ لطافت کثافت کے مقابلے میں رفتار میں تیز ہوتی ہے۔ جب شبنم کا شعور وادراک سیپی کے اندر محبوس ہو جاتا ہے تو حیاتی دباؤ جو کہ ایک مسلسل حرکت ہے، کی وجہ سے ادراک اور شعور کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے۔ جیسے جیسے ادراک سست ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے تبدیلی آتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ شبنم کا قطرہ جو کہ پانی کا قطرہ ہے موتی بن جاتا ہے۔ قطرے کا موتی میں تبدیل ہو جانا شبنم کے قطرے کے حواس وادراک کی تبدیلی ہے۔ ذات وہی رہتی ہے مگر حواس و ادراک بدل جاتے ہیں۔ حواس بدلنے سے شئے میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ شئے سے مراد ظاہری خدوخال ہیں۔ جیسے مرنے کے بعد بھی آدمی زندہ رہتا ہے مگر یہ زندگی دنیاوی زندگی سے اس لئے مختلف مانی جاتی ہے کہ دنیا کے حواس میں ربدیلی آجاتی ہے۔ یہاں بھی حواس کی تبدیلی آدمی کی حدود کے اندر واقع ہوئی۔ وہاں بھی حواس آدمی کے اندر ہی کام کرتے ہیں۔ جیسے خواب کے حواس اور جاگنے کے حواس دونوں میں کردار آدمی ہے۔ موتی کا شعور موتی کے حواس ہیں مگر لاشعور شبنم کے قطرے کے حواس ہیں۔ اسی طرح آدمی کا شعور مادی حواس ہیں۔ مگر لاشعور روح کے حواس ہیں اور روح کا شعور اللہ کے امر کی تجلی کا شعور ہے۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس میں روح اور جسم بندھا ہوا ہے۔ عقل سلیم آدمی کو اس کے اپنے شعور کے اندر ہی اندر سیڑھی پہ زینہ بہ زینہ لے کر چڑھتی ہے۔ ادراک کی گہرائی کا ہر قدم آدمی کو اپنی روح سے قریب کرتا ہے۔ پس عقل سلیم وہ شعور ہے جو آدمی کو روح کو سمجھنے اور غیب میں روح کی حرکات کو پہچاننے اور مشاہدہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

www.ksars.org

تعمیلِ ارشاد

۱۔ مرشد کریم کے ہر حکم کی تعمیل بلا حیل وحجت کرے۔

۲۔ مرشد کریم کے حکم کی تعمیل بلا چوں وچرا کی جائے اور حکم کی ادائیگی میں مادی مصلحتوں کی پرواکئے بغیر جان اور مال اور وقت کی قربانی دی جائے۔

۳۔ اپنی ذاتی انا کے فیصلے کو مغلوب کر کے مرشد کو مقدم جانے۔

۴۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اپنے پیر ومرشد کی ہر بات کو دل سے صحیح اور اپنے لئے بہتر جان کر ان کے حکم کو بجالانا تعمیلِ حکم ہے۔

۵۔ حضور علیہ السلام کی پیروی کرنا تعمیلِ حکم ہے۔

۶۔ روحانیت میں تعمیل حکم یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ کی رضا کو اپنی رضا بنالے۔ جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے اپنے رسول ﷺ کی رضا کو اپنی رضا قرار دیا تھا۔

۷۔ اپنا آپ مکمل طور پر مرشد کے حوالے کر دینا اور پھر اپنی مرضی نہ رکھنا تعمیلِ حکم ہے۔

۸۔ Having no doubt is obedience.

۹۔ ہر وہ کام جس کا حکم حضور پاک ﷺ نے دیا ہے وہ کام کرنا اور جس کام سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے وہ نہ کرنا تعمیل حکم ہے۔

۱۰۔ اپنی انا ختم کر دینے کا نام تعمیل حکم ہے۔

www.ksars.org

۱۱۔ تعمیل حکم سے متعلق قرآن کاارشاد ہے۔ تم اللہ کی اطاعت کرواور اس کے رسول ﷺ کی اور اہلِ امر کی جو تم میں سے ہیں۔اہلِ امر میں مرشد کی ذات بھی آگئی۔

۱۲۔ بندگی تعمیلِ حکم ہے۔

۱۳۔ تعمیل حکم کانام بندگی ہے۔ جیسے قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ تم کو جو دیں وہ لے لواور جس چیز سے منع کریں اس سے دور رہو۔

۱۴۔ قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔''یعنی اللہ اور رسول ﷺ جو حکم تم کو دیں اس پر پورا پورا عمل کرو۔

۱۵۔ اپنے ارادوں کی نفی کرنااور مرشد کے حکم کی تعمیل کرنا تعمیل حکم ہے۔

۱۶۔ حکم میں انکار کی گنجائش نہیں ہے۔بندگی کی ڈگر پر چلنے والا ذہنی تعمیل حکم کے اس اصول پر کار فرما ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ آدابِ مرشد کیا ہیں؟ایک مرید کو اس کا کتنا خیال رکھنا چاہیئے؟

سوال نمبر ۲۔ خود سپردگی کیا ہے؟ایک مرید کے لئے یہ کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۳۔ انا کی نفی روحانیت میں کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۴۔ شک اور یقین کی روحانیت میں کیا اہمیت ہے؟

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

تمام مخلوق کی زندگی کی حرکات اللہ تعالی کے امر پر قائم ہے۔اللہ تعالی کے امر کی بنیاد اللہ پاک کے وہ افکار ہیں جو کائنات کی ہر شئے کے پس پردہ حکمت بن کر کام کر رہے ہیں۔اللہ کے امر کی تعمیل میں ازل سے روح سر گرم عمل ہے۔شعور جب پیدا ہوا تو ہمارے اندر ہماری انفرادی شناخت پیدا ہو گئی۔انفرادی شناخت انفرادی ذہن و شعور ہے اور ذہن یا دماغ ارادہ ہے۔اس دنیا میں ہر آدمی کا اپنا دماغ اور اپنا ارادہ کام کر رہا ہے جو ہمارے جسم کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔انفرادی شعور کی حرکت روح کے تابع ہے۔روح کو اللہ نے امر ربی کہا ہے۔یعنی روح کا براہ راست تعلق اللہ کے امر سے ہے۔روح اللہ کے حکم کو براہ راست موصول کر کے اس پر عمل میں کوشاں ہو جاتی ہے۔اس طرح انفرادی شعور وارادے کے پس پردہ روح کا شعور وارادہ بھی کام کر رہا ہے۔روح کے شعور اور ارادے کو توانائی بخشنے والی ایجنسی اللہ تعالی کے افکار ہیں جو اللہ کا ذاتی ارادہ ہے۔روح کی ہر حرکت اللہ کے امر کی حرکت ہے۔کیونکہ روح کا تعلق براہ راست اللہ کے امر سے۔روح کا ذہن اللہ کا امر ہے۔روح جب اپنے ذہن سے سوچتی ہے تو اس خیال میں اس کی ذاتی انا بحیثیت اللہ کے امر کے ہیں۔یہی سوچ جب آدمی کے اندر منتقل ہوتی ہے تو وہ اللہ پاک کو اپنے ہر فعل کا فاعل حقیقی سمجھ لیتا ہے۔یہاں سے تعمیل حکم کا قانون اور سسٹم ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ انفرادی ارادے اور شعور کا رابطہ جب اللہ کے امر سے قائم ہو جاتا ہے تو آدمی اپنے ارادے سے کوئی کام کرتا ہے۔اس عمل کے اندر اللہ کے امر کی روشنی انرجی بن کر کام کرتی ہے۔ایسی صورت میں آدمی مکمل یکسوئی کے ساتھ اور پورے یقین کے ساتھ کام کرتا ہے۔اس کے ذہن میں ذرا برابر بھی شک نہیں ہوتا۔شک شبہ اور یقین کی کمزوری شعوری کمزوری ہے۔یقین روح کے ارادے کا نور ہے۔عمل کرتے وقت کامل یقین ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ روح کا ارادہ بھی اس میں شامل ہے۔ایسا ہی کام تعمیل حکم کے دائرے میں اتا ہے جو ضمیر پر بوجھ نہیں بنتا۔ضمیر پر بوجھ بننے کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی ارادے اور روح کے ارادے میں تضاد ہے۔یعنی انفرادی ارادہ اللہ کے امر کے خلاف حرکت کرنا چاہتا ہے۔یہی تضاد ضمیر پر بوجھ بن جاتا ہے اور اللہ کے امر کے راستے میں مزاحمت اور رکاوٹ بن جاتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب روح کا تعلق براہ راست اللہ کے امر سے ہے اور روح غلطی نہیں کرتی تو شعور کیونکر غلطی کا مرتکب ہوتا

www.ksars.org

ہے۔اصل بات تو یہ ہے کہ مادی شعور اور روحانی شعور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔روحانی شعور جنت کا دماغ ہے اور مادی شعور دنیا کا۔جنت اللہ کے ارادے کی تخلیق ہے۔اللہ کے ارادے اور حکم میں ٹائم اینڈ اسپیس نہیں ہے۔اللہ پاک جنت کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ جنتی جس شئے کی خواہش کریں گے وہ فوراً حاضر ہو جائیں گی۔ یعنی جنت میں آدمی کا دماغ اللہ کے امر کی حرکت بن جائے گا یہ روحانی شعور ہے۔مادی شعور آدم و حوا کے احساس جرم کی صورت ہے۔ غلطی بذات خود ایک وقفہ ہے۔امر حرکت ہے اور آدم و حوا کی غلطی امر کی حرکت کا ایک لمحے کو ٹھہر جانا ہے یا رفتار کا کم ہو جانا ہے۔جنت میں آدم و حوا کا دماغ اللہ کے امر کی طبعی اور فطری حرکت کے مطابق حرکت کر رہا تھا جیسے ہی کسی وجہ سے آدم و حوا کے دماغ کی حرکت اللہ کے امر کی حرکت سے رفتار میں کم ہوئی۔اللہ کے امر کی آواز ان کے ذہن سے منقطع ہو گئی۔امر کی لہریں اللہ کے حکم کو نشر کر رہی تھی وہ اسپیڈ بدل گئی۔ جس کی وجہ سے سے روشنی کی فریکوئنسی بدل گئی۔آپ جانتے ہیں کہ دماغ سے اگر خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو دماغ مر جاتا ہے اور دماغ کے مرتے ہی سارا جسم بے حس و حرکت ہو جاتا ہے کیونکہ دماغ ہی سارے جسم کو حرکت کا حکم دیتا ہے۔جس کی وجہ سے جب دماغ مر جاتا ہے تو آدمی کو مردہ قرار دے دیا جاتا ہے۔فریکوئنسی یا امر کا منقطع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدم و حوا کا جنت کا دماغ وقتی طور پر رک گیا۔انہیں اللہ کے امر کی جو اطلاعات مسلسل وصول ہو رہی تھیں وہ رک گئیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں آدم و حوا کی موت واقع ہو گئی۔ مگر اللہ پاک آدم و حوا کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔پس جس لمحے جنت میں ان کی موت واقع ہوئی اور اللہ کے امر سے ان کا رابطہ ٹوٹا دوسرے ہی لمحے ان کا رابطہ ایک دوسری فریکوئنسی سے قائم ہو گیا اور زندگی کی حرکات کی اطلاع انہیں اب اس دوسری فریکوئنسی پر ملنے لگیں۔ہمارے تمام حواس اطلاعات پر قائم ہیں۔ حواس کے دائرے میں جو بھی اطلاع آتی ہے حواس اس اطلاع کو معنی پہنا دیتے ہیں۔اطلاع کو حواس کے دائرے میں معنی پہنانے کا مطلب یہ کہ اطلاع آئی کہ درخت ہے،یہ اطلاع پہلے دماغ نے موصول کی پھر یہاں سے جسم کے دوسرے اعضاء میں منتقل ہوتی ہے۔جب یہ اطلاع آنکھوں کے عضلات کو ملی یا بصارت کی حس کو وصول ہوئی تو آنکھ نے درخت دیکھ لیا۔سماعت کی حس کو ملی تو کانوں نے

www.ksars.org

درخت کی آواز سن لی۔ اسی طرح جس جس حس تک اطلاع پہنچتی ہے وہ وہ حس اپنا کام انجام دیتی ہے اور درخت کے متعلق علوم حاصل کر کے شعور تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا آدمی کی تمام حسیں شعور کو اطلاع کے متعلق علم دینے کے لئے مقرر ہیں۔ اس دوسری فریکوئنسی پر ملنے والی تمام اطلاعات زمین سے متعلق تھیں جس کی وجہ سے آدم وحوا کا مادی شعور ابھر آیا۔ جنت نوری عالم تھا۔ دنیا خاکی نقش ونگار کا عالم ہے۔ آدم وحوا کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ جو براہ راست کام ہوتے تھے اب ہر شئے پر ایک ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ جنت کی نظر پر پردہ پڑ گیا۔ پس وہ جان گئے کہ مادی شعور کی بنیاد ہماری نافرمانی ہے۔ جب دونوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اللہ پاک سے معافی مانگ لی تو اللہ میاں نے بھی اپنی بارگاہ میں انہیں قبول کر لیا اور دوبارہ جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ کائنات ایک جاری وساری نظام ہے۔ ہر بنی نوع آدم جنت سے غلطی کا ارتکاب کر کے دنیا میں اتا ہے اور یہاں پھر دوبارہ اپنے رب سے ملنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ آدم وحوا کے قصے میں ہمیں تعمیل حکم کا قانون پتہ چل جاتا ہے۔ تعمیل حکم کا مطلب اپنے ارادے کی مکمل طور پر نفی ہے۔ جب تک آدم وحوا جنت میں رہے اللہ کے حکم پر کام کرتے رہے۔ اللہ نے انہیں کہا تھا کہ تم اور تمہاری بیوی یہاں رہو۔ خوش ہو کر کھاؤ۔ بس اس درخت کی طرف مت جانا باقی ساری جنت تمہاری ہے تم جہاں مرضی جا سکتے ہو اور کھا پی سکتے ہو۔ جب تک آدم وحوا اللہ کے ارادے اور ذہن کے مطابق عمل کرتے رہے خوش باش رہے جیسے ہی اللہ کے ارادے کے خلاف اپنا ارادہ استعمال کیا وہیں مارے گئے۔ اس سے غرض نہیں انہوں نے اپنا ارادہ دانستہ استعمال کیا یا غیر دانستہ۔ بہر حال غلطی تو ہو گئی۔ جب عمل ہو گیا تو نتیجہ بھی ضرور ہی برآمد ہو گا۔ عمل کے بعد نتیجے کو روکا نہیں جا سکتا۔ پس تعمیلِ حکم یہ ہے کہ حکم دینے والے کے ارادے میں اپنا ارادہ شامل نہ کیا جائے۔ حضور باباجی نے اس حوالے میں ایک مثال دی تھی کہ اگر مرشد اپنے کنوئیں میں کود جانے کا حکم دیں مگر کنوئیں میں کودتے وقت مرید کے ذہن میں خیال آ جاتا کہ مرشد بچا لے گا تو یہ حکم کی تعمیل نہ ہوئی اگرچہ وہ کنوئیں میں کود بھی گیا۔ قانون یہ بنا کہ تمام حواس حکم کے نقطے پر ٹھہر جائیں۔ حکم کا خیال ذہن جب تھک جائے گا تو وہی خیال یا حکم بار بار ذہن میں گردش کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس پر عمل نہ ہو جائے۔ بار بار ایک ہی خیال کا ذہن دل

www.ksars.org

میں بار بار دہرانے سے تمام حواس اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ تمام حواس کے اندر خیال کی روشنی پہنچ جاتی ہے۔ تمام حواس کو اطلاع مل جاتی ہے۔ پس ذہن ودل کے کسی بھی کونے میں شک وشبہ نہیں رہتا۔ آدمی دل و جان سے اس پر عمل کرلیتا ہے۔ حکم کی تعمیل کے خیال کے سوا اس کے دماغ میں کوئی دوسرا خیال آتا ہی نہیں۔

قرآن میں تعمیل حکم کی ایک تمثیل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسی علیہ اسلام کو اپنی ہمراہی میں اس شرط پر رکھنا منظور کیا کہ جب تک اپنے عمل کے متعلق وہ خود بات نہ کریں ان سے استفسار نہ کیا جائے۔ اس شرط میں بہت بڑی حکمت ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کے حکم پر عمل کرنے کے لئے دل ودماغ کو مکمل یکسوئی کی ضرورت ہے۔ یہ یکسوئی خاموشی میں ہی حاصل ہو سکتی ہے تاکہ تمام حواس حکم کے اجزاء پر سیٹ ہو جائیں۔ ذہن ودل میں ایک ہی خیال جاگزیں ہو جائے۔ یہاں تک کہ جسم کے تمام اعضاء اس کام کے کرنے پر مستعد ہو جائیں۔ اس کے برعکس جب کوئی دوسرا فعل میں استفسار کرے گا تو اس کے جواب میں ذہن خیال یا حکم کے اصل نقطے سے ہٹ جائے گا اور آدمی کا اپنا ارادہ کام کرنے لگے گا۔ جس کی وجہ سے حکم کی فکر پر آدمی کا اپنا ارادہ غور و فکر کرنے لگے گا اور تعمیل حکم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے اس قصے میں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تعمیل حکم پر تمام حواس کا بیک وقت عمل کرنا ہے۔ تمام حواس جب بیک وقت متحرک ہوتے ہیں تو اس کام کا اصل فاعل امر ربی یا روح ہوتی ہے۔ روح اللہ کے حکم پر فوراً ہی عمل کرتی ہے۔ اسی طرح جیسے شعور میں اطلاع آتی ہے بندہ فوراً ہی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کا خیال تعمیل کے سوا کسی اور طرف جاتا ہی نہیں۔ عمل کے بعد اسے کام کی حکمتوں کا علم ہوتا ہے۔ یعنی تعمیل حکم کا ایک سوال یہ ہے کہ عمل کرنے والا حکم پر اس قدر عجلت سے عمل کرے کہ اس کا عمل پہلے ہو اور پھر بعد کو عمل کی حکمتیں اور علم اس کے ذہن میں آئے۔ اس طرح حکم کے ساتھ ہی حکم دینے والے کا ارادہ غالب آجاتا ہے اور اس کے ارادے سے کام اسی طرح ہو جاتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔

تعمیل حکم کے ذریعے نفس ادب سیکھتا ہے۔ مرید کے لئے مرشد کی ذات اللہ کے نائب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مرید کو روحانی علوم مرشد کے ذریعے تقسیم ہوتے ہیں۔ مرید کے لئے ذہن کی مرکزیت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کے لئے مرشد کے حکم پر دل وجان سے عمل کرنا ضروری ہے۔ جیسے جیسے مرید تعمیل حکم کرتا جائے گا اس

www.ksars.org

کے اوپر مرشد کا ارادہ غالب آتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس کے ذہن کی حرکت مرشد کے ارادے کی حرکت بن جائے گی۔ پھر ایک وقت یہ ہوگا کہ مرشد کے ذہن میں خیال آیا اور گزر گیا اور یہی خیال مرشد کے ذہن سے منتقل ہو کر مرید کے ذہن میں آگیا اور مرید نے اس کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس طرح مرشد اور مرید خیال یا حکم کی ایک زنجیر میں بندھ جاتے ہیں۔ خیال کا رخ مرشد کی جانب ہوتا ہے اور عمل کا رخ میرد کی جانب۔ ایک حکم دینے والا دوسرا اس حکم پر عمل کرنے والا۔ تعمیل حکم بندی کا اصول ہے۔ بندگی اللہ کے ارادے پر بندے کی حرکت ہے۔ بندگی کے اندر اپنے ارادے اور اپنی انا کا تصور بھی گناہ عظیم ہے۔ مرشد اپنے مرید کو بندگی کے آداب سکھاتا ہے۔ روحانیت کے علوم بندگی کے دائرے میں ہی سیکھے جا سکتے ہیں۔ بندگی کے دائرے سے باہر اللہ نہیں ملتا۔ جہاں اللہ نہیں وہاں کچھ نہیں۔ کائنات میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں اللہ نہ ہو۔ بندگی کے راستے سے ہٹ کر بندے کو نہ اللہ ہی ملتا ہے نہ اسے اپنی ذات کا سراغ ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

لالچ اور حسد

۱۔ حسد کرنا آدمی کو اللہ کے احسانات سے دور کر دیتا ہے اور آدمی اللہ کا ناشکرا بن جاتا ہے۔ اس سے بچنا اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنا ہے۔

۲۔ حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر اپنانے سے انسان کے اندر سے حسد دور ہو جاتا ہے۔

۳۔ حسد انسان میں قابلیت کو زائل کر دیتا ہے۔ حسد ایک آگ ہے جو آدمی کے اعصاب میں شامل ہو کر تعمیری صلاحیتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

۴۔ حسد احساس کمتری کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے آدمی غیر جانبدارانہ فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اپنے اندر استغناء پیدا کرنے سے حسد کی بیماری سے اجتناب کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ Jealousy lead to evil dead. Roohani Tarz e fikir helps you to a avoid it.

۶۔ حسد شیطان کی فطرت ہے۔ حسد کرنے سے انسان اللہ سے دور ہو جاتا ہے اور شیطان سے قریب ہو جاتا ہے۔ اس سے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ مثلاً السر، ڈپریشن وغیرہ۔ اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ پاک کو اپنے ہر کام میں شامل کر لیا جائے۔

۷۔ روحانی علوم لامحدود ہیں۔ حسد کرنے والے کا ذہن محدود ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے حسد کرنے والا روحانی علوم حاصل نہیں کر سکتا۔

www.ksars.org

۸۔ حسد ایک بیماری ہے جس سے دل کمزور ہو جاتا ہے۔ اللہ کا ذکر کرنے سے دل کی ساری بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔

۹۔ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح سوکھی لکڑیوں کو آگ۔'' روزمرہ زندگی میں حسد کا نقصان یہ ہے کہ انسان کی ذہنی وسعت کم ہو جاتی ہے اور وہ تعصّبات میں گھر جاتا ہے ۔حسد کا اجتناب یہ ہے کہ ایک دوسرے کی قابلیت کو خدا کی دین سمجھنا اور کھلے دل سے اس کی تعریف کرنا۔

۱۰۔ حاسد یہ چاہتا کہ جو چیز دوسرے کو حاصل ہے اگر اسے نہیں مل سکتی تو دوسرے کے ہاتھ سے بھی جاتی رہے۔ حسد ایک انتہائی منفی جذبہ ہے۔ جس کا سب سے پہلا مظاہرہ شیطان نے کیا۔ اس نے کہا کہ جس طرح آدم کی وجہ سے وہ راندہءدرگاہ ہوا وہ بھی آدم کی نسل کو برباد کر کے چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی ترغیب دی ہے۔''وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔''(سورہ فلق)

۱۱۔ حسد کرنے والے کو انفرادی نقصان جیسے بلڈ پریشر ہو جاتا ہے اور حاسد کی طرزِ فکر و عمل سے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ منفی خیالات سے اجتناب ضروری ہے۔

۱۲۔ حسد کی آگ روحانی راستوں میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سے اجتناب بہت بڑا جہاد ہے۔

۱۳۔ حسد سے نار کی صفات متحرک ہو کر اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ اس سے بچاؤ کے لئے اللہ پاک کی پناہ میں رہنا اشد ضروری ہے۔

۱۴۔ حسد سے سلگتی ہوئی گیلی لکڑی کی طرح انسان کے اندر غم اور غصے کا دھواں بھر کر اس کی ساری اچھی صلاحیتوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جس سے آدمی مثبت انداز میں سوچ ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

سوالات

سوال نمبر ۱۔ حسد کیا ہے؟اس سے کیوں بچنا ضروری ہے؟

سوال نمبر ۲۔ حسد کے نقصانات کیا کیا ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ جلال اور جمال کی تشریح کریں۔

سوال نمبر ۴۔ شیطانی اور رحمانی انسپائریشن میں ہم کس طرح تمیز کر سکتے ہیں؟

☆☆☆☆☆

اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہین کہ ہم نے ہر شئے کو اس کی فطرت پر پیدا کیا ہے اور اللہ کی فطرت میں اور سنت کے قوانین میں کوئی ردوبدل یا تغیر نہیں ہے۔ فطرت اسمائے الٰہیہ کے خواص ہیں اور اسمائے الٰہیہ اللہ پاک کی صفات ہیں۔ سنت کے قوانین فطرت کو اس کی طبعی حالت پر قائم رکھنے والے نظام ہیں۔ چونکہ اسمائے الٰہیہ 'فطرت اور سنت کے قوانین ان سب کا تعلق اللہ پاک کی ذات وصفات سے ہے جس کی وجہ سے اللہ پاک نے فرمایا کہ ان میں تبدیلی اور تعطل ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے اندر موجود اشیاء میں اگر ہم غور وفکر کریں تو ہر شئے کے اندر فطرت کا ایک مخصوص نظام کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر مچھلی کا نام لیتے ہی ہمارے تصور میں ایک ایسی مخلوق آجاتی ہے جس کا تعلق پانی سے ہے۔ ہمارا تصور جب بھی دیکھے گا تو مچھلی کو پانی کے اندر دیکھے گا۔ گویا پانی میں رہنا مچھلی کی فطرت میں داخل ہے۔ فطرت سے الگ کر کے مچھلی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ مچھلی کی حیات کے نظام کو جاری وساری رکھنے کے لئے مچھلی کی پانی میں رہنے والی فطرت کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح سورج کی فطرت میں روشنی کا دخل ہے۔ جب بھی سورج کا تصور آتا ہے ہمارے میں روشنی کا ایک ایسا گولا آجاتا ہے جس کے اندر اتنی روشنیاں ہیں کہ اس کی شعاعیں ایک جہاں کو منور کرتی ہیں۔ گویا سورج کی فطرت میں جگمگانا ہے۔ سورج سے روشنی کو جدا کر دیا جائے تو سورج کی اصل ذات ہی ختم ہو جائے گی۔ اسی

www.ksars.org

طرح بے شمار مثالیں ہیں ہم دنیا کی ہر شئے میں غور کر کے اس کے اندر کام کرنے والی فطرت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔ ہر شئے کے اندر فطرت کے نظام کو قائم اور جاری رکھنے والے قوانین اور اصول سنت کے قوانین کہلاتے ہیں جو ساری کائنات میں جاری وساری ہیں۔ فطرت شئے کے اندر روح بن کر کام کر رہی ہے۔ روح کے بغیر شئے کا وجود نہیں ہے۔

حسد ابلیس کی فطرت ہے۔ اس موقع پر ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ ابھی ہم نے فطرت کو اسمائے الٰہیہ کے خواص کہا تھا۔ اسمائے الٰہیہ اللہ کی صفت ہیں۔ اب ہم حسد کو ابلیس کی فطرت کہہ رہے ہیں۔ فطرت میں تغیر نہیں ہے اور جس شئے میں تغیر نہیں ہے وہ اللہ ہے۔ کائنات میں تغیر ہے اسی لئے تو وہ اللہ سے جدا ہے۔ اصل میں نہ اللہ کی ذات میں کوئی تغیر ہے نہ صفات میں۔ مگر ساری کائنات اللہ پاک کی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہے اور یہ مظاہرہ براہ راست انوار و تجلیات کا نہیں ہے بلکہ اسمائے الٰہیہ کی روشنیاں شئے کے قالب یعنی حدود میں رہ کر اپنا مظاہرہ کرتی ہیں جس کی وجہ سے ہر اچھائی اور برائی کا نتیجہ شئے کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے آدم یا ابلیس کی غلطی اور اس کی اچھائی یعنی تمام اعمال کا ذمہ دار آدم اور ابلیس کو ہی ٹھہرایا جائے گا نہ کہ خالق کو۔ حسد کو ہم نے ابلیس کی فطرت اس وجہ سے کہا کہ قرآن ہمیں اس بات کی اطلاع دے رہا ہے کہ ابلیس آدم کا کھلا دشمن ہے۔ اس نے حسد میں آکر آدم و حوا کو جنت سے نکلوا دیا۔ ابلیس کی اس فطرت کے ، تعلق اللہ پاک نے صرف قرآن میں ہی نہیں بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ تاکہ آدم اپنے دشمن کی فطرت سے واقف ہو کر اس سے دور رہنے کی فکر کرے۔ ہر شئے اللہ کے حکم سے اسمائے الٰہیہ کی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ ابلیس اللہ پاک کی نافرمانی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ جیسا کہ اپ جانتے ہیں کہ اس نے اللہ کے حکم سے رو گردانی کی ہے۔ قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے ابلیس ! تجھے کیا ہو گیا کہ جس کو (آدم کو) میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا اس کو تو نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا جب کہ میں نے تجھے اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اللہ پاک کے دونوں ہاتھ دراصل اللہ پاک کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان جمالی دوسری شان جلالی۔ شان جمالی کا مظہر حضور پاک ﷺ ہیں اور شانِ جلالی کا مظہر ابلیس لعین ہے۔ اللہ کی وحدانیت میں یہ دونوں شانیں یکساں طور پر موجود ہیں اور موجودگی سے نقصان یا فائدہ زیرِ بحث نہیں آتا بلکہ ان کے مظاہرے یا عمل سے نتیجہ نکلتا ہے۔ چناچہ ان کا مظاہرہ بھی براہ راست نہیں ہے بلکہ بالواسطہ آدم اور ابلیس کے ہے۔ یعنی شان جمالی کا جو بھی مظاہرہ کائنات کی حدود میں ہو رہا ہے وہ

www.ksars.org

مظاہرہ آدم و حوا کے ذریعے ہو رہا ہے اور شانِ جلالی کا جو بھی مظاہرہ کائنات کی حدود میں ہو رہا ہے وہ مظاہرہ ابلیس کے ذریعے ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی خطاؤں پر دونوں ہی مورد الزام گردانے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کیے ہیں۔اسمائے الٰہیہ اللہ کا نور ہے۔اللہ نے آدم کو نور کے علوم عطا کیے ہیں۔اس نور کا مظاہرہ آدم کے ذریعے ہو رہا ہے۔آدم روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔جسم مٹی کا پتلا ہے مگر روح اسمائے الٰہیہ کا وہ نور ہے جو روح کی حیثیت سے آدم کے پتلے کے اندر داخل کیا گیا ہے۔اللہ پاک نے فرشتوں اور ابلیس کو سجدے کا حکم جب دیا تو اسی نور کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا نا کہ متی کے پتلے کو۔مگر فرشتے چونکہ نوری مخلوق ہیں۔ان کی نظر نے مٹی کے قالب میں نور کو دیکھ لیا اور جان گئے کہ مٹی کا قالب جس کا نام آدم رکھا گیا ہے اللہ پاک کی زبردست صفات کا حامل ہے۔پس فرشتوں نے اس نور کی عظمت کو سجدہ کر لیا۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ابلیس نار کا بنا ہوا ہے۔پس ابلیس کی نظر نور میں نہ جا سکی۔اس کی اپنی ذات حجاب بن گئی۔اس نے اپنے اندر نار کے دہکتے شعلے دیکھے اور پھر آدم کا جسم خاکی دیکھا۔اسے خاک کے مقابلے میں نار زیادہ روشن دکھائی دی۔پس وہ اللہ کا نافرمان بن گیا۔اس نے اپنی کوتاہ نظری کی بناء پر آدم کی بجائے خود اپنے آپ کو قابلِ تعظیم سمجھ لیا اور آدم سے حسد کرنے لگا۔یہی وہ لمحہ تھا جس لمحے ابلیس نے اپنے اندر موجود جلالی صفات یا نار کا مظاہرہ کیا۔جب تک وہ نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوا تھا اس کے ذریعے سے جلال کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ابلیس کے ذریعے جب اس کی فطرت کا مظاہرہ ہوا تو اس مظاہرے کو حسد کا نام دیا گیا اور یہ بات کھلم کھلا اللہ کے سامنے فرشتوں کے سامنے 'آدم کے سامنے اور خود ابلیس کے سامنے آگئی کہ ابلیس آدم کا دشمن ہے اور کبھی بھی دوست نہیں بن سکتا۔پس اللہ پاک نے آدم و حوا کو اس بات کی تنبیہ کر دی کہ اپنے دشمن سے کبھی غافل نہ رہنا۔اس تنبیہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے آدم کو نوری علوم کے علاوہ نار کے علوم بھی عطا کر دیئے اور اس بات سے آگاہ کر دیا کہ نوری صفات تمہارے اندر تعمیری صلاحیتوں کو اجاگر کرے گی جب کہ ناری صفات تمہیں نقصان پہنچائے گی۔لہذا نقصان سے بچ کر رہنا۔جنت میں اس کے بعد بھی ادم و حوا اور ابلیس ساتھ ساتھ رہے۔پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آدم و حوا نے ابلیس کو دشمن نہیں بلکہ غلطی سے دوست سمجھ کر اس کی بات مان لی۔یہی وہ لمحہ ہے جہاں سے آدم اور حوا کے ذریعے ناری علوم و صلاحیت کا مظاہرہ ہوا۔مظاہرے کا مطلب یہ ہے کہ آدم و حوا کے اندر موجود نار کے علم کی شعاعیں متحرک ہو گئیں۔جیسے ہی نار کے علم کی روشنی متحرک ہوئی،ان سے

www.ksars.org

غلطی ہو گئی۔ کیونکہ نار نافرمانی کی صفت ہے اور نافرمانی کا ذہن شعور ہے۔ اس نافرمانی کے نتیجے میں آدم و حوا سے بھی جنت چھن گئی اور ابلیس بھی ان کے ساتھ نکالے گئے۔ اب صورت حال یوں ہے کہ شیطان کے اندر کی نار اور آدم کے اندر کا نور دونوں ہی آدمی کی آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ اسے نور اور نار کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب اس کے نفس کے ذریعے سے اس کا مظاہرہ ہو جاتا ہے جس کو وہ اپنے اعمال کہتا ہے۔ خیر اور شر کے حوادث میں اس نے اپنے نفس کی کشی کو چھوڑ دیا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ آدم و حوا کی ہر خطا نافرمانی کے ذہن کی حرکت ہے۔ جس کا نمائندہ ابلیس ہے۔ بلاشبہ ابلیس نافرمانی اور شر کا نمائندہ ہے مگر اس کی نمائندگی کو قبول کر کے انسان ہی اس کی تقلید کرتا ہے۔ اگر ابلیس حاسد ہے تو آدمی بھی اس کے حسد کو پسند کر کے اسی طرح عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیر و شر دونوں ہی اعمال وافعال اس کے اپنے نامہ اعمال میں ریکارڈ کئے جاتے ہیں اور ان کا نفع و نقصان بھی اس کی اپنی ذات کو پہنچتا ہے۔

ابلیس نے آدم کو دیکھ کر سب سے پہلے جس کیفیت کا اظہار کیا وہ حسد اور غرور ہے۔ حسد پیدا ہی غرور سے ہوتا ہے۔ پس جب بھی آدمی حسد کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر تکبر اور غرور پیدا ہو گیا ہے۔ تکبر، غرور کا مطلب یہ ہوا کہ مد مقابل کو اپنے نفس کے سامنے ہیچ اور ذلیل سمجھتا ہے۔ اسی رذیل حرکت سے شیطان راندہ گاہ ہوا اور یہی رزیل حرکت انسان کو بھی اللہ کی بارگاہ سے دور کرتی ہے۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فطرت میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ تکبر و غرور کا ہر مظاہرہ فطرت کے خلاف ہے۔ یعنی اللہ کی نافرمانی اور ناپسندیگی ہے۔ پس تکبر و غرور کی فطرت ہی ناپسندیدگی اور نافرمانی ہوئی۔ جب بھی اس کا عمل ہو گا جس کے ذریعے بھی ہو گا اس کا نتیجہ وہی حاصل ہو گا جو پہلی مرتبہ ازل میں اس کے مظاہرے پر ہوا یعنی وہ بندہ اللہ کے عتاب کا شکار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو قیامت تک کی مہلت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کی کارفرمائی کو ایک محدود آسمانوں میں شیطانوں کا داخلہ ممنوع ہے اور جو شیطان آسمان کی خبروں کی سن گن لینے کے لئے آسمان تک چڑھتا ہے اسے فرشتوں کی فوج مار گراتی ہے۔ زمین سے پہلے آسمان تک عالم ناسوت کی حد ہے۔ شیطان اور شیطانیت کا دائرہ عمل عالم ناسوت کی حد تک ہے اس کے اوپر شیطانوں کا گزر نہیں ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عالم ناسوت کی حد میں نار کا غلبہ ہے۔ نار نور کی ضد ہے۔ نوری علوم اسمائے الٰہیہ کے علوم کی ضد یعنی اسمائے الٰہیہ کے علوم سے لاعلمی و بے خبری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ناسوت یا مادی دنیا کی حدود میں آدمی

www.ksars.org

خود اپنی زات سے لاعلم ہے۔ جب تک وہ نوری علوم حاصل نہیں کر لیتا اس کے اوپر نار یعنی لاعلمی کا غلبہ رہتا ہے اور وہ دنیا کی زندگی میں شیطانی صفات کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ تکبر و حسد چونکہ شیطانی فطرت ہے۔ جب آدمی اس فطرت کو اپنا لیتا ہے تو اس کی اپنی فطرت جو کہ نوری ہے وہ ہمیشہ کے لئے پس پردہ چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئلہ آگ کو اپنے اندر اس طرح سمو لیتا ہے کہ خود اگ بن جاتا ہے پھر اسے کوئی کوئلہ نہیں کہتا بلکہ آگ کہتے ہیں۔ یعنی کوئلہ اپنی صفت کو چھوڑ کر دوسروں کی صفت کو اپنا لیتا ہے۔ پس اس کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی حال آدم کا ہے کہ اللہ نے اسے اپنا محبوب اور دوست بنایا ہے۔ جب وہ دوست کو چھوڑ کر دشمن کی صفت اور فطرت کو اپناتا ہے تو اس کی اپنی فطرت اس سے منہ موڑ لیتی ہے۔ موت کے بعد بھی وہ عالم ناسوت کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا اور اس کا حشر نشر بھی دشمن کے ساتھ ہی ہوتا ہے مگر جب آدمی دنیا میں رہتے ہوئے شیطانی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے تو نار کی بجائے اس کے اوپر نور کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ نور اللہ ہے۔ چناچہ آدم کے اعمال وافعال کا مظاہرہ عالم ناسوت کی محدودیت سے نکل کر عالم نور کی لامحدودیت میں ہونے لگتا ہے۔

لامحدودیت میں داخل ہو کر اسے ہمیشہ کے لیے شیطان سے پناہ مل جاتی ہے کیونکہ لامحدودیت میں شیطان کا گزر ہی نہیں ہے۔ لامحدودیت میں داخل ہو کر انسان کے شعور کو نور سے انرجی ملتی ہے۔ نور کا ہر ذرہ اور نور کی ہر شعاع اپنے اندر اسمائے الٰہیہ کا ادراک اور علم رکھتی ہے۔ پس آدم علم کے ذریعے اپنے دوست سے قریب ہو جاتا ہے۔

مادی زندگی علم و عمل کا نام ہے۔ مادی زندگی میں علم خیال کی وہ روشنی ہے جو دماغ سے ٹکرا کر خیال اور تصور کی صورت بنتی ہے۔ جب یہ تصور گہرا ہو جاتا ہے تو نظریا انکھ اسے اپنے مقابل دیکھ لیتی ہے۔ آنکھ کے دیکھنے کے اس عمل کسے ہمیں یہ بات سمجھ میں اتی ہے کہ ہر شئے علم کی صورت میں ہمارے اندر ہوتی ہے پھر یہ علم مظہر بن کر سامنے ا جاتا ہے اور پھر یہ شئے دوبارہ ہمارے اندر علم کی صورت میں واپس چلی جاتی ہے۔ ہمارے دماغ سے ہر لمحے نور کی شعاع ٹکراتی رہتی ہے۔ جب ہمارا شعور اسے قبول کر لیتا ہے تو علم کا نور شعور میں جذب ہو جاتیا ہے۔ شعور کی فطرت خلاء ہے۔ اس خلاء میں جب نار کی مقداریں ذخیرہ ہو جاتی ہیں تو یہ خلاء خود نار یا شیطان بن جاتا ہے اور اسی کی صفت اختیار کر لیتا ہے اور جب شعور نور کی مقداروں کو جذب کر لیتا ہے تو نور کا پیکر بن جاتا ہے۔ جس فطرت پر اور اصل صورت پر اللہ نے انسان

www.ksars.org

کو پیدا کیا ہے گویا اس زندگی میں ہر آدمی اپنی اس تصویر میں رنگ بھر رہا ہے جو اگلی دنیا کی صورت ہو گی۔ اگر تصویر میں اچھے رنگ بھرتا ہے تو صورت اللہ کی پسندیدہ ہو گی اور اگر غلط رنگ بھرتا ہے تو اللہ اسے دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔

روحانی راستوں پر قدم قدم پر مصائب کا سامنا اسی لئے ہوتا ہے کہ شیطان دشمن بن کر ہر دم پیچھے لگا ہوا ہے۔ نہ شیطان کو ہماری آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ رحمٰن کو۔ مگر ہر دو کا گزر ہمارے قلب وذہن سے ہے۔ ہر فاسد و سفلی خیال اور منفی سوچ شیطان کی انسپائریشن ہے اور ہر نیک، اچھا خیال اور مثبت سوچ رحمٰن کی جانب سے ہے۔ روحانی طالب علم کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت اپنے اندر نظر رکھے۔ ہر خیال پر عمل کرنے سے پہلے اس کی جانچ پڑتال کرے تاکہ اس کی منفیت اور مثبیت کا اسے علم ہو جائے۔ منفی خیال کو فوراً ہی دماغ سے رد کرنے کی کوشش کرے۔ خیال جب زیادہ دیر دماغ میں ٹھہرا رہ جاتا ہے تو پھر اس کا ہر قدم مظاہرہ اور عمل کی جانب ہوتا ہے اور عمل کے بعد کا ریکارڈ آدمی کے نامہ اعمال میں درج ہو جاتا ہے یعنی یہ روشنی شعور میں جذب ہو گئی اور آدمی کی صلاحیت بن گئی۔ جس کا وہ جب چاہے مظاہرہ کر سکتا ہے۔ منفی عمل کا بار بار مظاہرہ خالق سے قدم قدم دور لے جاتا ہے۔ جس سے روحانی راستوں پر آدمی پیچھے رہ جاتا ہے۔ روحانی راستے پر ایک غلطی آدمی کو سو برس اس راستے پر پیچھے کر دیتی ہے۔ بعض وقت حسد کی آگ اس طرح اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے کہ آدمی کو خود بھی پتہ نہیں چلتا۔ مگر روحانی اسکول میں داخلہ لینے کا مطلب ہی یہی ہے کہ طالب اپنے انر میں ہونے والی ہر حرکت سے واقفیت حاصل کرے۔ طالب کو ہر وقت اپنی ذات میں چوکنا رہنا چاہیئے تاکہ وہ اپنا آپ محاسبہ کرے۔ جس طرح ہر شخص اپنے گھر کی چوکیداری کرتا ہے کہ کسی اجنبی کو گھر میں گھسنے نہیں دیتا اسی طرح اس کا اپنا باطن بھی تو اس کا گھر ہے۔ اپنے قلب وذہن کی چوکیداری کا فرض بھی اس پر عائد ہوتا ہے۔ تاکہ دل ودماغ میں شیطانی خیالات داخل نہ ہونے پائیں۔ گھر میں جو بھی داخل ہوتا ہے اسے آپ دوست سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ پس اگر شیطان آپ کے گھر میں داخل ہو جائے تو آپ اسے بھی اپنا دوست سمجھ لیں۔ جب کہ وہ دشمن ہے۔ دشمن کبھی خیر خواہ نہیں بن سکتا۔ طالب کو چاہیئے کہ اپنے دل ودماغ کو ہر وقت نظر میں رکھے اور اپنا دروازہ صرف دوست پر ہی کھولے۔ اپنے گھر کے دروازے کی کنجی ہر شخص کے پاس ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

اللہ کی صفات

۱۔ روح کو اللہ تعالیٰ نے جب پیدا کیا تو اسے اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کیے۔ اپنی روح کا عرفان حاصل کرنے سے صفات الٰہیہ کا ادراک ہو جاتا ہے۔ جو ایک روحانی آدمی کے اندر ہونا چاہئے تاکہ وہ اس کے ذریعے اللہ تک رسائی کر سکے۔

۲۔ اپنے اندر موجود اللہ تعالیٰ کے نور کو پہچاننا اور اس کا مظاہرہ کرنا اللہ کی صفات کا ادراک ہے۔

۳۔ قرآن پاک میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں تمہارے اندر ہوں تم دیکھتے کیوں نہیں یعنی کوئی بھی انسان اپنے باطن میں جھانک کر اللہ پاک کے مقرر کردہ اصولوں کے تحت اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک کر سکتا ہے۔

۴۔ کائنات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی صفات کے انوار ہیں۔ انسان ایک آنکھ ہے جو اللہ پاک کی صفات کا ادراک کرتی ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کا استعمال کرنا اللہ پاک کی صفات کا ادراک ہے۔

۶۔ روحانی شعور کی بیداری سے صفات الٰہیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ روحانی شعور کی بیداری کے لئے لگن اور تجسس بنیادی امور ہیں۔

۷۔ روحانی حواس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک کیا جاتا ہے۔

۸۔ کسی شئے کے ظاہر میں تفکر کرنے سے اس کے باطن کا ادراک ہو جاتا ہے چونکہ ہر شئے کے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کی روشنیاں کام کر رہی ہیں۔ اس لئے شئے کے باطن کا ادراک اللہ تعالیٰ کی صفات کا ادراک ہے۔

www.ksars.org

۹۔ مرتبہ احسان کے مطابق اگر آدمی ہر فعل و عمل کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے منسوب کر دے تو اس کے ذہن کی مرکزیت اللہ کی ذات بن جاتی ہے۔ اس کا ذہن اور قلب اللہ کی تجلیات وانوار کو قبول کرنے لگتا ہے اور اس کے حواس ان انوار و تجلیات کا ادراک کر لیتے ہیں۔

۱۰۔ جب آدمی اپنی انا کی نفی کر کے کوئی کام سرانجام دیتا ہے تو اس کام میں اسے اللہ پاک کی صفات کا ادراک ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ مظاہرات کے پس پردہ کام کرنے والے عوامل کو پہچاننا صفات الٰہیہ کا ادراک ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ اللہ کی صفات کیا ہیں اور ان کا عرفان ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ مرتبہ احسان کیا ہے؟

سوال نمبر ۳۔ ذات کی نفی سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر ۴۔ پس پردہ عوامل کا سراغ کس طرح لگایا جا سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ''اللہ نور السمٰوات والارض'' اللہ نور ہے آسمانوں اور زمینوں کا۔ نور اللہ پاک کی صفات ہے۔ صفات کا تعلق ذات سے ہے جس طرح اللہ کی ذات پردے میں ہے اسی طرح صفات بھی پردے میں رہ کر کام کرتی ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں نور مخلوق کے حجاب میں کام کر رہا ہے۔ زمین پر بسنے والی مخلوق کو دکھائی دیتی ہے مگر نور دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اللہ کے نور نے تمام زمین و آسمانوں اور اس کے

www.ksars.org

اندر ہر شئے کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اللہ اول آخر ظاہر باطن ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ پاک یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہم نے آدم کو کھنکھناتی بجنی مٹی سے بنایا ہے جو چیز اندر سے خالی ہوتی ہے اس پر چوٹ لگانے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ بجنی مٹی سے مراد آدم ایک خلاء کا نام ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنی کتاب لوح و قلم میں اس کی بڑی اچھی مثال دی ہے۔ جو کائنات کی صورت اس طرح ہے کہ جیسے ایک صفحہ ہے اس صفحے پر سارے صفحے کو سیاہ کر دیا جائے مگر صرف جگہ جگہ دنیا کی چیزوں کے خاکے بنا کر ان خاکوں کو خالی چھوڑ دیا جائے تو ایک نظر دیکھنے میں یہ خاکے کبوتر، چاند، سورج، پہاڑ، آدم وغیرہ لگیں گے حالانکہ یہ تو صرف خلاء ہے۔ اس میں تو سیاہی ہے ہی نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے خلاء کی مختلف شکلوں کا نام مختلف رکھ دیا ہے۔

پس اسی طرح مخلوق کے سارے اجسام خلاء ہیں۔ ان خلاؤں میں اللہ کا نور جب بھر جاتا ہے تو خلاء کے اندر یہ نور روح کہلاتا ہے۔ نور انرجی ہے۔ یہ انرجی خلاء کے اندر جب کام کرتی ہے تو خلاء کے اندر اس نور سے تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی تبدیلی خلاء کی حرکت ہے۔ حرکت خلاء کے اندر ہی واقع ہوتی ہے۔ باہر تو ہر طرف نور ہی نور ہے۔ نور اللہ کی صفات ہے۔ اللہ کی ذات وصفات میں کوئی تغیر نہیں ہے۔ پس ہر حرکت ہر تغیر مخلوق کے اندر ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق کا جسم خلاء ہے۔ اس جسم کے اندر روح اللہ کا نور ہے۔ نور جب جسم کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو جس طرح ڈائی میں پلاسٹک ڈال کر ڈائی کی صورت میں پلاسٹک کو ڈھال دیا جاتا ہے اسی طرح روح کا نور جس کے قالب میں ڈھل کر جسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق کی روح اس کے جسم کی صورت پر ہے۔ ہر جسم کو روح کی روشنی قوت پہنچا رہی ہے جس کی وجہ سے جسم حرکت میں رہتے ہیں۔ مگر روح کے علوم صرف انسان کو عطا کئے گئے ہیں۔ جس طرح پلاسٹک کو مختلف ڈائی میں ڈال

www.ksars.org

کر مختلف صورتوں میں ڈھالا جاتا ہے، ڈھلنے کے بعد پلاسٹک کوئی نہیں کہتا بلکہ صورت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حالانکہ ہر صورت دراصل پلاسٹک ہی ہے۔ اسی طرح نور جب مختلف خاکوں میں بھر جاتا ہے تو ہر خاکہ ایک مخلوق اور شئے کہلاتی ہے اور اس خاکے کے اندر نور کا ہیولا روح کہلاتا ہے۔ نور کے ہر ہیولے کو اس خاکے کی صورت کے مطابق پہچان عطا ہوتی ہے۔ اس طرح آدم کا ہیولا آدم کی روح اور پہاڑ کا ہیولا پہاڑ کہلاتا ہے۔ حالانکہ آدم کا ہیولا اور پہاڑ کا ہیولا دونوں ہی نور ہیں۔ جسے اللہ نے اپنی ذات سے منسوب فرمایا ہے۔ مطلب یہ کہ کائنات کے اجسام کے پس پردہ دراصل ایک ہی روح کام کر رہی ہے جو در حقیقت اللہ پاک کے نور کی مختلف صورتیں ہیں۔ مختلف صورتیں ہونے کی وجہ سے نور کی مقداریں زیرِ بحث آجاتی ہیں۔ یہ متعین مقداریں ہی شئے کا جسم بناتی ہیں۔ روشنی کی مخصوص مقداروں کی وجہ سے شئے کی ظاہری شکل و صورت کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ اور عقل و شعور بھی ترتیب پاتا ہے۔ جب ہم دماغ کی بات کرتے ہیں تو ایک اندازے کے مطابق دماغ تقریباً بارہ کھرب خلیوں سے مل کر بنا ہے۔ ہر خلیہ ایک خلاء ہے۔ اس خلاء میں نور یا روشنی آکر اپنی قوت اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ چونکہ یہ مظاہرہ خلاء کی حدود کے اندر ہے یہی وجہ ہے کہ خلاء اس مظاہرے کو اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے اور یہی فرد کا شعور کہلاتا ہے۔ گویا شعور اور عقل اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ شعوری دماغ کے اندر جو خلیات کام کر رہے ہیں ان کے اندر روح کی روشنی نہ بھر جائے۔ روشنی سے خالی دماغ کو ہم عقل و شعور نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ موت کے وقت آدمی کا دماغ ساکت ہو جاتا ہے یعنی روشنی نکل جاتی ہے۔ اس وقت آدمی ہر قسم کے حواس سے بھی خالی ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب دماغ کے خلیوں میں روشنی جذب ہو جاتی ہے تو یہ روشنی عقل، شعور اور حواس بن کر جسم کے ساتھ کام کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دماغ میں خلیات کی مخصوص تعداد اور ان کے اندر جذب شدہ روشنی کی متعین مقداریں دنیا کی مخلوق کا مختلف ذہن اور شعور بناتی ہے۔ تمام مخلوق کے دماغ کے اندر روشنی کی متعین مقداریں کام کر رہی ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر نوع نور اور روشنی کی متعین مقداروں کے گروپ کا نام ہے۔ یہی متعین مقداریں شئے کا ظاہری جسم بھی بناتی ہیں۔ ظاہری جسم اور ظاہری حواس اللہ پاک کی بڑی نعمت ہیں اور اس میں بڑی حکمت ہے۔ اگر آدم کو دنیا میں پیدا نہ کیا گیا ہوتا تو آدم اللہ پاک کو اس کی صفات کے ذریعے سے نہ پہچانتا۔ غور کیجئے۔ اللہ پاک نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ ازل میں تمام روحوں کو پیدا کر کے اللہ پاک نے

www.ksars.org

ان پر اپنی تجلی ظاہر کی۔ تمام روحوں کو آواز دی کہ میں تمہارا رب ہوں۔ تمام روحیں اللہ پاک کو دیکھ کر پہچان گئیں اور اقرار کیا کہ واقعی آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ روحوں کا یہ اقرار اور مشاہدہ تجلی ذات کی حدود میں ہے۔ یہاں روحوں نے اللہ کو دیکھا، اللہ کو بحیثیت رب کے پہچان لیا مگر اس مقام پر روحیں خود اپنی ذات سے واقف نہیں ہیں کہ اللہ نے انہیں کیوں پیدا کیا ہے۔ کیا صلاحیتیں بخشی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ادراک اور علوم روحوں کو دنیا میں آکر عطا ہوتا ہے۔ کائنات کی تمام مخلوق کے اندر اپنی ذات کا ادراک عالم ناسوت میں آکر ہوتا ہے۔ مادی وجود میں آنے کے بعد ہر شئے خود اپنے آپ کو فرد کی حیثیت سے پہچان لیتی ہے اور ہر فرد اپنی نوع کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہے۔ جیسے بکری تمام بکریوں کو اپنے جیسا سمجھتی ہے اور ایک دوسرے سے مانوس ہوتی ہے۔ آدم کو چونکہ اللہ پاک نے اسمائے الٰہیہ کے علوم بخشے ہیں۔ آدم کی روح اپنے اندر موجود اسمائے الٰہیہ کے انوار اور اس کی صفات کو جانتی ہے مگر دنیا میں انے سے پہلے آدم کو اپنی انفرادی شناخت نہ تھی بلکہ وہ کائنات کی دوسری روحوں کی طرح خود کو ایک روح کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اس دنیا میں آکر انفرادی طور پر انسان کا ارادہ کام کرنے لگا۔ جب کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے انسان کا ادراک نوع کی صورت میں کام کر رہا تھا۔ جیسے تمام روحوں نے اللہ کو دیکھا۔ تمام روحوں نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ جنت میں آدم وحوا کی غلطی کا تذکرہ آیا ہے کہ وہ جنت میں غلطی کرنے کی پاداش میں دنیا میں اتارے گئے۔ جنت میں آدم وحوا کی غلطی ایک فرد کی غلطی نہیں ہے بلکہ یہ خطا بھی پوری بنی نوع انسانی کی ہے۔ چونکہ جنت کا وہ شعور نوعی شعور تھا یہی وجہ ہے کہ ہر فرد اگرچہ اسی غلطی کی پاداش میں جنت سے یہاں آتا ہے مگر نوعی شعور کا انفرادی شعور میں تبدیل ہونے کی وجہ سے دنیا میں انے کے بعد اس غلطی کا احساس بھول جاتا ہے۔ نوعی شعور میں ایک فرد واحد کی غلطی سب کی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ انفرادی شعور میں ایک فرد کی غلطی کا ذمہ دار وہی فرد واحد ہوتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے فرد کے وہ حواس جو نوعی دائرے میں کام کر رہے تھے۔ اب تمام نوع کا ادراک ایک فرد کے اندر سمٹ آتا ہے۔ اس طرح ایک فرد تمام نوع کے شعور سے واقف ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے سے وہ کائنات کی تمام مخلوق کو شعوری طور پر جان اور پہچان لیتا ہے اور اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ ہر نوع کے ہر فرد کے اندر بھی روشنیوں کی مقداروں میں کمی بیشی ہے جس کی وجہ سے اس کی شکل وصورت میں اور اس کے ذہن میں تبدیلی آجاتی ہے۔ یہی تبدیلی اس کی حرکات وسکنات بھی ایک

www.ksars.org

دوسرے سے مختلف کر دیتی ہے۔ ہر شخص اس تبدیلی کو خود اپنے دائرے میں محسوس کرتا ہے۔ اس طرح دنیا میں آکر جب آدمی خود اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے تو پھر وہ اپنے بنانے والے کی جانب بھی متوجہ ہوتا ہے۔ جب خالق کی طرف ذہن جاتا ہے تو اپنی طرح حرکت کرتی ہوئی تمام مخلوق کا رشتہ بھی خالق سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کائنات کی ہر شئے کی گہرائی میں نظر اور ذہن پہنچتا ہے۔ رفتہ رفتہ خود اپنے ہی شعور کے دائرے میں آدمی کائنات کی تمام اشیاء کا ادراک کرنے لگتا ہے اور ان کے اندر کام کرنے والے جذبات کو سمجھنے لگتا ہے۔ جیسے وہ یہ جان لیتا ہے کہ ایک بلی کے اندر بھی وہی محبت کام کر رہی ہے جو میرے اندر ہے۔ جب میں بلی کو محبت کے ساتھ سینے سے چمٹا کے پیار کرتا ہوں تو بلی بھی محبت کے اظہار میں غر غر کر کے پیار سے آنکھیں موند کر سینے سے چپک جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف شئے کے اندر کام کرنے والی مختلف صلاحیتوں کو آدمی اپنے شعور اور حواس کے دائرے میں پہچانتا ہے۔ تب اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ جو صلاحیت کسی دوسرے فرد کائنات کے اندر کام کر رہی ہے وہی صلاحیت خود اس کے اپنے اندر بھی کام کر رہی ہے۔ محبت اللہ کی صفت ہے۔ اللہ اپنی مخلوق سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اللہ کی صفت کی روشنیاں جب مخلوق میں جذب ہو جاتی ہیں تو مخلوق کی صلاحیت کہلاتی ہے۔ مخلوق ان صلاحیتوں کو اپنی سکت کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ ایک بلی اپنے مالک کو دیکھ کر آنکھیں موند کر غر غر کی آواز نکالتی ہے۔ آدمی بلی کی محبت کا اظہار اس طرح نہیں کرتا۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ بلی کے پیار کو سمجھ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات موجود ہیں۔ وہ ساری صفات دوسری مخلوق کے مقابلے میں انتہائی درجے پر کام کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک برتن ہے کہ جس میں ایک گیلن پانی سماتا ہے۔ دوسرا برتن ہے کہ جس میں دس گیلن پانی سماتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چھوٹا برتن بڑے برتن میں سما جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر جتنے بھی اسمائے الٰہیہ کام کر رہے ہیں ان اسماء کے انوار کی مقداریں کائنات کی تمام مخلوق کے اندر کام کرنے والی مقداروں سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے انسان ہر شئے کے جذبات واحساسات کو پہچان لیتا ہے یعنی انسان کے اندر کام کرنے والا ہر اسم دوسری مخلوق کے اندر کام کرنے والے اسماء کے مقابلے میں اسم اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔ اسم اعظم کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اندر اسمائے الٰہیہ کا شعور متحرک ہو جائے اور وہ اسمائے الٰہیہ کو بحیثیت اللہ پاک کی صفات کے پہچان جائے اور ان صفات کی فطرت کو اپنے اندر کام کرتا ہوا دیکھ لے اور اپنے ارادے کو اسمائے الٰہیہ کی فطرت کے

www.ksars.org

مطابق ڈھال لے۔ دوسری مخلوقات کا شعور اسمائے الٰہیہ کی فطرت کی اس بلندی تک نہیں پہنچتا جس کی وجہ سے وہ ان علوم سے آشنا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کے سوا کوئی بھی مخلوق صفت عشق میں فطرت کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتی۔ جس بلندی پر اللہ اپنے بندے سے عشق کرتا ہے۔ جب بندہ اللہ کے عشق کی اس عظمت کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اپنے اپ کو محبوبیت کے مقام پر دیکھ لیتا ہے۔ جیسا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا لقب محبوب الٰہی قرار پایا۔ بندے کے لئے اللہ کے عشق کی انتہائی بلندی محبوبیت کا مقام ہے۔ جس میں اللہ اور بندے کے درمیان راز و نیاز ہوتے ہیں مگر یہ مقام بھی بوسیلہ جلیلہ حضور پاک ﷺ کے بندے کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بندہ جب اپنے اندر صفات الٰہیہ کا ادراک کرتا ہے تو یہ پیغمبران علیہ السلام کے ادراک کا ادراک ہے۔ تمام پیغمبران علیہ السلام کا تعلق براہ راست اللہ پاک کی ذات اور صفات کے ساتھ ہے۔ وہ اپنے بشری شعور کے دائرے میں اللہ پاک کی ذات وصفات کا جس طرح ادراک کرتے ہیں۔ یہ ادراک کائنات کے ذرے ذرے میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ادراک کی سب سے پہلی تقسیم خود ذات ہے۔ یعنی بشر یا بنی نوع انسانی ہے۔ اس طرح ادارک کی تقسیم اللہ پاک سے براہ راست پیغمبران علیہ السلام پیغمبروں سے بنی نوع انسانی اور پھر بنی نوع انسانی کے ذریعے ادراک دوسری مخلوق میں تقسیم ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے انسان اپنی ذات میں کل کائنات کا ادراک رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام مخلوق کی فطرت سے جلد ہی واقف ہو جاتا ہے اور اسے ان کے سمجھنے میں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ آدمی ہر مخلوق کے ساتھ بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ چرند پرند، درند، پیڑ پودے ہر شئے کے ساتھ اس کی ذہنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اجرام فلکی اور آفاقی مخلوق جنات، فرشتے اور روحوں سے بھی اس کا ذہنی رابطہ ہو جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ انسان کے دماغ کے کمپیوٹر میں تمام کائنات کی فریکوئنسی کام کر رہی ہے۔ ہر فریکوئنسی کسی ایک اسمائے الٰہیہ کا ادراک اور نور کی رو ہے۔ اس رو سے مخلوق کو اسمائے الٰہیہ کی روشنی تقسیم ہوتی ہے۔ جب بندے کا رابطہ اپنے ذہن کے اندر کام کرنے والی اس فریکوئنسی سے مل جاتا ہے تو وہ اس فریکوئنسی سے فیڈ ہونے والی مخلوق کے شعور اور ان کے ادراک کو پہچان لیتا ہے۔ اسی قانون کے تحت کائناتی تصرفات بھی عمل میں آتے ہین جس کا اظہار معجزہ اور کرامت ہے۔

www.ksars.org

انسان کے اندر اسمائے الٰہیہ کی فریکوئنسی کا انقطاع رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے بندے سے یہ چاہتا ہے کہ وہ ان سے وقوف حاصل کرے اور ان انوار و تجلیات سے اپنے ارادے اور ضرورت کے مطابق انرجی حاصل کرے۔اس مقصد کے لئے جو اصول پیغمبروں نے اختیار کیا وہی اصول قانون قدرت اور سنت الٰہیہ کا درجہ رکھتا ہے۔تمام پیغمبران علیہ السلام کا یقین اور ایمان اس بات پر رہا ہے کہ ہر شئے کا فاعل حقیقی اللہ ہے۔ان کے پاس جو کچھ بھی پہنچ رہا ہے وہ منجانب اللہ ہے۔ان کے ذہن ودل میں اللہ کے تصور کو اولیت حاصل تھی۔جس کی وجہ سے ان کے دماغ میں کسی شئے کا خیال آتے ہی ان کا رابطہ اسمائے الٰہیہ کے نور سے جاملتا اور خیال کے عکس کو ان کے قلب و جسم کی نگاہ کے نور میں دیکھ لیتی اور اس شئے کی اصلیت سے واقف ہو جاتی۔پھر اگر مظاہرے میں خلاف فطرت کوئی بات دکھائی دیتی تو امر ربی کی حقیقت سے واقف ہونے کی بناء پر وہ اس خرابی کو دور کرنے کی ہمت اور صلاحیت بھی رکھتے تھے۔اسی اصول کو اپنا کر پیغمبروں نے اللہ پاک کی ذات وصفات کا عرفان اور ادراک حاصل کیا۔پیغمبروں کی زندگی تمام بنی نوع انسانی کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اللہ پاک سورہ عصر میں فرماتے ہیں کہ " والعصر ان الانسان لفی خسر "یعنی قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں ہے۔عصر سے مراد وہ زمان حقیقی ہے جو اللہ کا امر کن ہے۔جس کی مدت ازل سے ابد تک تصور کی جاتی ہے۔ اللہ پاک اس زمانے کی قسم کھا کر ہمیں اطلاع دیتے ہیں تاکہ انسان پر یہ واضح ہو جائے کہ اللہ کی نظر ازل سے ابد تک دیکھ رہی ہے اور اس کے اندر واقع ہونے والی ہر حرکت سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔انسان نقصان میں ہے کیونکہ اس کی زندگی کی حرکت سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔انسان نقصان میں ہے کیونکہ اس کی زندگی کی حرکت دنیاوی اعتبار سے بہت ہی تھوڑی ہے۔دنیا کی زندگی نہایت ہی مختصر ہے۔اس زمان حقیقی کا ایک کم ترین لمحہ ہے۔اس کم ترین لمحے میں حقیقت سے واقف ہو جانا آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔مگر ایک ہی صورت ہے جو آدمی کی حقیقت کا ادراک کر رہی ہے۔وہ یہ ہے جو اگلی آیات میں بیان کرتے ہیں کہ اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں صبر سے کام لے۔اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کی مرکزیت قائم ہو جانا۔اللہ سے رابطہ قائم ہونے سے نور کی رو دماغ میں بہنے لگتی ہے اور نور ادراک بن کر حواس کے دائروں میں گردش کرنے لگتا ہے اور شعور کسی نہ کسی طور پر نور کا ادراک کر لیتا ہے۔نور اللہ کے خزانے ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کو عنایت کیے ہیں۔کسی کریم کی کرم نوازی آدمی کو اس کے قریب

www.ksars.org

کر دیتی ہے۔اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں کا حصول بھی بندے کو اپنے خالق سے قریب کر دیتا ہے اور یہی اللہ بھی بندے سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کو اس کی صفات کے ساتھ پہچان کر ان عظمتوں اور بزرگی کی تعریف کرے اور اس کی ربوبیت کا اعتراف کرے۔پس ایک روحانی بندے کے اندر صفات الٰہیہ کا ادراک و شعور ہونا چاہئے جس کے ذریعے وہ سلوک کے مدارج طے کر سکے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

ذوق وشوق

۱۔ علم کے بغیر عمل میں نقص ہوگا اس لئے علم حاصل کرنے کرنے کا شوق اور لگن نہایت ہی ضروری ہے۔

۲۔ علم حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ علم میں انسان محو ہو جائے۔ محویت شوق کامیابی کی علامت ہے۔

۳۔ علم کی لگن روح کی پیاس کو بجھاتی ہے۔ روح کی پیاس بجھنے سے دماغی سکون ملتا ہے۔ علم حاصل کرنے سے آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلیتا ہے۔

۴۔ حصول علم کی لگن انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔

۵۔ علم نور ہے۔ لاعلمی اندھیرا ہے۔ جیسا کہ اللہ پاک نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ میں آسمانوں اور زمین کا نور ہوں۔ حدیث شریف میں حضور پاک ﷺ نے علم کی اہمیت اس بات سے واضح کی ہے کہ ''علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔'' علم سے انسان کا قلب روشن ہو جاتا ہے۔ خصوصاً علم حضوری سے انسان کے قلب میں فراست پیدا ہو جاتی ہے۔

۶۔ اللہ علیم ہے۔ سب علم اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ روحانی آدمی دنیا کی ہر شئے کو اللہ کے علم کا مظاہرہ سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنے کلام میں تذکرہ فرمایا ہے کہ میری نشانیوں پر غور کرو۔ روحانی آدمی حصول علم لگن رکھتے ہوئے اپنا وقت غور وفکر میں گزارتا ہے۔ حدیث شریف ہے۔

Knowledge is the lost property of Momen. He may take it where he find it

۷۔ علم روحانی تقاضہ ہے۔ حصول علم کا شوق وہ کشش ہے جس سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

www.ksars.org

۸۔ حصول علم کی لگن انسان کو اللہ تعالیٰ کے تفکر سے قریب کرتی ہے۔ کائنات کی تخلیق میں خالق کا مخلوق کے درمیان اپنی صفات کے ساتھ پہچانے جانے کا تفکر کام کر رہا ہے۔ علم کے راستے پر آدمی کا ہر قدم اللہ کے تفکر کی روشنی میں خالق کی پہچان کراتا ہے۔

۹۔ شعور ایک خلاء ہے اور اس خلاء کو علم کی روشنی سے بھرا جاتا ہے۔ کائنات مختلف روشنیوں کا مجموعہ ہے۔ حصول علم کی لگن شعور کی خلاؤں کو روشنیوں سے پر کر دیتی ہے۔

۱۰۔ Without knowledge man is always in dark. Knowledge awakens the darkness.

۱۱۔ حصول علم کی لگن ایک ایسا عمل ہے جو آدمی کے ذہن میں تجسس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تجسس کی تحریک سے آدمی کے اندر علم کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ روحانی اور مادی علوم دونوں آدمی کے شعور پر وارد ہوتے ہیں۔

۱۲۔ مادی علم انسان کی شخصیت کو تراشتا ہے اور روحانی علم انسان کے شعور کی اسپیڈ کو بڑھاتا ہے تاکہ وہ غیب سے ملنے والی اطلاعات کو صحیح معنی پہنا سکے۔

۱۳۔ علم روح کی غذا ہے۔ غذا انرجی ہے۔ بغیر انرجی کے حرکت ممکن نہیں ہے۔ روح کی حرکت کو جاری و ساری رکھنے کے لیے حصول علم کی لگن ضروری ہے۔

۱۴۔ حصول علم کی لگن سے روحانی آدمی میں صفت علیم کا عکس جھلکنے لگتا ہے۔

۱۵۔ انسان کا مقصد تخلیق اللہ کو پہچاننا ہے اور بقول شیخ سعدیؒ ''بے علم خدا ناتواں راشناخت۔'' یعنی بغیر علم کے آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا اور بغیر لگن کے علم حاصل نہیں ہوتا۔

www.ksars.org

۱۶۔ Then more Knowledge is like a thirst that never quench you drink the thirstier you get.

۱۷۔ روح کا دوسرا نام ذوق ہے۔ ذوق ایک ایسی صفت ہے جو ہر وقت تلاش میں سر گرداں رہتی ہے۔

۱۸۔ علم حاصل کرنے سے ہم آسمانی Inspiration کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔

۱۹۔ حصول علم کی لگن آدمی کے اندر تعمیری صلاحیتیں بیدار کرتی ہیں۔

۲۰۔ علم آدم کا ورثہ ہے۔ حصول علم کی لگن اس ورثہ کو حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۲۱۔ اللہ اور بندے کا درمیانی ربط علم ہے۔ حصول علم کی لگن اس ربط کو مستحکم کرتی ہے۔

۲۲۔ روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے حصول علم کی لگن آدمی کو حقیقت سے روشناس کراتی ہے۔ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں۔ ''اللہ جانتا ہے اور تم کچھ بھی نہیں جانتے۔'' اس ایت میں انسان کے مادی اور شعوری علوم کی نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حقیقی علوم غیب کے علوم ہیں جو روح کو حاصل ہیں۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ علم حصولی اور علم حضوری میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۲۔ علم حاصل کرنا کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۳۔ حصول علم سے اللہ کا قرب کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

سوال ۴۔ تقاضے کہاں پیدا ہوتے ہیں؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۵۔ لاعلمی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟

انسان تقاضوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تقاضے روح کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کے امر کی تجلیات روح کے ذریعے سے کائنات میں اپنا عمل کرتی ہیں۔ روح کا دماغ یا شعور اللہ کے امر کی روشنی کو جذب کرتا ہے اور اس روشنی کے ذریعے اللہ کا امر روح کے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔ امر کا ارادہ جو کچھ کائنات میں کرنا چاہتا ہے۔ روح کے اندر اسی کام کا تقاضہ پیدا ہو جاتا ہے اور روح فوراً ہی اس تقاضے پر عمل شروع کر دیتی ہے۔ روح کا تقاضہ جب شعور میں منتقل ہوتا ہے تو شعوری دماغ کے اندر اس کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور پھر جسم اس کام کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسان کی روح اور جسم دونوں اللہ کے امر پر حرکت کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ روح اس بات سے واقف ہے کہ اس کے اندر پیدا ہونے والا ہر تقاضہ اللہ کی جانب سے ہے۔ مگر جسم یا مادی شعور کے لئے یہ بات سیکھنی پڑتی ہے اور پھر اس پر یقین کرنا پڑتا ہے اور پھر وہ عمل کرتا ہے۔ شعور کے لئے ہر تقاضا نیا ہے۔ کیونکہ وہ علم سے خالی ہے۔ جب اس خلاء میں روشنی آتی ہے تو وہ اسے پہچاننے میں لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعور سے بار بار غلطی ہو جاتی ہے۔ یہ غلطی لاعلمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب شعور علم کی روشنی کو جذب کر لیتا ہے تو پھر اس سے غلطی نہیں ہوتی۔ اگر پھر بھی غلطی ہوتی ہے تو اس میں شعور کا ارادہ شامل ہوتا ہے۔ روح غلطی کی مرتکب اس لئے نہیں ہوتی کہ روح کو اللہ نے علوم عطا کئے ہیں مگر شعور کو خلاء کہا ہے اور یہ علم سے خالی ہونے کی وجہ سے کمزور ہے۔ پس شعور کی کمزوری دور کرنے کے لئے اور اسے غلطیوں سے پاک کرنے کے لئے اسے بھی وہی توانائی کی ضرورت ہے ہے جسے حاصل کر کے روح توانا اور غلطیوں سے پاک ہے اور یہ توانائی روح کا علم ہے۔ جو قدرت نے اس کے اندر رکھا ہے۔ گویا علم ہی وہ صفت ہے جس کے ذریعے شعور اپنی روح سے قریب ہو سکتا ہے۔ ہمارے اندر حرکت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ تقاضہ نہ ابھرے اور لگن پیدا نہ ہو۔ جب تک بندے کے اندر حصول علم کی لگن نہ ہو گی وہ علم سیکھنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ اس طرح اگر بھوک کا تقاضہ پیدا نہ ہو تو کھانا کھانے پر آمادہ نہ ہو گا اور حرکت رک جائے گی۔ حرکت ہی کائنات ہے جو تسلسل کے ساتھ ازل سے ابد تک جاری ہے۔ ہمارے اندر ایک صلاحیت کام کر رہی ہے جو تجسس کہلاتی ہے۔ تجسس ہی آدمی کو علم سیکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تجسس اسم محیط کی روشنی ہے۔ جب یہ روشنی شعور کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے تو روح کی جو فکر بھی شعور میں منتقل ہوتی ہے شعور کے اندر اس کے علوم سیکھنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے۔

www.ksars.org

ہر آدمی یا عورت جو دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اس کی روح کے ذمے یہ کام اللہ کی جانب سے ہے کہ وہ شعور کے اندر اپنے علم کی روشنیاں منتقل کرے۔ ہر کام کے اندر اللہ کی کوئی نہ کوئی حکمت ضرور موجود ہے۔ ایک روحانی شعور ہر کام کے اندر اس کی حکمتوں کو تلاش کرتا ہے تاکہ اللہ کی قدرتوں کو بہتر سے بہتر طور جان سکے۔ آدم کی روح کو پیدا کر کے اسے کائناتی علم اور اللہ پاک کی ذات وصفات کے علوم عطا کرنے کا مقصد ہی یہ دکھائی دیتا ہے کہ روح کو پہلے تیار کر دیا اور اسے وہ تمام علوم و صلاحیتیں عطا کر دیں جن کے ذریعے کام لینا مقصود تھا۔ اس کے بعد اسے کام کرنے کا حکم اور اجازت عطا ہوئی۔ اللہ کے حکم پر جب روح کام کرتی ہے تو وہی کام کرتی ہے جس کا اسے حکم ملا ہے اور جس کام کی اس کے اندر صلاحیت موجود ہے۔ خود اپنی صلاحیتوں کو جاننے کے لئے اور اپنی کارکردگی کو پہچاننے کے لئے اس دنیا میں سب سے پہلے شعور پیدا ہوتا ہے اور شعوری حواس پیدا ہوتے ہیں تاکہ آدم کی روح یا آدم کی ذات اپنی صلاحیتوں کو پہچان لے ان سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کام کے نقائص سے خالق کے کام کی پاکی کو پہچان لے اور اس کی صحیح عظمت و تعریف اس کے دل میں پیدا ہو۔ اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی روح کا وجود تھا اور روح عالم ارواح میں موجود تھی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں آنے سے پہلے روح کو کچھ علم و حواس ہی نہ تھے۔ کیونکہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ روح جنت میں رہتی تھی۔ وہاں کھاتی پیتی بھی تھی اور سیر و تفریح بھی کرتی تھی۔ جنت میں آدم و حوا اللہ کے امر اور ارادے سے حرکت کرتے تھے۔ آدم و حوا کے ذہن میں جب تک اپنا ارادہ غالب نہ آیا وہ خوش رہے۔ اس وجہ سے کہ اللہ کے ارادے میں آدم و حوا کے لئے خوشی کی زندگی ہے۔ اللہ یہی چاہتا ہے کہ بندہ خوش باش رہے اور اللہ کا فرمانبردار اور شکر گزار رہے۔ مگر آدم و حوا اگر ابد تک اللہ کے ارادے پر حرکت کرتے رہتے تو روح کے شعور و ارادے کی نشوونما نہ ہوتی۔ آدم بھی فرشتے کی طرح غیر مکلف ہو جاتا کہ جو کام کرتا اللہ کے ارادے پر کرتا۔ اس کے ذہن کی ہر حرکت اللہ کے امر کی حرکت ہوتی۔ ایسی صورت میں آدم و حوا کا ہر کام اللہ کے امر کا ہوتا ہے۔ آدم و حوا کی انفرادی پہچان نہ ہوتی بلکہ آدم و حوا کی پہچان امر ربی کی حیثیت سے ہوتی۔ اللہ پاک نے آدم کو پیدا ہی اس غرض سے کیا تھا کہ اس کی پہچان بشر یا انسان کی حیثیت سے ہو۔ آدم و حوا کے اندر ان کا اپنا ذہن اور ارادہ حرکت میں آ گیا کیونکہ اللہ کے امر اور ارادے کی روشنی آدم و حوا کے ذریعے کام کر رہی تھی۔ جنت میں آدم و حوا کا ذہن اللہ کے ارادے کی روشنی کو پوری طرح جذب کر رہا تھا اور ان کے ذہن کی اسپیڈ اللہ کے امر کی

www.ksars.org

اسپیڈ تھی جس کی وجہ سے آدم وحوا کے اندر غلطی اور کمزوری کا خیال ہی نہ تھا۔ جب اللہ نے چاہا کہ آدم وحوا اپنی ذات کو ذات امر سے الگ ہو کر پہچانیں تو اب اللہ کی یہ فکر ان کے دماغ میں منتقل ہو گئی کہ وہ ایک بشر ہیں اور ان کا بشری ارادہ وذہن حرکت میں آگیا جس کی وجہ سے شعور پیدا ہو گیا۔ اب انہیں خود اپنی ذات اور اللہ کے امر کی ذات یعنی نفس اور روح کے کام کا فرق معلوم ہو گیا کہ اللہ کا ارادہ انسان کے لئے کیا ہے۔ اللہ بشر سے کتنی محبت رکھتا ہے اسے کسی طرح بھی رنج و الم میں مبتلا دیکھنا نہیں چاہتا۔ روح جب تک جنت میں تھی اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ اللہ پاک اس سے اس قدر محبت رکھتے ہیں کہ اسے ہر وقت اپنی حفاظت میں رکھتے ہیں۔ جیسے ماں اپنے ننھے سے بچے کو ہر وقت اپنی نگاہ میں رکھتی ہے جیسے مچھلی جب تک پانی کے اندر رہتی ہے اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ پانی ہی اس کی زندگی ہے۔ جیسے ہی وہ پانی سے باہر آتی ہے تب اسے اپنی زندگی کے لئے پانی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے اور پھر واپس پانی میں جانے کے لئے تڑپ اٹھتی ہے۔ دنیاوی شعور بھی اللہ نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ انسان کو اپنی ذات کی کمتری اور کمزوری کا پتہ لگ جائے۔ وہ اپنے ارادے کی کمزوری سے اللہ کے ارادے کی قوت کو پہچان لے اور پہچاننے کے بعد اپنے ارادے کو اللہ کے امر کی قوتوں سے قوی بنائے تاکہ جو کام اللہ اس سے لینا چاہتے ہیں وہ انجام دے سکے۔

انسان کی شعوری زندگی اس کے اپنے ارادے کے ساتھ عملی زندگی ہے۔ یہ زندگی مرنے کے بعد بھی اسی طرح جاری رہتی ہے۔ روح بحیثیت انسان کے اپنے ارادے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اس سفر کے دو راستے ہیں۔ ایک علم دوسرا جہالت۔ انسان ان دو راستوں سے زندگی کا سفر طے کر رہا ہے۔ علم روشنی ہے جہالت اندھیرا ہے۔ روح اجالے سے آتی ہے یعنی اللہ کے پاس سے۔ اُس کی جنت سے۔ وہ روشنی سے خوب واقف ہے مگر جسم یا دنیاوی شعور اندھیرے میں پیدا ہوا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ہم نے انسان کو تین تاریکیوں میں رکھا۔ نفس کے لئے یہ تین تاریکیاں یہ ہیں کہ ایک تو مادی نفس پیدا ہونے سے پہلے اللہ کو نہیں جانتا۔ دوسرے اپنی روح کو نہیں جانتا۔ تیسرے اپنے آپ کو بھی نہیں جانتا۔ مادی شعور کے لئے یہ تین تاریکیاں تین لاشعور ہیں۔ عالم برزخ جو کہ ماں کے پیٹ کا عالم ہے اس کے اندر روح اپنے نفس کے ان تین اندھیروں میں اپنی روشنیاں منتقل کرتی ہے۔ یہی وہ ریکارڈ ہے جو آدمی کا لاشعور بنتا ہے اور دنیا میں آنے کے بعد آدمی اس ریکارڈ کے اندر کی روشنیوں کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ روح کی وہ

www.ksars.org

روشنیاں جو عالم برزخ میں یعنی دنیا میں آنے سے پہلے نفس کے اندر منتقل ہوتی ہیں اور آدمی کا لاشعور بنتی ہیں۔مادی نفس ان کی توانائی اور علوم سے واقف نہیں ہوتا۔روح کا شعور نفس کے چاروں طرف اس طرح محیط ہو جاتا ہے کہ نفس کے اندر ان کے علوم جاننے کی جستجو اور تقاضہ پیدا ہوتا ہے۔یہی لگن آدمی کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور دل میں شوق پیدا کرتی ہے۔نفس کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ علم کی اہمیت کو جانے۔زندگی کی تمام سہولتیں، تحفظ وسکون علم کے ساتھ ہے۔علم انسان کے ذہن ودل سے خوف اور بے یقینی کو دور کرتا ہے۔دنیا میں بھی جو لوگ زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ کم علم سے زیادہ خوش حال اور عزت کی زندگی گزارتے ہیں۔اللہ نے انسان کو جو رتبہ عطا کیا ہے اس کی فضیلت علم کے ذریعے ہی دیکھی جاسکتی ہے۔انسان کی وہ زندگی جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے وہ دراصل انسان کے لئے اللہ کا تصور ہے۔اللہ نے اپنے تصور میں انسان کے لئے زندگی کا ایک کامل نقشہ اور خاکہ بنا رکھا ہے۔اس خاکے کے مطابق انسان کی زندگی جنت کا نمونہ ہے۔روح اللہ سے قریب ہونے کی وجہ سے اللہ کے تصور میں ان جنتوں سے واقف ہے۔مگر عملی طور پر جب تک روح کا شعور ان جنتوں میں داخل نہیں ہو جاتا روح کا احساس ان سے آشنا نہیں ہو سکتا۔جس طرح کوئی بریانی پکانے کی ترکیب سیکھ لے۔ترکیب آنے پر تصور میں تو بریانی ہو گی مگر بریانی کا ذائقہ اور لذت سے زبان واقف نہ ہو گی نہ ہی پیٹ بھرے گا۔اسی طرح روح کے اندر ساری کائنات کے علوم موجود ہیں مگر روح اب ان علوم کو عملی طور پر جاننا چاہتی ہے تاکہ ان علوم کی حقیقت سے آشنا ہو اور اپنے حواس کے ساتھ ان کی لذتوں کا مزہ اٹھا سکے۔اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کا ذکر کیا ہے۔جنت میں بھی کھانے پینے کی چیزوں کا تذکرہ ہے اور دوزخ میں بھی ہے۔مگر جنت کے کھانے خوش ذائقہ اور روح کے لئے باعث تقویت وفرح ہیں اور دوزخ کے کھانے بدذائقہ اور روح کے لئے باعث عذاب ہیں۔بدذائقہ کھانا پکانا بھی کوئی پسند نہیں کرتا نہ ہی کھانا پسند کرتا ہے۔اسی طرح اللہ نے بھی روح کو خوش ذائقہ کھانا کھانے کی تلقین کی ہے۔یہ خوش ذائقہ کھانا آپ یوں سمجھئے کہ یہ روحانی علوم ہیں۔وہ علوم جو آدم کو اللہ نے عطا کئے اور بدذائقہ کھانا وہ علوم ہیں جو اللہ نے آدم کے لئے پسند نہیں کئے۔یہ علوم آدم کے دشمن ابلیس کے علوم ہیں۔نفس کے لئے یہ بات جاننی ضروری ہے کہ جب اس کے اندر علم سیکھنے کا تقاضہ پیدا ہو تو اس تقاضے کو وہ اپنی روح کی جانب سے جانے کہ روح اپنے علوم کو عملی تجربے میں بدلنا چاہتی ہے۔روح کے علوم رحمانی علوم ہیں جب آدمی اپنی روح کی جانب توجہ کرتا

www.ksars.org

ہے تو رحمانی علوم اس کے ذہن کی سوچ بن کر نفس کے ارادے میں منتقل ہوتے ہیں۔ روح سے رابطہ شعور کے اندر علم کا شوق بھی بڑھاتا ہے اور علم سیکھنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ ایک روحانی طالب علم اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ اصل نفس روح ہے۔ روح وہ نفس ہے جو تجلی کا نقطہ ہے اور یہ اللہ کے نور سے روشن ہے۔ اس نقطہ کا سایہ مادی نفس کا نقطہ ہے۔ مادی نفس ہر وقت اور ہر آن روح کی روشنیوں سے فیڈ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی روح سے رابطہ رکھتا ہے۔ تاکہ روح کی روشنیاں ارادے کے ساتھ جذب کر سکے اور روح کے ارادے کے ساتھ شعوری ارادے کی مطابقت ہو سکے ۔روح سے رابطہ قائم کرنے کے لئے جب بھی کوئی کام کریں تو ذہن میں تصور کریں کہ یہ میں نہیں بلکہ میری روح کر رہی ہے۔ روح دیکھ رہی ہے۔ روح ہی سوچ رہی ہے۔ روح کھا رہی ہے۔ جب تصور میں ہر وقت روح ہو گی تو روح کا ارادہ اور شعور غالب آجائے گا اور علم سیکھنے کے تقاضے پر آدمی کے اندر روح کے علوم سیکھنے کی جستجو اور لگن پیدا ہو گی اور اس لگن کا مطلب یہ ہے کہ روح کے علوم کی روشنیاں شعور جذب کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ روحانی استاد اپنے شاگرد کے اندر علوم سیکھنے کا تقاضہ پیدا کرتے ہیں تاکہ علم کے لئے اس کے اندر زیادہ سے زیادہ شوق پیدا ہو۔ جس کے اندر جتنی زیادہ لگن ہو گی اتنا ہی وہ کامیاب ہو گا۔ شعوری زندگی ساری کی ساری روح کے سیکھے ہوئے علوم کا عملی تجربہ ہے۔ تجربہ دو طرح کے نتائج پیش کرتا ہے۔ ایک اچھا دوسرا برا۔ پس زندگی انہی دو راستوں پر چل رہی ہے۔ نفس اگر اپنی روح کا ہاتھ پکڑ لے تو روح اسے اللہ کی جانب روشنیوں میں لے جاتی ہے۔ اندھیرا روح کے لئے اور نفس کے لئے باعث خوف اور باعث رنج و غم ہے۔ کوئی آدمی بھی زہر کا پیالہ جان بوجھ کر پینا پسند نہیں کرتا۔ لاعلمی وہ زہر ہے جو آدمی جان بوجھ کر اپنے نفس کو پلاتا ہے اور پھر یہ توقع رکھتا ہے کہ نفس اس سے جاندار اور صحت مند رہے گا۔ لاعلمی کا اندھیرا نفس پر اور زیادہ اندھیروں کی تہیں چڑھا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب روح کی روشنی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ نفس اپنے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اللہ ہمیں ایسے عذاب سے بچا کر رکھے۔ آمین۔

خلاصہ:

۔ تجسس ہی آدمی کو علم سیکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تجسس اسم محیط کی روشنی ہے۔

۔ انسان کی شعوری زندگی اس کے اپنے ارادے کے ساتھ عملی زندگی ہے۔

www.ksars.org

۔جنت میں آدم کے ذہن کی اسپیڈ اللہ کے امر کی اسپیڈ تھی۔

۔نفس کے اندر علم سیکھنے کا تقاضہ روح کی جانب سے ہے اور روح اپنے علوم کو عملی تجربے میں بدلنا چاہتی ہے۔

۔مادی شعور کے لئے تین تاریکیاں تین لاشعور ہیں۔

۔علم انسان کے ذہن ودل سے خوف اور بے یقینی کو دور کرتا ہے۔

۔روح وہ نفس ہے جو تجلی کا نقطہ ہے اور یہ اللہ کے نور سے روشن ہے۔

www.ksars.org

محدود اور لا محدود

۱۔ محدودیت سے مراد رکا ہوا، اٹکا ہوا یا مقید ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ جو آدمی محدود طرزِ فکر رکھتا ہے اس میں جلن، حسد اور غصہ ہوتا ہے۔ لا محدودیت سے مراد جو احاطے میں نہ آسکے یا لا متناہی اس کی وسعت کا دائرہ کائنات کے دائرے سے نکل کر اللہ سے جاملتا ہے لا محدودیت کا ادراک آدمی کے اندر محبت، ایثار اور خدمت کے جذبات ابھارتا ہے۔

۲۔ When Allah said KUN every particle from infinite came into existence. Existence is finite.

۳۔ Ph.D دنیاوی علوم کی انتہا ہے۔ ایک Ph.D آدمی کی ایجادات کو دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کو دیکھ کر یہ سمجھ میں اتا ہے کہ انسان کتنا بھی علم سیکھ جائے وہ محدود ہے اور اللہ کا علم لا محدود ہے۔

۴۔ ذاتی فکر محدودیت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر حاصل ہونے سے لا محدودیت میں ذہن داخل ہو جاتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اس میں اللہ پاک ہماری محدودیت اور اپنی لا محدودیت کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ محدودیت اپنی انا کا خول ہے اور لا محدودیت اللہ کی ذات ہے۔

۶۔ محدودیت کی پہچان آدمی کا شعور ہے اور لا محدودیت آدمی کا لاشعور اور روح کا علم ہے جس میں ٹائم اینڈ اسپیس کی پابندی سے آزادی آدمی کو لا محدودیت میں داخل کر دیتی ہے۔ لا محدودیت اللہ کا علم ہے۔

۷۔ خدا کی ذات وصفات اور اس کا امر لا محدود ہے جب کہ آدمی کا ذاتی ارادہ محدود ہے۔

www.ksars.org

۸۔ انسان کا شعوری دماغ محدودیت ہے اور لاشعوری دماغ لامحدودیت ہے جو روح کا دماغ ہے۔ جنت میں آدم و حوا کا لاشعوری دماغ کام کر رہا تھا۔ دنیا میں آکر شعوری دماغ کام کرنے لگا اور لامحدودیت کا دماغ پس پردہ چلا گیا۔ دونوں دماغ انسان کے دو حواس ہیں۔

۹۔ محدودیت نافرمان ذہن کی دنیا ہے یعنی شر۔ نافرمان ذہن کا ہر عمل آدمی کو محدودیت میں مقید رکھتا ہے۔ لامحدودیت فرمانبردار ذہن کی دنیا ہے یعنی خیر۔ یہ روح کی یا غیب کی دنیا ہے۔ روح کے دماغ کا ہر عمل لامتناہیت میں لے جاتی ہے۔

۱۰۔ This world can only give you certain amount but Allah's gift are limitless.

۱۱۔ اپنی فکر کو اپنے ذاتی دائرے تک محدود رکھنا محدودیت ہے۔ اپنی فکر کو اللہ کے امر کے دائرے سے منسلک کر دینا لامحدودیت ہے۔

۱۲۔ شعور مسافر ہے اور لاشعور راستہ۔ مسافر محدودیت ہے اور راستہ لامحدودیت۔ لامحدودیت کا احاطہ عقل و شعور کے بس کی بات نہیں۔

۱۳۔ لامحدودیت کی تمثیل دائرہ اور محدودیت کی تمثیل مثلث ہے۔ اپنی روح کو پہچاننا لامحدودیت کو پہچاننا ہے۔

۱۴۔ غیب کی ہر شئے لامحدود ہے اور ظاہر کی ہر شئے محدود ہے۔

۱۵۔ Matter یعنی مادے کی ہر چیز میں کشش ہے اور ہر چیز کی کشش صرف اپنے مرکز کی جانب ہے۔ مادے کی جانب کھنچاؤ محدودیت ہے۔ اللہ کا نور لامحدودیت ہے۔ نور کی جانب بڑھاؤ لامحدودیت ہے۔ شعور کا علم محدودیت اور لاشعور کا علم لامحدود ہے۔

www.ksars.org

۱۶۔ ظاہری حواس یامادی حواس کے دائرہ کار کو محدودیت اور باطنی حواس یانورانی حواس کے دائرہ کار کو لامحدودیت کہتے ہیں۔

۱۷۔ کسی شئے یا ہستی کا حواس کی گرفت میں آجانے کا نام محدودیت اور حواس کی گرفت میں نہ انے کا نام لامحدودیت ہے۔

۱۸۔ باہر دیکھا محدودیت ہے اور اپنے اندر دیکھنا لامحدودیت ہے۔

۱۹۔ محدودیت وہ ہے جس کو نظر دیکھ سکتی ہے اور اس کا تذکرہ بھی کرتی ہے۔ محدودیت میں حد قائم ہو جاتی ہے۔ محدودیت کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور سمجھ بھی سکتا ہے اور اس کا واضح طور پر نقشہ بھی کھینچ سکتا ہے۔ محدودیت مادی آنکھ کی رینج ہے۔ لامحدودیت مادی نظر کی حد سے باہر کی حد کو کہتے ہیں۔ یہ حد مادی حواس کے لیے غیب ہے۔ غیب لامحدودیت ہونے کی وجہ سے یہاں حد بندی کا تصور نہیں ہے۔ غیب میں ٹائم اینڈ اسپیس سے آزاد حواس کام کرتے ہیں۔ آزاد حواس اور آزاد فکر کے ذریعے ہی اللہ کی پہچان کی جاسکتی ہے۔

۲۰۔ کوئی بھی خیال جب عقل وشعور اور مادی حواس کے دائرے میں اپنا مظاہرہ کرتا ہے وہ محدودیت ہے اور جب خیال کی روشنی عقل وشعور اور مادی حواس کے دائرے سے باہر مظاہرہ کرتی ہے وہ لامحدودیت ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ محدودیت اور لامحدودیت میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۲۔ انسان کی تخلیق اور اللہ کی تخلیق میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۳۔ ٹائم اینڈ اسپیس سے آدمی کس طرح آزاد ہو سکتا ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۴۔ لامحدودیت میں آدمی کس طرح داخل ہو سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

محدودیت انسان کا وہ شعور ہے جو آدمی کو مادی دنیا یا ٹائم اینڈ اسپیس کے اندر مقید رکھتا ہے اور لامحدودیت روح کا وہ شعور ہے

جو انسان کو اللہ کے علم میں دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا شعور عطا کرتا ہے۔ اللہ کا علم لامحدود ہے۔ پس لامحدودیت کا شعور آدمی کو لامحدودیت میں داخل کر دیتا ہے۔ انسان کے اندر دو قسم کے حواس کام کر رہے ہیں۔ مادی حواس ٹائم اینڈ اسپیس میں کام کرتے ہیں اور روحانی حواس ٹائم اینڈ اسپیس سے آزاد رہ کر کام کرتے ہیں۔ گویا ہر آدمی کے اندر اللہ پاک کی تخلیق کردہ اشیاء کو سمجھنے اور دیکھنے کے لیے دو زاویہ نگاہ ہیں۔ ایک زاویے میں آنکھ شئے کے ظاہری خدوخال کو دیکھتی ہے۔ دوسرے زاویے میں آنکھ شئے کے باطنی نقش و نگار کو دیکھتی ہے۔ ظاہری زاویہ نگاہ میں نظر کی روشنی شئے کو چھو لیتی ہے۔ نگاہ کی روشنی کا شئے کو چھو لینے کی وجہ سے شئے کا ادراک حواس میں بدل جاتا ہے جس کی وجہ سے شئے کا علم حواس کے دائرے میں ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ظاہری حواس محدود ہونے کی وجہ سے شئے کی قربت کا احساس دلاتے ہیں یعنی یہ نگاہ کا وہ زاویہ ہے جو شئے کو قریب ہی دیکھ لیتی ہے۔ دوسرا زاویہ نگاہ شئے کو حواس کے دائرے سے باہر دیکھتا ہے۔ پس اس زاویے میں نگاہ شئے کو دور دیکھتی ہے۔ اگر ہم قریب اور دور دیکھنے کے اس عمل کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو محدودیت اور لامحدودیت کے شعور کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔ ہمارے اندر دو دماغ کام کر رہے ہیں۔ ایک دماغ شعور ہے دوسرا لاشعور ہے۔ شعوری حواس محدودیت ہے اور لاشعوری حواس لامحدودیت ہے۔ لامحدودیت غیب ہے۔ غیب میں روح اللہ کے امر پر کام کر رہی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عالم امر کی تحریکات کا نام غیب ہے اور غیب کی تمام تحریکات امر ربی یا روح کے ذریعے عمل میں آتی ہیں۔ غیب میں روح جو بھی حرکت کرتی ہے وہ حرکت لاشعوری دماغ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ حرکت امر ربی کی تجلی کا ایک نقطہ ہے جو روح کے ذریعے لاشعوری دماغ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ امر ربی کی تجلی کے اس نقطے میں غیب کی کسی نہ کسی شئے کا مکمل علم ہوتا ہے جسے روح غیب میں دیکھ لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تجلی کا یہ

www.ksars.org

نقطہ روح کے ادراک کا نقطہ ہے جس میں روح کی جانب سے اس شئے کی اطلاع اور علوم ہے جو شئے روح نے غیب میں دیکھی ہے۔ تجلی کا یہ نقطہ جس مقام پر نزول کرتا ہے وہ مقام نقطہ ابحت کہلاتا ہے۔اس مقام سے تجلی کے نقطے سے فلیش کی صورت میں تجلی نزول کر کے اخفیٰ کے مقام پر آتی ہے اور خفی تک پھیل جاتی ہے۔اس طرح تجلی کا ایک دائرہ بن جاتا ہے۔

اخفی اور خفی کی تجلی کے دائرے میں روح کی نگاہ جو امر ربی کی نظر ہے، تجلی کے اندر عالم امر کے نقش و نگار دیکھ لیتی ہے۔روح کی نگاہ کا یہ دیکھنا ایک فلیش کے اندر دیکھنا ہے۔یہ فلیش ادراک کا وہ لمحہ ہے جو امر کن کی ایک چھوٹی سے چھوٹی کسر ہے جو سیکنڈ کا اربوں کھربوں حصہ ہو سکتا ہے۔وقت کی یہ مختصر ترین اور کم ترین فصل شعور کی گرفت میں نہیں آتی جس کی وجہ سے شعور اسے معنی نہیں پہنا سکتا۔ جیسے کوئی تین سو میل کی رفتار سے گاڑی میں سفر کرے تو راستے کی کسی بھی شئے کو دیکھ نہ پائے گا اور پوچھنے پر یہی کہے گا کہ کچھ نہیں دیکھا۔اسی طرح یہ فلیش لائٹ جب اور آگے بڑھتی ہے تو روشنی کی رفتار میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے اور تجلی کے نقطے سے دوری کی وجہ سے اس کے اندر ایک درجہ کثافت آجاتی ہے۔ تجلی کی روشنی کا یہ دائرہ نور کہلاتا ہے۔جو سر اور روح کا دائرہ ہے۔روح کی نظر نور میں عالم امر کے نقش و نگار دیکھ لیتی ہے۔ تجلی کے نقطے سے روشنی جیسے جیسے دور ہوتی جاتی ہے روشنی میں کثافت بڑھتی جاتی ہے۔اس طرح روشنی کے مزید دائرے بنتے جاتے ہیں اور ہر دائرے میں کثافت (Density) کی مقداروں کے مطابق امر کی رفتار بھی کم ہوتی جاتی ہے۔اس طرح نور کے بعد ایک دائرہ روشنی کا ہے جو قلب اور نفس کہلاتا ہے۔اس دائرے سے نکل کر روشنی میں اس حد تک کثافت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ تجلی کے نقطے سے اس حد تک دور ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر امر کی رفتار اور حرکت پر تقریباً جمود طاری ہو جاتا ہے۔ یہی انجماد شئے کو نگاہ کے سامنے ٹھہرا دیتا ہے اور آدمی ظاہر میں دیکھ لیتا ہے۔ظاہر میں دیکھنا جیسے اسکرین پر عکس کو دیکھنا ہے۔عکس میں روشنی کی ساری حقیقت چھپ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ظاہر کو دیکھ کر باطن کا اندازہ نہیں ہوتا۔البتہ باطن کو دیکھ کر ظاہر کا اندازہ فوراً ہو جاتا ہے۔اخفیٰ، خفی، سر کے مقام پر تجلی کی

www.ksars.org

روشنی لاشعوری حواس بناتی ہے جن کا تعلق لاشعوری دماغ سے ہے۔روح، قلب اور نفس کی روشنی شعوری حواس بناتی ہے جس کا تعلق شعوری دماغ سے ہے۔اس طرح دماغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نظر کا دیکھنے کا اور شعور کے معنی پہنانے کا قدرت نے ایک مخصوص فنکشن رکھا ہے جو ہمارے دماغ میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہمارے دماغ میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً بارہ کھرب خلیے (Cells) موجود ہیں۔ان خلیوں کا مجموعہ دماغ ہے۔ تجلی کے نقطے سے نکلنے والی روشنی ان خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہے مگر یہ منتقلی بے ترتیب نہیں ہوتی بلکہ ایک ترتیب کے ساتھ ہوتی ہے۔مثال کے طور پر دماغ میں خیال آتا ہے تتلی کا۔ جیسے ہی خیال آتا ہے دماغ کے خلیوں میں خیال کی روشنی جذب ہو جاتی ہے اور یہ خلیے ننھے منے بلب کی صورت میں روشن ہو جاتے ہیں اور اس انداز اور ترتیب میں روشن ہوتے ہیں کہ ان کی ترتیب سے تتلی کی صورت یا خاکہ بن جاتا ہے۔ قلب کی نگاہ اسے دیکھ لیتی ہے اور تتلی کو پہچان جاتی ہے۔اب جب بھی تتلی ظاہر میں دکھائی دیتی ہے تو وہ فوراً پہچان لیتی ہے۔اس طرح آدمی کی نگاہ اپنے اندر بھی دیکھتی ہے اور باہر بھی دیکھتی ہے۔انر کا تعلق غیب سے ہے۔اس کے اندر کائنات کے تمام خاکے تجلی، انوار اور روشنی میں ہیں۔انہی خاکوں کا عکس مادی دنیا ہے۔اگر انسان اپنے انر میں دیکھنا سیکھ لے تو وہ غیب کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ مظاہرات غیب کی بساط تجلی پر ہے جس کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیب میں رونما ہونے والے تمام مظاہرات کائنات کی اصل قوت تجلی کی روشنی ہے یہی بات اللہ پاک بھی اپنے کلام میں فرما رہے ہیں کہ ہر شئے اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اللہ کی جانب لوٹ جاتی ہے۔انسان بھی اللہ ہی کی طرف سے آ رہا ہے اور اللہ ہی کی جانب لوٹ جانے والا ہے۔یعنی ہر شئے لامحدودیت سے محدودیت میں آتی ہے اور لامحدودیت کا تعارف کراتی ہے۔اسی تعارف کے لیے اور اللہ کی پہچان کے لیے مادی شعور عطا ہوا ہے۔اگر آدمی اس شعور کے ذریعے غیب کی دنیا میں داخل نہ ہو اور مظاہرات غیب کو پہچاننے کی کوشش نہ کرے تو تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔آدمی کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ ہر آدمی انفرادی طور پر اپنے خالق اور رب کی عظمت و جبروت کا اعتراف کرے۔اپنے رب کی ربوبیت کا اعتراف کرنے اور اس کی قدرت اور جبروت کو پہچاننے کے لیے روح کو دو قسم کے حواس عطا ہوئے ہیں۔ شعوری حواس میں انسان مظاہر کائنات کو بے بسی، مجبوری اور محتاجی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے۔

www.ksars.org

محتاجی کا یہ احساس اسے ٹائم اینڈ اسپیس کے اندر بند کر دیتا ہے۔ جب بندے کی نظر اپنی محتاجی اور کمزوری کو دور کرنے والی ہستی کی جانب پڑتی ہے تو اسے لامحدودیت کا احساس ہوتا ہے۔

حضور پاک ﷺ پر بذریعہ وحی اللہ پاک نے یہ ایت نازل فرمائی۔ ''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو پسند کیا۔'' (سورہ مائدہ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضور پاک ﷺ کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ ہم نے آپ ﷺ کے اندر محدودیت اور لامحدودیت دونوں حواس کی تکمیل کر دی ہے یعنی آپ ﷺ کے شعوری حواس اور لاشعوری حواس دونوں حواس کی تحریک انتہائی عروج پر ہے۔ اسلام سے مراد علم الاسماء ہے۔ علم الاسماء اللہ پاک کی ذات اور صفات کے علوم ہیں۔ اللہ پاک حضور پاک ﷺ کو یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ اے حبیب ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو اعلیٰ علیین کے وہ حواس عطا کر دیئے ہیں جن حواس کے ذریعے آپ ﷺ ہر عالم میں اللہ پاک کی ذات وصفات کا مکمل ادراک کر سکتے ہیں۔ دین سے مراد اللہ پاک کی توحید کو جاننا اور پہچاننا ہے۔ اسلام سے مراد اللہ پاک کی توحید کو علم الاسماء کے دائرے میں جاننا اور پہچاننا ہے۔ پس اللہ پاک نے اپنے حبیب ﷺ کو ایسی عقل اور ایسا شعور عطا فرمادیا کہ جو عقل و شعور اللہ پاک کی توحید، اس کی خالقیت اور ربوبت کو اپنے شعوری اور لاشعوری حواس کے ذریعے عالم ناسوت سے لے کر عالم غیب تک اسی طرح جانتی، پہچانتی اور مشاہدہ کرتی ہے جس طرح اللہ چاہتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کے اعلیٰ ترین حواس کی تعریف اللہ پاک نے معراج کے واقعہ میں بھی بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ''ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ ہی حد سے آگے بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی بری بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' (سورہ نجم) یہاں بھی حضور پاک ﷺ کے حواس کی تعریف کی جارہی ہے کہ آپ ﷺ کا ذہن اور حواس وادراک پوری طرح اللہ پاک کی قدرت کے تابع ہیں کہ جو کچھ اللہ نے چاہا، آپ ﷺ نے بالکل بعینہ اس پر عمل کیا اور اللہ پاک کے حکم کی پوری پوری طرح تعمیل کر کے اللہ کی قدرت کی عظیم نشانیاں دیکھ لیں۔

www.ksars.org

ان آیات میں ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ بندگی تابعداری کا دوسرا نام ہے۔ جس شخص کے اندر تابعداری کی جتنی زیادہ سکت ہوگی اتنا ہی وہ اپنے رب سے قربت حاصل کرے گا اور غیب میں اس کی نشانیاں دیکھ سکے گا۔ بندگی کا دوسرا نام اپنی انا کی نفی کر دینا ہے۔ جیسے ہی بندہ اپنی انا کی نفی کرتا ہے وہ اللہ کی انا سے باقی رہتا ہے۔ پھر اللہ اس سے وہی کام لیتا ہے جس کام کے لئے بندے کو اس نے پیدا کیا ہے۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے مگر اگر بندے کی انا اور ذاتی ارادہ اللہ کے ارادے اور راہ میں مزاحم ہو تو کام کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ایک بندہ اللہ کے دربار میں ایسی صورت میں جاتا ہے کہ جس امر کے ساتھ اسے دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ اس امر کی تکمیل کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور ایک بندہ ایسی صورت میں اپنے رب کے سامنے جاتا ہے کہ اس کا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کون سا بندہ خوش ہوگا اور کون سا ناخوش ہوگا۔ ناخوشی ہی عذاب ہے۔ پس بندگی اور تابعداری کے ذریعے شعوری اور لاشعوری دونوں حواس کی سکت بڑھائی جاسکتی ہے اور جتنی سکت زیادہ ہوگی اتنی ہی صلاحیت زیادہ بڑھے گی۔ صلاحیت بڑھنے سے حواس کا استعمال بھی بہتر طور پر کیا جاسکے گا اور محدودیت اور لامحدودیت کی پہچان بہتر طور پر ہو سکے گی۔ اس مضمون کو ہم اس مثال کے حوالے سے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

آدمی کے اندر ہر صلاحیت اللہ پاک کے کسی نہ کسی اسم کی تجلی ہے۔ چونکہ یہ اللہ کی صفت ہیں جس کی وجہ سے انسان ان کی ناواقفیت ہے اور اسے ان صلاحیتوں کو استعمال کرنا نہیں آتا۔ شعور کے لیے یہ صلاحیت ایک نقطہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس طرح نقطے کی قیمت شعور کے نزدیک صفر ہے۔ اسی طرح شعور لاعلم ہے۔ مثال کے طور پر ایک نقطے کا نام اسم بصیر رکھتے ہیں۔ اس نقطے کے اندر تجلی اور انوار کی جو مقداریں کام کر رہی ہیں شعور انسانی اس سے لاعلم ہے۔ اسی لاعلمی کی بناء پر اسے اس کی قدر و منزلت کا اندازہ نہیں ہوتا اور وہ یکسر طور پر اسے فراموش کر دیتا ہے۔ شعور کی یہی لاعلمی اور فراموشی لاشعور ہے کہ جہاں صلاحیتیں موجود ہیں مگر خوابیدہ ہیں۔ تجلی کے اس نقطے سے روشنی پھیلتی ہے اور نقطے کے اطراف میں دائرے بناتی ہے۔ گویا نقطے کی روشنی پھیل کر دائرے پر محیط ہوگئی۔ روشنی کے یہ دائرے ہی محدودیت اور لامحدودیت کا شعور ہیں اور ان دائروں کے اندر روشنی کی مقداریں تجلی کے علوم اور تجلی کے نقطے کی ماہیت ہے۔ تجلی کے نور کے ہر دائرے میں کائنات کی کسی نہ کسی نوع کا شعور موجود ہے۔ اس طرح اگر ہم اسم بصیر کی تجلی کا نقطہ

www.ksars.org

تصور کریں تو اللہ کی صفت کا یہ نقطہ یا تجلی اپنے مرکز سے اللہ کے حکم کن سے پھیلتی ہے اور پھیل کر ازل ابد کی حدود پر محیط ہو جاتی ہے۔ مرکز سے تجلی کا پھیلاؤ اپنے نقطے کے اطراف میں دائروں کی صورت میں پھیلتا ہے۔ تجلی کی روشنی کا ہر دائرہ اسم بصیر کی متعین مقدار ہے۔ یہ متعین مقداریں کائنات کی بصارت اور بینائی ہے۔ ہر نوع کے اندر اسم بصیر کی متعین مقداریں اس نوع کی نظر یا بینائی کا کام کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق کی بینائی ایک مخصوص ویولینگتھ پر کام کرتی ہے۔ اللہ نے انسان کو اسمائے الٰہیہ کے علوم بخشے ہیں۔ یعنی تجلی کے نقطے کا ادراک عطا فرمایا ہے۔ اس مثال کے حوالے سے اس کی تشریح اس طرح ہو گی کہ اسم بصیر کی تجلی کا نقطہ اپنے اندر جس قدر قوت بینائی رکھتا ہے یا تجلی کی روشنی کا انتہائی پھیلاؤ انسان کی بصارت ہے۔ بشرطیکہ وہ اس بصارت کو پہچان کر اس سے کام لینا سیکھ لے۔ تجلی کے ہر نقطے کی روشنی کا پھیلاؤ ازل سے ابد تک ہے یعنی اللہ پاک نے انسان کو اپنی صفات عطا کی ہیں کہ اللہ کی نظر ازل اور ابد کے اندر جو کچھ دیکھتی ہے یہ نظر اللہ نے انسان کو بھی عطا کی ہے اور وہ بھی اللہ کی نظر سے ازل ابد کے اندر دیکھ سکتا ہے۔ اسی نظر سے اللہ کے حبیب ﷺ نے اللہ پاک کو ایک کمان سے بھی کم کے فاصلے پر دیکھ لیا جو انسان کے اندر کام کرنے والی اسم بصیر کی تجلی کی آخری حد یا انتہائی پھیلاؤ ہے۔ تجلی کا نقطہ تجلی کی محدود ترین صورت ہے۔ یہ محدود ترین صورت آدمی کا شعور ہے اور تجلی کا لامحدود پھیلاؤ دائرہ ہے۔

نقطے اور دائرے کے درمیان روشنی کے لاشمار دائرے ہیں جو تجلی کی روشنی کا ایک ایک پھیلاؤ ہے۔

www.ksars.org

انسان کی نظر نقطے یعنی محدودیت سے لامحدودیت میں دیکھتی ہے اور لامحدودیت سے پھر نقطے کی جانب لوٹتی ہے اور لامحدودیت میں جو کچھ دیکھتی ہے نقطے یعنی محدودیت کو اطلاع دیتی ہے۔ نظر کا پھیلنا اور سمٹنا ہی انسان کے حواس اور ادراک ہیں۔ جب آدمی اپنی صلاحیتوں کو نہ تو جاننے کی کوشش کرتا ہے نہ ان کو استعمال کرتا ہے اور اگر کرتا بھی ہے تو بس اپنے ہی ذات کے خول کے اندر بند ہو کر کرتا ہے یعنی اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے تو ایسا شخص محدود طرز فکر کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے اندر کام کرنے والی ہر روشنی اس کی اپنی حد یا جسمانی خول سے آگے نہیں پھیلتی اور جب جسم موت کے بعد ذرات بن کر بکھر جاتا ہے تو روشنی بھی اتنے سارے ذرات میں تقسیم ہو کر بالکل ہی معدوم ہو جاتی ہے۔ نظر ہمیشہ ڈائی مینشن میں دیکھتی ہے۔ جب جس ڈائی مینشن یا جن خول میں نظر کام کر رہی ہے وہ ڈائی مینشن ٹوٹ جاتا ہے تو چونکہ بندے کے پاس کوئی اور ڈائی مینشن نہیں ہو پاتا یا وہ دوسرے ڈائی مینشن سے واقف نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ بینائی سے کام نہیں لے سکتا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مرنے کے بعد اندھا ہو جاتا ہے اور بینائی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جس فریکوئنسی یا ویولینگتھ پر دنیاوی زندگی کی فلم کو دیکھ اور محسوس کر رہا تھا اس فریکوئنسی سے مرنے کے بعد رابطہ ٹوٹ گیا۔ اب اس کے پاس مرنے کے بعد کی فریکوئنسی کا کچھ علم کا کچھ علم نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور پریشان ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم فریکوئنسی ہے یا تجلی کی روشنی کا ایک پھیلاؤ ہے اور عمل اس فریکوئنسی کے اندر داخل ہونا ہے۔ حواس علم اور عمل دونوں کا مجموعہ ہے جو روشنی اور حرکت سے مل کر بنتے ہیں۔ محدودیت انسان کا ذاتی ارادہ اور شعور ہے اور لامحدودیت اللہ کا ارادہ اور اللہ کا امر ہے۔ جب آدمی اپنے اندر واقع ہونے والی ہر حرکت کو اپنے ذاتی ارادے اور قوت کا نتیجہ سمجھ لیتا ہے تو حرکت محدود ہو جاتی اور امر کی روشنی کو روح کی روشنی ہے' محدودیت میں عمل کرتی ہے جس کی وجہ سے آدمی کی صلاحیتیں ابھرنے کی بجائے دب جاتی ہیں مگر جب آدمی اپنے اندر کام کرنے والی ہر حرکت کو اللہ کا امر جان لیتا ہے تو روح کی روشنیوں کا پھیلاؤ اللہ کے ارادے اور امر الٰہیہ تک جا پہنچتا ہے۔ پس بندہ اپنے عمل میں اللہ کی رضا اور ارادے کو پہچان لیتا ہے۔ یہی پہچان اسے لامحدودیت میں داخل کر دیتی ہے جہاں وہ اپنے اندر کام کرنے والی ہر صلاحیت کو اللہ کے نور کی حیثیت سے دیکھ لیتا ہے اور اس نور کو پہچان کر اللہ کی لامتناہیت اور بزرگی و عظمت کا اعتراف کر لیتا ہے۔ یہی اعتراف اس

www.ksars.org

کے لئے اللہ تعالیٰ سے مستقل طور پر رابطے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے اور وہ اللہ کی صفات کا میڈیم بن کر اس کے اوپر کام کرتا ہے اس کی اپنی ذاتی انا اللہ کی انا میں اس طرح گم ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی انا کا نہ تذکرہ کرتا ہے نہ اس کے اندر اپنی انا کا شعور باقی رہتا ہے بلکہ اس کا اپنی ذات یا نفس کا شعور ختم ہو جاتا ہے اور اللہ کی انا کا شعور اس کے اندر ابھر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ محدودیت سے لا محدودیت کی پہچان اپنے اختتام کو پہنچتی ہے یعنی نظر یا اسم بصیر کی بینائی لا محدودیت سے محدودیت کی جانب آتی ہے۔ یہ محدود ترین مقام انسان کی بینائی ہے یا آنکھ ہے۔ یہاں سے یہ بینائی پھر لا محدودیت یعنی اللہ کی جانب لوٹتی ہے۔ جس طرح اللہ کی انا محدودیت میں آکر فرد کی انا میں منتقل ہو گئی اسی طرح فرد کی انا لا محدودیت میں لوٹ کر دوبارہ اللہ کی انا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ دائرہ ہے جس میں مخلوق گردش کر رہی ہے اور اپنی محتاجی اور کمزوری سے اللہ پاک کی سبحانیت کو پہچان کر اس کا اعتراف کر رہی ہے۔ پس اپنے نفس کی بے بسی اور ارادوں کی کمزوری اور اُمیدوں کے ٹوٹنے سے ہی اللہ پاک کی سبحانیت اور لا محدودیت کی پہچان کی جاتی ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دوستو! آج اس نشست میں ہمارے درمیان ایک ایسی ہستی بھی موجود ہیں جن کی شرکت کے لئے ہم اپنے اوپر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ وہ ہستی عالم روحانیت کا جگمگاتا سورج ہے اور آپ ان سے بخوبی متعارف ہیں۔ اب میں آپ جناب کی بارگاہ میں عاجزانہ درخواست کرتی ہوں کہ آپ بھی آج کے اس موضوع پر اپنے مفید نکات اور روحانی نظریہ سے ہمیں استفادہ حاصل کرنے کا موقع عطا فرمائیں۔ شکریہ

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

محدودیت اور لا محدودیت کی پہچان

اس موضوع پر جب میں نے اپنے طور پر غور کیا تو میری سمجھ میں یہی آیا کہ اگر آدمی کے اندر Argument ہے تو محدودیت ہے۔ اگر آدمی کے اندر خود سپردگی ہے اور Surrender ہونے کی صلاحیت ہے تو لا محدودیت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''کہنے لگا اس وجہ سے کہ تو نے مجھے راہ سے بھٹکا دیا میں ضرور تاک میں بیٹھوں گا ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر۔ پھر میں ضرور آؤں گا ان کے پاس (بہکانے کے لیے) ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو نہ پائے گا ان میں سے اکثر کو شکر گزار۔'' (سورہ اعراف ۱۵)

ابلیس نے Argument کی۔ اللہ یہاں اسی کے متعلق بیان کر رہے ہیں کہ جب اس سے نافرمانی کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ اللہ میاں! آپ ہی نے مجھے اغوا کیا اور بھٹکا دیا۔ ابلیس نے جو Argument کی۔ اپنی شعوری عقل کی بناء پر کی۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ پاک نے آدم کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجنا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی کام لینا ہے زمین پر بھیج کر۔ جس کی وجہ سے وہ آدم سے حسد کرنے لگا اور اس کے بارے میں اللہ سے Argument کرنے لگا۔ دوسری طرف ہمارے سامنے آدم کی مثال ہے۔ آدم سے بھی غلطی ہو گئی۔ وہ بھی اللہ پاک کی نافرمانی کا مرتکب ہو گیا جو سوال اللہ تعالیٰ بے ابلیس سے کیا تھا وہی سوال آدم سے بھی کیا۔ آدم ابلیس اور فرشتوں سے کہیں زیادہ علم رکھتے تھے۔ اللہ پاک کی صفت علیم کی نسبت کی بناء پر جو آدم کو اللہ کی جانب سے حاصل ہے۔ پھر بھی انہوں نے اپنے آپ کو Surrender کر دیا اور فرمایا۔ ''اے میرے رب میں نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اگر تو بخشش نہ کرے اور رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔'' آدم نے کوئی Argument نہیں کی۔ مثلاً یہ نہیں کہا کہ آپ نے درخت پیدا ہی کیوں کیا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ فوراً اپنی غلطی مان لی اور اس کا اقرار بھی کر لیا۔ آدم نے بحث نہیں کی بلکہ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اللہ نے پھر فرمایا۔ ''نکل جاؤ اس جنت سے سب کے سب۔ پھر اگر آئے

www.ksars.org

تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگیں ہوں گے۔"(سورہ بقرہ ۳۸)

آدم نے پھر کوئی بحث نہیں کی کہ کیسے جاؤں کیا کروں۔آدم کی خود سپردگی اس علم کی بناء پر ہے جو اللہ نے آدم کو عطا کیا۔ابلیس کی تکرار کی وجہ اس کی لاعلمی ہے۔ محدودیت بحث ہے۔لامحدودیت خود سپردگی ہے۔ علم میں Argument نہیں ہے اس میں عقل و شعور زیر بحث نہیں آتا۔A.B.C اور 123 وغیرہ میں اگر آدمی عقل استعمال کرے مثلاً اٹھارہ سالہ آدمی جوان پڑھ ہو وہ علم سیکھنا چاہے اور پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہے۔استاد اسے کہے پڑھو اے بی سی۔اب وہ اٹھارہ سال کا بالغ شعور استاد کے سامنے اگر اپنی عقل استعمال کرے گا تو وہ اے بی سی کبھی نہیں پڑھ سکتا ہے۔ اسی لیے بحث و تکرار جہاں ہے وہاں محدودیت ہے اور خود سپردگی جہاں ہے وہاں لامحدودیت ہے۔ محدودیت جہالت ہے لامحدودیت علم ہے۔ شاگرد اگر استاد کے سامنے ذرا سی بھی عقل استعمال کرے تو وہ کبھی بھی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک حجت باقی ہے علم حاصل نہیں ہو سکتا۔یہی حال روحانی علوم کا ہے۔اگر آپ کا شعور کام کر رہا ہے تو آپ علم نہیں سیکھ سکتے۔اس وقت مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔دوپہر کے وقت حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا۔کیا گھپ اندھیرا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر کی مجھے ہر طرف گھپ اندھیرا دکھائی دیا۔میں نے ان کی تائید کی کہ بے شک حضور بڑا ہی اندھیرا ہے۔چند لمحوں بعد خود ہی فرمایا۔اندھیرا کہاں ہے دن کے بارہ بجے ہیں۔اب جو میں دیکھتا ہوں تو وہاں خوب روشن دھوپ ہے۔میں نے اس پر غور کیا کہ مجھے اندھیرا کیوں نظر آیا جب کہ دن کا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔میرے ذہن میں آیا کہ کائناتی سسٹم اس قدر بڑا ہے اللہ تعالیٰ کا۔ ممکن ہے جب انہوں نے فرمایا۔ان کی نگاہ کسی ایسی جگہ پڑی ہو جہاں اس وقت اندھیرا ہو۔ مگر میں نے سوچا کہ مجھے کیوں اندھیرا نظر آیا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جیسے ہی انہوں نے فرمایا۔ اندھیرا ہے۔میرا شعور معطل (Suspend) ہو گیا۔ان کا لاشعور میرے اوپر غالب ہو گیا۔کوئی بھی علوم خود سپردگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔پس اگر آدمی کے اندر بحث و تکرار اور Argument ہے تو اس کی طرز فکر محدود ہے اور اگر خود سپردگی ہے تو اس کی طرز فکر لامحدود ہے۔اس کسوٹی پر ہم خود اپنے اندر محدودیت اور لامحدودیت کی پہچان کر سکتے ہیں۔

www.ksars.org

از طرف مرشد کریم

جناب حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب

مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۹۴ء

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

نعمتوں کا استعمال، اللہ کا شکر ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو استعمال کر کے خوش ہونا اللہ کا شکر ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جس میں صحت، مال و دولت، عقل و شعور اور تمام صلاحیتیں ہیں اپنے لیے اور دوسری مخلوق کے فائدے کے لیے استعمال کرنا شکر ہے۔

۳۔ علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل کرنا اللہ کا شکر ہے۔

۴۔ آداب تشکر یہ ہے کہ انسان ہر حال خوشی اور غم میں راضی برضا رہے۔

۵۔ آداب تشکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف ہو اور اپنی کم مائیگی اور بے بسی کا اظہار ہو۔

۶۔ روحانی صلاحیتوں کا استعمال کرنا شکر ہے۔

۷۔ اللہ کی رضا میں راضی ہونا اور ہر بات کو خوشی سے قبول کرنا آداب تشکر ہے۔

۸۔ اللہ پاک سے محبت کرنے کا نام تشکر ہے۔

۹۔ ہر عمل و حرکت صرف اللہ کے لیے کرنا تشکر ہے۔

۱۰۔ اللہ کا شکر یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کو ایک خاندان سمجھنا اور دنیا میں محبت پھیلانا۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو پہچان کر ان سے کام لینا اور دوسروں کو ان صلاحیتوں کی جانب متوجہ کرنا، دوسرے لفظوں میں عل سیکھنا اور سکھانا شکر ہے۔

www.ksars.org

۱۲۔ آداب تشکر یہ ہے کہ اللہ پاک نے جو نعمتیں دی ہیں ان پر شکر کرنا اور جو نہیں دیں ان پر ملال نہ کرنا۔

۱۳۔ اللہ پاک کی تمام نعمتوں کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا شکر ہے۔

۱۴۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ''اے آل داؤد عمل کرو شکر کا۔ میرے بندوں میں سے بہت ہی کم شکر کرنے والے ہیں۔'' ساتھ ہی اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ''اگر تم شکر کروگے تو ہم اس میں مزید اضافہ کریں گے۔'' یعنی جو آدمی اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اپنے اور بنی نوع انسانی کے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے وہ اس میں مزید ترقی کرتا ہے جیسا کہ مشہور ہے۔ ''علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔''

۱۵۔ خداوند کریم کا ہر نعمت کا شکر یہ نہایت محبت اور انکساری سے کرنا جو اس نے دیں اور جو دینے والا ہے۔

۱۶۔ اللہ ہی تمام وسائل پیدا کرتا ہے شکر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرے اور یہ تسلیم کرے کہ اچھا اور برا وقت اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ آداب تشکر کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ہر حال میں اللہ کا شاکر رہے۔

۱۷۔ To thanks Allah by always remembering him, when something bad or good happening to you.

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ نعمتوں کا استعمال اللہ کا شکر کیسے ہے؟

سوال نمبر ۲۔ شکر کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ ناشکری کے کیا نقصانات ہیں؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۴۔ شکر کر کے بندہ اللہ سے کس طرح قریب ہو سکتا ہے؟

سوال نمبر ۵۔ اسمائے الٰہیہ کا نظام کائنات میں کس طرح جاری وساری ہے؟

☆☆☆☆☆

سورہ النمل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''ایک شخص جس کو کتاب کا علم تھا کہنے لگا میں آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے اسے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں۔ جب سلیمان علیہ السلام نے تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار بے پرواکرم کرنے والا ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت انس و جن کے علاوہ چرند پرند اور ہوا سب پر تھی۔ ایسی عظیم الشان اور یکتائے روزگار سلطنت کے بادشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ پیغمبر بھی تھے۔ یعنی آپ کے کندھوں پر دین اور دنیا دونوں کی زمہ داریوں کا بوجھ بھرپور تھا۔ رعایا کے انتظام و خوشحالی کی فکر کے ساتھ ساتھ آپ کو اسلام پھیلانے کی فکر بھی رہتی تھی۔ قرآن نے اسی سورہ میں ملکہ سبا کو اسلام کی دعوت دینے کے متعلق تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے سوچا کہ ملکہ سبا کو اپنے دربار میں بلانے سے پہلے اس کا تخت یہاں آنا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعے اس کی دانائی کا امتحان لیا جائے کہ وہ پہچانتی ہے یا نہیں۔ آپ نے دربار میں اس کا ذکر کیا کہ کون یہ کام کر سکتا ہے۔ ایک جن جس کا نام عفریت تھا کہنے لگا کہ آپ کا دربار برخاست ہونے سے پہلے میں تخت کو آپ کے سامنے حاضر کر دوں گا۔ یہ بات سن کر ایک شخص جس کو کتاب کا علم یعنی روحانی علوم حاصل تھے، کہنے لگا کہ میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کئے دیتا ہوں۔ اسی وقت جب حضرت سلیمان نے نظر کی تو وہ پاس تھا۔ اس پر حضرت سلیمان پہچان گئے کہ یہ سب اللہ پاک کی آزمائش ہے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت۔ ان آیات میں جو اصول بیان کیا گیا ہے وہ آداب تشکر سے متعلق ہے۔ حضرت سلیمان کا اپنی رعایا اور اپنے ماتحتوں سے کام لینا ہی اللہ کا شکر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو استعمال کرنا نعمتوں کا

www.ksars.org

شکر ادا کرنا ہے۔انسان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتیں عطا کی ہیں جیسے اس قصے میں غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اندر حکومت کرنے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں ان کی رعایا میں ایسی مخلوق بھی شامل تھی جن پر آج تک کوئی بھی حکمرانی نہ کر سکا۔اس کا مطلب یہ کہ ان کا تصرف ہوا۔جنات جانوروں وغیرہ پر تھا۔اس عظیم الشان حکومت کے لیے اللہ کا شکر کرنا بھی ضروری تھا۔شکر اسی وقت ہو سکتا تھا جب آپ اپنے ماتحت چیزوں اور مخلوق سے کام لیتے اور فائدہ اٹھاتے۔سو یہی آپ نے کیا کہ جہاں آپ کو ضرورت پڑی اپ نے اپنے ماتحتوں سے کام لیا اور نبوت کے کاموں میں اور سلطنت کے کاموں میں ان کی مدد لی۔

سورہ ابراہیم میں یہی بات اللہ پاک دوبارہ فرماتے ہیں کہ ''اور جب تمہارے پروردگار نے تم کو آگاہ کیا کہ شکر کروگے تو تمہیں زیادہ دوں گا اور ناشکری کروگے تو میرا عذاب بھی سخت ہے۔''

اس آیت میں بھی یہی بات کہی جارہی ہے کہ تم میری نعمتوں کو استعمال کروگے۔انہیں خرچ کروگے تو میں اور دوں گا اور اگر جمع کر کے رکھو گے تو وہ بھی چھین لوں گا۔اس میں دنیاوی نعمتیں بھی شامل ہیں اور روحانی صلاحیتیں اور علم بھی۔آدمی جب صلاحیتوں سے کام لیتا ہے تو یہ صلاحیتیں اور زیادہ ابھرتی ہیں اسی طرح علم جب پھیلتا ہے تو اور زیادہ ذہن و دل کھلتا ہے۔مگر اگر علم سیکھ کر پریکٹس میں نہیں لاتا تو کچھ عرصے میں بھول جاتا ہے۔اس طرح وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے۔اللہ کے نزدیک یہی ناشکری ہے۔

اس پر عذاب کی وعید ہے۔

اسی طرح سفر کے دوران قصر نماز کا حکم ہے۔یہ اللہ کی جانب سے مسافرت میں آسانی رکھی گئی ہے جو اس آسانی کو قبول

نہیں کرتا اور پوری نماز پڑھتا ہے۔یہ بھی اللہ کی ناشکری ہے اور کفران نعمت ہے کہ ایک نعمت آپ کو اللہ نے دی اور آپ نے اسے

www.ksars.org

قبول نہ کی۔ ہماری دنیاوی زندگی عملی زندگی ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں تمام اعمال کا ریکارڈ ہو رہا ہے جو نعمت اللہ نے ہمیں دی جب ہم

اس کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کے حکم پر عمل کرنے کا ریکارڈ بن جاتا ہے۔ نعمت کو استعمال کر کے جو فائدہ اور خوشی ہوتی ہے تو اللہ بھی

اپنے بندے کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اسی خوشی میں وہ اور نوازتا ہے۔ کیونکہ مخلوق کے اس نعمت سے فائدہ اٹھانے پر اس کی

صفت کریمانہ جوش میں آتی ہے جیسے ماں باپ بچے کو ایک کھلونا خرید کر دیتے ہیں جب بچہ اس کھلونے سے خوش ہو ہو کر کھیلتا ہے تو

ماں باپ اسے دوسرا لا کر دیتے ہیں تاکہ اس کی خوشی اور دلچسپی بچے کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس طرح بچہ اور ماں باپ کے درمیان ایک

ایسا رشتہ ہے کہ اگر بچے کو تکلیف پہنچتی ہے تو ماں باپ کو بھی درد ہوتا ہے اور اس رشتے کو توڑا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ اٹوٹ بندھن ہے جو

فطرت کا تقاضہ بن کر ہر مخلوق کے اندر جاری و ساری ہے۔ اس رشتے کے ٹوٹنے سے نظام میں گڑبڑ واقع ہوتی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کا پورا نظام تباہ ہو جاتا ہے بلکہ ایک فرد اور اس متعلقہ افراد پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بجلی گھر سے سارے شہر کو بجلی سپلائی ہوتی ہے اور ہر گھر کا ایک علیحدہ میٹر اور علیحدہ نظام ہے۔ الگ فیوز سسٹم ہے تاکہ اگر خرابی ہو تو ایک گھر متاثر ہو نہ کہ پورا شہر۔ اللہ پاک کی ہستی بحیثیت خالق اور رب ہونے کے مرکزیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مرکز سے کائنات کا ذرہ ذرہ منسلک ہونے مجبور ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر بجلی گھر نہ ہو گا تو کسی ایک گھر میں بھی بجلی نہیں جلے گی۔ اس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کا محتاج

www.ksars.org

ہے۔ مگر مرکز کی جانب سے ہمیشہ سپلائی کا ایک مستقل نظام ہوتا ہے تاکہ سرکل چلتا رہے۔ اللہ کی جانب سے بھی اس کے اسمائے الٰہیہ کے نظام مستقل طور پر کائنات کو انرجی پہنچانے کے لیے موجود ہیں۔ مگر خرابی اس وقت آتی ہے جب بندے کی جانب سے کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ اس کو ہم اس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے موٹروے پر سو گاڑیاں اسی میل کی رفتار سے چل رہی ہیں کسی وجہ سے ایک گاڑی میں کوئی نقص آجاتا ہے وہ اسی میل کی رفتار سے چلتے چلتے ایک دم دو میل کی رفتار پر آجاتی ہے۔ اب نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے پیچھے آنے والی تمام گاڑیاں اس گاڑی سے ٹکرا جاتی ہیں کیونکہ رفتار کی وجہ سے سرکل قائم تھا اور سب اپنی اپنی جگہ پر چل رہے تھے، رفتار جیسے ہی رکی، تصادم ہو گیا اور سب کا نظام بگڑ گیا۔ اسی طرح بندے کی جانب انرجی مرکز کی طرف سے آرہی ہے۔ مرکز سے بندے کا رابطہ قائم رہا تو مرکز کے ارادے اور انسان کے ارادے کے درمیان ایک رابطہ قائم رہتا ہے اور دینے اور لینے کا سلسلہ ایک چکر کے طور پر چلتا رہتا ہے مگر جب بندہ اللہ کی نعمت کا کفران کرتا ہے جیسے دنیاوی سامان ذخیرہ کرتا ہے یا اپنی صلاحیتوں سے خاطر خواہ کام نہیں لیتا تو دینے والے کی نظر ان معاملات کو ذخیرہ اندوزی میں شمار کرتی ہے اور رکاوٹ جانتی ہے کیونکہ اس سے چکر ٹوٹ جاتا ہے۔ خواہ وقتی طور پر ہو یا مستقل طور پر۔ اس کا اثر بندے پر تو پڑتا ہی ہے۔ دینے والا مرکز تو ایک مستقل نظام کے تحت چل رہا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ہے نہ تعطل واقع ہوتا ہے۔ تبدیلی اور تعطل مخلوق کے اندر ہوتا ہے جس کی وجہ سے مخلوق ہی نقصان اٹھاتی ہے۔ لہذا آداب تشکر یہی ہے کہ جو نعمتیں اللہ نے عطا کی ہیں انہیں اللہ کے قانون اور رضا کے مطابق استعمال کیا جائے۔

روحانی شعور وہ طرزِ فکر ہے جو اللہ کے تفکر سے سوچتا ہے اور اللہ کے ارادے سے عمل کرتا ہے۔ روحانی شعور کی ہر لمحے یہی تلاش رہتی ہے کہ فلاں فکر سے اللہ کا کیا مقصد ہے۔ فلاں بات میں اللہ پاک کیا کہنا چاہتے ہیں۔ روحانی شعور جب ہر وقت اللہ پاک کے تفکر میں غور کرتا رہتا ہے تو اس پر اشیاء کی حکمتیں کھل جاتی ہیں۔ اسی طرح جب ہم روحانی شعور کے ذریعے اللہ پاک کی نعمتوں کا تصور کرتے ہیں کہ اللہ پاک کے تفکر میں نعمت کے کیا معنی ہیں تو ہمیں اپنی اس حالت اور اس وجود کی جانب دھیان دینا پڑتا ہے جو وجود اللہ سے قریب تر ہے

www.ksars.org

اور یہ وجود روح ہے۔ وہ روح اعظم جس کا تعلق براہ راست اللہ پاک سے ہے۔ جسے اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں نے کن کہہ کر پیدا کیا اور آدم کو اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کیے۔ پیدا کرنا خالقیت کا وصف ہے اور عطا کرنا ربوبیت کا وصف ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں نے کن کہہ کر ایک دم میں ہی ساری کائنات کی ارواح کو پیدا کر دیا اور اب کوئی بھی نئی روح پیدا نہیں ہو گی بلکہ تمام روحیں ازل میں ایک دم میں ہی وجود میں آچکی ہیں۔ اس کا مطلب ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ روحوں کا رشتہ قدیم ہے اور جس صفت کے ساتھ روح کو حیات کی انرجی تقسیم ہو رہی ہے تاکہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے، وہ صفت ربوبیت ہے۔ یعنی صفات باری تعالیٰ کے ساتھ روح کا رشتہ حادث ہے۔ پس ذات خالق اپنی ذات میں یکتا ہے اور اپنی صفات میں علیم ہے۔ روح کو اللہ تعالیٰ کی صفت علیم کے ساتھ نسبت ہے۔ اسی نسبت کا عکس اسمائے الٰہیہ کے وہ علوم ہیں جو آدم کو عطا کیے گئے ہیں جس لمحے یہ نسبت ٹوٹ گئی اسی لمحے روح آدم کا وجود ختم ہو جائے گا۔ پس آدم کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اسمائے الٰہیہ کے علوم ہیں۔ جو بندہ ان علوم کے سیکھنے کی جانب پیش رفت کرتا ہے اللہ پاک اس کو اپنی راہیں دکھا دیتے ہیں۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اللہ کے نزدیک روح نفس واحدہ ہے۔ وہ صرف مرد یا صرف عورت نہیں بلکہ صرف روح ہے اور روح کے اندر مرد اور عورت دونوں کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ انسان کے لیے بحیثیت آدم اللہ پاک کے شکر کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اسمائے الٰہیہ کے علوم سیکھ کر اپنی روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرے تاکہ اپنے ازلی وجود کو پہچان سکے اور ازلی شعور کے ساتھ اپنے رب کی نعمتوں کو پہچان کر ان سے لطف حاصل کرے۔ اگر باپ اپنے بچے کو کوئی چیز لے کر دیتا ہے اور بچہ اس سے خوش نہیں ہوتا تو باپ کو بچے سے دوگنا افسوس ہوتا ہے۔ ایک تو اپنے لاحاصل کام پر دوسرے بچے کی ناخوشی کے احساس محسوس کر کے۔ اللہ ہمارا رب ہے اس نے ہمیں جو نعمتیں عطا کی ہیں ان سے بہتر تو ہو ہی نہیں سکتیں۔ مگر ان سے ہم جب تک خوش ہو کر لطف اور فائدہ نہیں اٹھائیں گے ہمارے رب کا دل کیسے خوش ہو گا۔ اسے اپنی عطا کا تو علم ہے مگر جب تک ہمیں بھی اس کی عنایتوں کا علم نہیں ہو گا اس وقت تک اس کا بھی مقصد پورا نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ ہماری پیدائش سے اس کا مقصد یہی ہے کہ اس کی عنایتوں اور نعمتوں کے ساتھ اس کی ربوبیت کو پہچانیں۔ ربوبیت کی

www.ksars.org

پہچان توجب ہو گی جب ہم اس سے واقف ہوں گے۔ جو لوگ ربوبیت کے تفکر کے اس بھید سے واقف ہو گئے انہوں نے اللہ کا شکر اور حق ربوبیت ادا کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیا اور اللہ کی ان ازلی نعمتوں کا سراغ لگا لیا جس کے سامنے انہیں دنیا کی تمام دولتیں ہیچ نظر آئیں۔ حضرت ابراہیمؒ بلخ کے بادشاہ تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی ہدایت انہیں پہنچی تو ان پر اللہ کے تفکر کی نعمتوں اور سلطنتوں کے اسرار کھل گئے۔ اسی لمحے انہوں نے دنیا کی سلطنت چھوڑ دی اور اس کے عوض اللہ نے انہیں ایسی بادشاہی عطا کی جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

آپ کا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بار آپ دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھے اپنی گدڑی سی رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر

آپ سے پوچھا کہ بلخ کی سلطنت چھوڑ کر آپ کو کیا ملا۔ آپ نے سوئی دریا میں ڈال دی اور اشارہ کیا ہزاروں مچھلیاں دجلہ سے نکلیں اور سب کے منہ میں سونے کی ایک ایک سوئی تھی۔ آپ نے کہا مجھے یہ سوئیاں نہیں چاہیے میں اپنی سوئی چاہتا ہوں ایک چھوٹی مچھلی سامنے آئی اس کے منہ میں آپ کی سوئی تھی وہ آپ نے لے لی اور اس پوچھنے والے سے کہا کہ بلخ کی سلطنت ترک کر کے جو ادنی بات مجھے حاصل ہوئی وہ یہ ہے۔

اللہ پاک نے ساری کائنات انسان کے لیے بنائی ہے اور انسان اس سے فائدہ اور لطف اٹھا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے اندر کائناتی صلاحیتیں بیدار کر لے تاکہ کائنات کی ہر شئے کو اپنے ارادے کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہی اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہے۔ اللہ پاک ہمیں اپنی روح کا عرفان عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

حقوق العباد

۱۔ ہر رشتے دار سے اللہ کی خوشنودی کے لیے اور اسی رشتے کے واسطے سے محبت کی جائے اور اسی حساب سے اس کے حقوق ادا کیے جائیں۔

۲۔ Treat everybody equal to the best of your ability.

۳۔ اللہ کی رضا کے لیے ہر انسان کی ضرورت کو اپنی گنجائش کے مطابق بے لوث ہو کر پورا کرنا حقوق العباد ہے۔

۴۔ حقوق العباد خلق ہے جو قریب ترین حلقہ احباب سے شروع ہوتی ہے اور یہ دائرہ وسیع ہو کر ساری مخلوق کو احاطہ کر لیتا ہے۔

۵۔ اللہ کی مخلوق سے اللہ کے لیے محبت کرنا اور کسی کا دل نہ دکھانا حقوق العباد میں آتا ہے۔

۶۔ تمام انسان آپس میں ایک خاندان ہے۔اس خاندان کو بکھرنے سے بچانے کا نام حقوق العباد ہے۔

۷۔ ایک روحانی آدمی میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی بے لوث خدمت کرے اور ان کے ساتھ بغیر کسی توقع کے خیر خواہی اور دوستی قائم رکھے۔

۸۔ حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر کے مطابق ہر ایک سے حسن سلوک رکھنا حقوق العباد ہے۔

۹۔ انسان کے اندر جب تک اپنی انا کا غلبہ رہتا ہے وہ دوسروں پر اپنے حقوق کا تعین کرتا ہے اور کبھی بھی اپنے دوسروں کا کوئی حق نہیں سمجھتا۔وہ ہر وقت اپنی ذات کو سامنے رکھتا ہے۔ایسا انسان کبھی بھی روحانی نہیں ہو سکتا۔ایک روحانی آدمی یہ بات جانتا ہے کہ وہ تعلقات کی ایک زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔یعنی انسانی معاشرے کا

www.ksars.org

ایک فرد ہے اور اس لحاظ سے دوسرے انسانوں کے اس پر حقوق ہیں اور وہ ان حقوق کو کما حقہ پورا کرتا ہے۔ وہ ہر حالت میں غصے پر قابو رکھتا اور دوسرے لوگوں کو ان کی زیادتی پر معاف کر دیتا ہے۔

۱۰۔ عزیز و اقارب کی بے لوث خدمت کی جائے۔ ایک روحانی آدمی کے نزدیک حقوق العباد یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مرشد کے حوالے کر دے۔

۱۱۔ محبت کے ساتھ حسن سلوک حقوق العباد ہے۔

۱۲۔ اللہ نے ہر رشتے کے مطابق دوسرے پر اس کے حقوق عائد کیے ہیں۔ اللہ کی رضا کے مطابق اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانا حقوق العباد ہے۔

۱۳۔ اللہ کی تمام مخلوق کے ساتھ محبت کرنا اور ان کے حقوق پورے کرنا خاص طور سے اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا حقوق العباد ہے۔

۱۴۔ حقوق العباد میں سب سے زیادہ حق ماں باپ کا پھر بہن بھائی اور رشتے داروں کا ہے۔ حقوق العباد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام لوگوں کے ساتھ درجہ بدرجہ احسن سلوک رکھے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھے۔ کسی کو دکھ نہ پہنچائے۔ قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے بندوں کے اوپر جو میرے حقوق ہیں وہ معاف کر سکتا ہوں لیکن جس نے حقوق العباد پورے نہ کیے میں اسے معاف نہ کروں گا۔ حقوق العباد میں پہلے اپنے گھر والے، ماں باپ، بہن بھائی، بیوی شوہر بچے اور پھر محلے والے پھر ملک والے اور پھر تمام بنی نوع انسانی آجاتے ہیں۔

۱۶۔ روحانی انسان کا یہ مقصد ہونا چاہیے۔

www.ksars.org

ہر اک سے نیکیاں سدا بلا تمیز و نیک و بد

اسی کو ہم تو حاصل حیات کہتے آئے ہیں

۱۷۔ To show Allah that you love and care for the people he has made to live with us in this world.

۱۸۔ ایک روحانی آدمی جو کہ امن و محبت کا پیامبر ہوتا ہے سب سے پہلے اس کے ارد گرد کے لوگ اس کی اس صفت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ جوں جوں اس کا دائرہ کار بڑھتا ہے ساری خلق خدا کو اہ اللہ کا کنبہ جان کر اللہ کے واسطے سے ان سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہے۔

۱۹۔ تخلیقی قانون کے مطابق حقوق العباد کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک صلہ رحمی ایک قطع رحمی۔ صلہ رحمی تعلقات کو جوڑنا اور قطع رحمی تعلقات کو توڑنا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ''وہ لوگ اس چیز کو توڑتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کے لیے کہا ہے۔ یوں وہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ایسے لوگ خسارے میں ہیں۔''

۲۰۔ حقوق الٰہی اور حقوق العباد دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اللہ کے بعد سب سے زیادہ حق اللہ کی مخلوق کا ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ حقوق العباد سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر ۲۔ حقوق اللہ کیا ہوتے ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت میں کیا فرق ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۴۔ اللہ کی رضا کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟

☆☆☆☆☆

روحانی راستہ عام لوگوں کے راستے سے ہٹ کر ہے۔ قرآن میں بھی اللہ پاک نے لوگوں کو دو طرح سے مخاطب کیا ہے۔

ایک جگہ تو فرماتے ہیں۔ ''اے ایمان والو! دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اے لوگو! جہاں ایمان والوں کہہ کر مخاطب ہیں وہاں مراد روحانی راستوں پر چلنے والے ہیں اور جہاں صرف اے لوگو کہا گیا ہے وہاں مراد تمام بنی نوع انسانی ہیں۔ اللہ کی جانب سے جو علوم انسان کو عطا کیے گئے ہیں وہ چار درجات میں ہیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت۔ یہ چاروں درجات چار عالمین ہیں۔ ان عالمین کو عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت اور عالم لاہوت کہا گیا ہے۔ ان عالمین میں اللہ تعالیٰ کی سنت قوانین کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کی سنت میں کوئی تبدیلی یا تعطل نہیں ہے۔ ازل سے ابد تک جاری و ساری ہے۔ اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ سنت کا ہر قانون ازل سے چلتا ہے۔ ازل وہ زمانہ ہے جب اللہ پاک نے کن کہا۔ زمانہ ازل کن کا آغاز ہے۔ ہر قانون اللہ پاک کی جانب سے چلتا ہے اور ساری کائنات سے گزرتا ہوا واپس اللہ پاک کے پاس لوٹ جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہر قانون اور ہر سنت عالم لاہوت، عالم جبروت، عالم ملکوت سے ہوتی ہوئی پھر عالم ناسوت یعنی مادی دنیا میں پہنچتی ہے اور دنیا کی ہر شئے اور ہر مخلوق اس پر عمل کرتی ہے اور اس قانون کے مطابق اپنی زندگی گزارتی ہے۔ فرد کی زندگی جیسے ہی ان کے راستے سے ہٹتی ہے اسے کوئی نہ کوئی پریشانی اور تکلیف لاحق ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ہم گردش کے قانون سے دے سکتے ہیں۔ جیسے نظام شمسی میں تمام سیارے اپنے اپنے محور اور مدار پر گردشیں کرتے ہیں۔ یہ محور اور مدار چاند ستاروں کے لیے مقرر کردہ راستے ہیں۔ ان راستوں سے ہٹ کر چاند ستاروں کی گردش کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ذرا بھی ادھر اُدھر ہوئے اور سارا نظام گڑبڑ ہو جائے گا اور ایک کا اثر پورے نظام پر پڑے گا۔ اس لیے ہر سیارہ اپنے مخصوص زون میں ہی مستقل

www.ksars.org

طور پر حرکت کرتا رہتا اور ازل سے وقت کا تعین اسی طرح دن رات کے بننے سے شمار ہوتا ہے۔ ماہ وسال کا تعین بھی سالہا سال گزرنے پر ایک ہی رہتا ہے۔ کیونکہ گردش کا قانون ایک ہے۔ ایسا قانون ہے کہ جس میں کوئی ردوبدل اور تعطل نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سنت اللہ کے بنائے ہوئے وہ اٹل قوانین ہیں جن کے اوپر کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ نظام اگر ٹوٹ گیا تو کائنات تباہ ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک کی جانب سے عالمین کے نظام کو برقرار رکھنے کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ کل مخلوق میں انسان وہ ہستی ہے جسے اللہ میاں نے اپنے علوم سے نوازا ہے۔ یہ علوم ان ہی چار عالمین کے علوم ہیں جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ روحانیت ان چاروں عالمین کے قوانین وضوابط کا سیکھنا اور ان پر عمل کر کے اپنی زندگی کو پیغمبروں کے نمونے پر ڈھالنے کا نام ہے۔ روحانی علوم چونکہ روح کے علوم ہیں جس کی وجہ سے ان عالمین میں آدمی کا داخلہ روحانی طور پر ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر نہیں کیونکہ عالم ناسوت کی زندگی گزار کر جب ہم ملکوتی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارا جسمانی نظام بکھر جاتا ہے اور جسم جو کہ مٹی کے ذرات ہیں وہ روح کی روشنی سے الگ ہو کر پیوند زمین بن جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب دنیاوی زندگی گزار کر روح ملکوتی زندگی میں داخل ہوتی ہے تو ملکوتی روشنیاں لطیف ہونے کی وجہ سے مٹی کے کثیف ذرات کو اٹھا نہیں پاتی اور جسم کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ جب روح کی روشنی جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو مٹی کے ذرات بکھر جاتے ہیں کیونکہ مٹی کے ذرات کو صورت شکل دینے والی روح کی روشنی ہی ہے۔ یہ عالم ناسوت میں موت وزیست کا ایک ایسا نظام ہے جو اللہ کی سنت کے مطابق کہ ہر شئے کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ازل سے جاری وساری ہے جب سے دنیا وجود میں آتی ہے اس موقع پر ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر شہیدوں کی موت اور اولیاء اللہ وپیغمبران کی اموات پر یہ خصوصیت کس اصول پر ہے اور کن وجوہات کی بناء پر ہے کہ ان کے اجسام بکھرتے نہیں ہیں تو غور کرنے پر یہ بات بھی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے کہ سنت کا قانون تو ایک ہی ہے کہ ہر شئے پر موت ضرور آنی ہے۔

اس قانون سے باہر تو پیغمبر بھی نہیں ہیں۔ اسی قانون کی ایک شاخ یا اصول یہ ہے کہ شہیدوں کو مردہ نہ کہو۔ وہ زندہ ہیں اور اللہ کے یہاں سے رزق پا رہے ہیں تو اس اصول کے تحت آدمی ان کے اجسام کو مردہ اس لئے قرار دے دیتے

www.ksars.org

ہیں کہ ان کا رزق دنیا سے اُٹھ جاتا ہے اور اب رزق کا رخ اللہ تعالیٰ کی جانب براہ راست چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے دنیا والے انہیں زندوں میں شمار نہیں کرتے۔ کیونکہ دنیا کی زندگی اسباب و وسائل پر حرکت کر رہی ہے۔ دنیاوی اسباب و وسائل کی فراہمی کا رابطہ ٹوٹ جانے کا نام موت ہے۔ مگر عام طور سے تو یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی دنیاوی اسباب و وسائل سے رشتہ ٹوٹا آدمی مر جاتا ہے اور اس کا جسم بھی کچھ دنوں بعد مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن ان لوگوں کے اجسام اپنی اصلی حالت پر قائم رہتے ہیں۔ جن کا رزق دنیا سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے۔ ان مخصوص لوگوں کے اجسام کو اس اصول کے تحت روح کی روشنی حشر تک فیڈ کرتی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ قائم رہتے ہیں۔ اس طرح ان مخصوص لوگوں کی زندگی عالم ناسوت میں اور عالم ملکوت میں دونوں رخوں میں بیک وقت جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی زیارتوں پر حاضری دینے سے ان لوگوں کی توجہ ہوتی ہے اور حاجت مندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ گویا یہ مخصوص بندے جو اللہ کے پیارے ہیں ان کی دنیاوی زندگی بھی اللہ کے اصولوں کے مطابق بسر ہوئی ہے اور پردہ فرمانے کے بعد بھی وہ اللہ کے مشن پر کام کرتے رہتے ہیں اور اپنے ذمے اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ حقوق العباد کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔

شعور کو ہم ایک نقطے سے تعبیر کرتے ہیں۔ شعوری حواس کمزور اور ناقص ہیں۔ یہ فطری کمزوری شعور کو محتاج بناتی ہے۔ شعور کی محتاجی دور کرنے کے لیے ہر واوقت تین لاشعور اسے گھیرے رہتے ہیں۔ یہ تین لاشعور روح کی روشنیوں کے تین زون ہیں۔ ہر زون ایک عالم غیب ہے۔ جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ روح اپنی روشنیاں شعور کے نقطے میں داخل کرتی رہتی ہے اور شعور کا نقطہ روشنیاں جزب کر کے روشن ہوتا جاتا ہے۔ پھر نقطے کی روشنی ان دائروں میں پھیلتی ہے جہاں جہاں تک روشنی پہنچتی ہے، شعور ان عالمین کا مشاہدہ کرتا ہے۔ شعور کے روشنی کو جذب کرنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک جانب دنیاوی روشنیاں دوسری جانب روح کی روشنیاں جذب کرتا ہے۔ دنیاوی روشنیاں جذب کرنے سے صرف دنیاوی علوم حاصل ہوتے ہیں اور روح کی روشنیاں جذب کرنے سے روحانی علوم حاصل ہوتے ہیں۔ ان دونوں طرح کے عمل سے شعور کی

www.ksars.org

نشو نما ہوتی ہے مگر ایک رخ میں شعور کی نشو نما عالم ناسوت کی حد تک ہوتی ہے۔اس سے آگے شعور نہیں جا سکتا۔دوسرے رخ میں نشو نما شعور کی سکت کے مطابق ان چار عالمین تک ہوئی ہے۔جنہیں ہم عالم لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت کہہ چکے ہیں۔لاہوت تجلیات کا عالم ہے جو ذات کی تجلی ہے۔یہ عالم معرفت ذات کے علوم حاصل کرنے کا شعور پیدا کرنے سے روح کی آنکھ سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔دوسرا جبروت تجلی صفات کا عالم ہے جو معرفت صفات کے شعور کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔عالم ملکوت یہ قلب کے شعور سے حاصل ہوتا ہے اور عالم ناسوت مادی شعور کے ذریعے سے۔ہر عالم میں انسان کے اوپر وہی قوانین لاگو ہوتے ہیں جو اس عالم میں جاری وساری ہیں۔عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے درمیان جو سنت الٰہیہ کے قوانین کام کر رہے ہیں وہ شریعت کہلاتے ہیں۔عالم ملکوت اور عالم جبروت کے درمیان جو سنت الٰہیہ کے قوانین جاری و ساری ہیں وہ طریقت کہلاتے ہیں اور عالم جبروت اور عالم ملکوت کے درمیان جو سنت الٰہیہ کے قوانین کام کرتے ہیں وہ حقیقت کہلاتے ہیں۔حقیقت کو پہچاننے کے بعد بندہ جب اللہ کی ذات کے ساتھ قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر اسے اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ کی بقا کے ساتھ اسے بقا حاصل ہو جاتی ہے۔یہ علوم کا وہ دائرہ ہے جس میں ایک روحانی شعور اپنی نشو نما حاصل کرتا ہے یہی وہ علوم ہیں جو بطور ورثہ آدم کی جانب سے اس کی اولاد کو تقسیم ہو رہے ہیں۔قرآن نے حقوق العباد کے لیے نہایت ہی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ ماں باپ بھائی بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں۔یتیموں، بیواؤں، پڑوسیوں غرضیکہ ہر ایک کے ساتھ قران نے بہتر سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔آدمی کے شعور کا نقطہ جیسے جیسے پھیلتا جاتا ہے،اس کی روشنی قرآن کے جس جس اصول کے اوپر پڑتی ہے وہ اس کو اپناتا جاتا ہے۔جیسے ایک آدمی حقوق العباد کی فکر کے ساتھ جب اپنے ماحول پر نظر کرتا ہے تو اس کی نظر صرف ماں باپ کو دیکھتی ہے۔بھائی بہن کو دیکھتی ہے مگر بیوی بچوں پر فکر کی روشنی نہیں پڑتی۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ماں باپ، بھائی بہنوں کے ساتھ تو اچھا سلوک کرتا ہے اپنی سمجھ کے مطابق۔ مگر بیوی بچوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ان کے نان نفقے کا خیال نہیں کرتا۔ان کے آرام کی جانب سے غفلت برتتا ہے۔ان کی تربیت سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔غرضیکہ ان کی کوئی تنگی و تکلیف اسے دکھائی نہیں دیتی۔اسی

www.ksars.org

طرح ایک آدمی حقوق العباد میں اپنے گھر والوں سے بھی اچھا سلوک کرتا ہے مگر پڑوسیوں کا حق نہیں نبھاتا۔ پڑوسی اس سے نالاں رہتے ہیں۔ایک آدمی حقوق العباد میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان اور ساری مخلوق اسے اپنی طرح جاندار اور ذی روح دکھائی دیتی ہے۔وہ کسی چیونٹی کو بھی گزند پہنچانے کی نیت نہیں کرتا اور نہ ہی ایسا کوئی فعل اس سے سرزد ہوتا ہے۔ان مختلف مثالوں سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فکر کیا ہے اور سنت الٰہی کے قوانین کیا ہیں اور یہ کس طرح ہمارے اوپر لاگو ہوتے ہیں۔

ہر فکر اللہ کے علم کا ایک نقطہ ہے۔اس نقطے کو ہم اللہ کے علم کی ایک فلم کہیں گے۔فکر کا یہ نقطہ ایک تجلی ہے۔ جب یہ تجلی روح کے ذہن میں منتقل ہوتی ہے تو روح کی فکر کہلاتی ہے۔روح اس فکر کا ایک نام رکھتی ہے۔یہ نام وہی ہوتا ہے جو اللہ کے کلام میں ہے۔اب ہم روح کی ایک فکر کی جانب آتے ہیں۔اس فکر کا نام حقوق العباد ہے۔فکر کی یہ تجلی روح کے ذریعے سے شعور کے اندر منتقل ہو جاتی ہے۔تجلی کی روشنی شعور میں اس کی سکت کے مطابق جزب ہوتی ہے۔اسی مناسبت سے شعور اس فکر کی روشنی میں اس عالم کا مشاہدہ کرتا ہے اور شعوری طور پر اس فکر پر عمل کرتا ہے۔روحانی راستوں پر کوشش یہی کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ روح کی روشنی کو جذب کیا جائے۔اوپر کی مثالوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ روح کی روشنیوں کے ضائع ہونے سے شعور کو کیسی کیسی پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ اللہ کے حکم کو صحیح طور پر سمجھنے اور عمل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ایک پیغمبر جب اللہ کی فکر کو پہچان کر اپنے شعوری ارادے کے ساتھ اس پر عمل کرتا ہے تو اسے ہر حال میں رضائے الٰہی اور تائید غیبی حاصل ہوتی ہے۔اس عمل عالمین کی وسعتوں میں پھیل جاتا ہے۔ساری کائنات اسے ایک شہر لگتی ہے اور ساری مخلوق ایک کنبہ۔وہ سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے۔اس کے نزدیک اپنا بیٹا اور کسی دوسرے کا بیٹا دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔اگر وہ اپنے بیٹے کے لیے جان دے سکتا ہے تو کسی دوسرے کے بیٹے کے لیے بھی جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ یاد کیجئے۔طوفان

www.ksars.org

نوح علیہ السلام میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کو ایمان نہیں لایا تھا ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کے کہنے کے

باوجود بھی نہ مانا۔ کہنے لگا کہ میں اونچائی پر ہوں مجھے سیلاب کیسے بہائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ پاک سے کہا کہ یا اللہ میاں یہ

میرا بیٹا ہے یہ ڈوب رہا ہے اسے بچا لیجئے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ اے نوح علیہ السلام! یہ تیری آل نہیں ہے۔ اللہ پاک کے اتنا کہنے پر

وہیں چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ فرمانا اے میرے رب یہ حضرت نوح علیہ السلام میرا بیٹا ہے

اسے بچا لیجئے۔ یعنی اس کے میرے اوپر پدرانہ حقوق ہیں۔ یہ میری بات نہیں مانتا کہ کشتی میں سوار ہو جائے۔ اب اس پدرانہ حقوق کی پاس داری تیرے سپرد ہے۔ اللہ پاک نے فوراً اپنے پیغمبر کو یہ کہہ کر اس ذمہ داری سے بری کر دیا کہ اے نوح علیہ السلام یہ تیری آل نہیں ہے۔ یعنی اے نوح علیہ السلام تیرے ذمہ تیری اولاد کے جو حقوق تھے وہ ہم نے اٹھا لیے۔ اس وجہ سے کہ جس طرح باپ کے حقوق اپنے بیٹے پر ہیں۔ بیٹے کے حقوق بھی باپ پر ہیں۔ باپ اگر اپنا حق پہچانتا ہے اور بیٹا نہیں پہچانتا تو باپ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

پیغمبروں کا ہر عمل ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ان کی پوری زندگی قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے ساتھ اس کی سنت کے دائرے میں جاری وساری ہے۔ جب ہم ان کے واقعات میں غور و فکر کرتے ہیں تو اس ہمیں اللہ کی سنت کے بہت سے قوانین معلوم ہو جاتے ہیں۔ قرآن حقوق العباد کے لیے جو حکم دیتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

www.ksars.org

''تو اہل قرابت اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق دیتے رہو۔ جو لوگ رضائے الٰہی کے طالب ہیں یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور یہی لوگ نجات حاصل کرنے والے ہیں۔''(سورہ روم ۳۸)

پیغمبروں کی ہر فکر معرفت کے دائرے میں کام کرتی ہیں۔ انہیں اللہ پاک کی ذات وصفات کے علوم حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر عمل قابل تقلید ہے۔ وہ اللہ کی ذات سے قریب ہیں۔ ایک روحانی طالب علم کا شعور پیغمبروں کی فکر کی روشنی میں آہستہ آہستہ اگے بڑھتا ہے۔ اور زندگی کے متعین کردہ اصولوں کو پیغمبرانہ فکر کے ذریعے اپناتا ہے۔ جس طرح ایک پیغمبر نے اپنے قرابت داروں سے محتاجوں سے مسافروں سے سلوک روا رکھا۔ وہ بھی ان کی تقلید اور پیروی کرتا ہے۔ عام آدمی کی سوچ اس سے مختلف ہوتی ہے۔ عام آدمی پیغمبروں کی تعظیم تو ضرور کرتا ہے مگر ان کی تقلید نہیں کرتا۔ یہ میں اپنا تجربہ بیان کر رہی ہوں۔ کسی پر الزام نہیں دے رہی۔ بہت سے لوگوں سے میری روحانی مشن کے سلسلے میں ملاقات اور بات چیت ہوئی کہ روحانی علوم پیغمبروں کے علوم ہیں انہیں سیکھ کر ان پر ہم اس وقت عمل کر سکتے ہیں جب ان مقدس ہستیوں کی فکر اور ذہن ہمارے اندر بیدار ہو گا۔ تب ان کی فکر سے ہمارا رابطہ ہو گا اور ہمارے اعمال وافعال میں پاکیزگی آئے گی۔ مگر تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عام طور پر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ پیغمبروں کا طرز عمل اختیار کرنا ناممکن ہے۔ یہ سوچ کر لوگ اپنے آپ کو روحانی علوم سیکھنے سے دستبردار کر لیتے ہیں۔ کیسی بدنصیبی کی بات ہے۔ اللہ تو ہر لمحے یہ دعوت دے رہا ہے کہ اے میرے بندے تجھے میری ہی جانب آنا ہے۔ ذرا تو سوچئے ہم کوئی جرم کرتے ہیں تو اپنی ماں کے سامنے جانے سے شرماتے ہیں۔ باپ کا سامنا کرتے ڈرتے ہیں، بیوی یا شوہر سے منہ چھپاتے ہیں اور نہیں ڈرتے تو بس اللہ کے سامنے جانے سے نہیں ڈرتے۔ واہ کیا خوب سوچتے کہ جن راستوں پر چل کر اللہ کے بندے اللہ تک پہنچے ہیں۔ ہم بھی انہی راستوں پر قدم رکھیں۔ اللہ تک پہنچنے کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار راستے ہیں۔ جتنے پیغمبر اس دنیا میں آئے اتنے ہی راستے اللہ تک پہنچنے کے ہیں اور ان سے ایک بھی نہ زیادہ نہ کم۔ نہ ہی ان کے علاوہ کوئی اور ایک بھی راستہ ایسا ہے جو اللہ تک بندے کو لے کر جاتا ہے۔ ہر گز بھی نہیں۔ پھر پیغمبروں کی تقلید کے سوا آپ کے پاس اور کون سا راستہ رہ جاتا ہے اللہ تک پہنچنے کا۔ آپ برملا کہہ دیجئے کہ کوئی بھی نہیں۔ اس کے سوا نفس کے وہ اندھیرے راستے ہیں جو آدمی کو شیطان تک پہنچا دیتے ہیں۔ شیطانی راستے پر اللہ کو قہر ہے اور قہر کی وہ بھیانک صورتیں ہیں جنہیں نفس خوشنما کر کے دکھاتا

www.ksars.org

ہے۔ نفس شیطانی تاریکی کا نقطہ ہے۔ وہ ظلمت وتاریکی اور جہل کی ہر تصویر کو پسند کرتا ہے اور نفس رحمانی نور کا نقطہ ہے۔ وہ نور کی ہر شئے کو پسند کرتا ہے۔ روحانی شعور نور کے عالم کا شعور ہے۔ ایک روحانی بندہ دنیا میں رہتے ہوئے نور کے عالمین سے اپنا رابطہ جوڑ لیتا ہے اور دنیا والوں کے ساتھ عالم نور کے مروجہ قانون کے مطابق سلوک کرتا ہے، نور پاک ہے اس کے اندر نور کی پاکیزگی منتقل ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کے قانون اور سنت کے مطابق حقوق العباد ادا کرتا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

غیب کا مشاہدہ۔۔۔ایمان ہے

۱۔ اللہ پاک قرآن میں فرماتے ہیں۔ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جو متقی ہو اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لائے۔ یعنی غیب ان کے مشاہدے میں ہو۔

۲۔ روحانی علوم یہ بتاتے ہیں کہ ہم اس دنیا میں آنے سے پہلے کہیں اور تھے اور ایک دن پھر ہم کو مادی وجود کو چھوڑ کر کہیں چلے جانا ہے۔جہاں جانا ہے وہ غیب ہے۔

۳۔ ہر شئے کی حقیقت غیب میں ہے۔اس لیے غیب پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۴۔ غیب اللہ ہے۔غیب پر ایمان لانا اللہ کی جانب پہلا قدم ہے۔

۵۔ غیب وہ ہے جو سامنے نہ ہو۔ہماری مادی آنکھ ایک حد تک دیکھتی ہے جو کچھ ہمارے سامنے نہیں ہے اس کو دیکھنے سے پہلے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۶۔ ظاہر کے پس پردہ محرکات کا کھوج لگانا غیب پر ایمان لانا ہے۔

۷۔ انسان کی زندگی دو طرزوں پر مشتمل ہے۔ایک ٹھوس حواس اور ایک لطیف حواس۔لطیف حواس کا عالم غیب ہے۔

۸۔ غیب پر ایمان لانے کا مطلب ہے جو چیز ہم مادی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے اس پر ایمان لانا جیسے اپنی روح، اللہ پاک کی ہستی، فرشتے، جنات، ستاروں پر آباد دنیائیں، روز محشر اور مرنے کے بعد کی زندگی۔

www.ksars.org

۹۔ ہر وہ بات جو ہماری مادی آنکھ سے اوجھل ہے غیب ہے۔اللہ کی ہستی کو بھی ہماری مادی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔اس لئے وہ غیب ہے۔اللہ نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ مرنے کے بعد اللہ کے پاس جانا ہے اللہ حساب کتاب ہمارے اعمال کا لینے والے ہیں۔ان سب باتوں پر یقین رکھنا غیب پر ایمان لانا ہے۔

۱۰۔ غیب ایک نور ہے جو دلوں میں روشن ہے۔

۱۱۔ ایمان کی بنیاد ہی غیب پر ایمان لانا ہے۔غیب پر ایمان لانے کے لیے اپنے علم کی نفی کرنا ضروری ہے۔

۱۲۔ Allah says, "you only need to know, who I am not what I am.

۱۳۔ اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر غیب پر ایمان پختہ ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ عالم غیب کی حقیقت کا ایمان ہی ہماری روحانی قوت ہے۔

۱۵۔ سورہ بقرہ کی پہلی آیتوں کے مطابق یقین مشاہدے کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔غیب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی وہ صلاحیتیں اجاگر کرے جس کے ذریعے غیب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۶۔ علم الٰہیہ بنیاد ہے اور بنیاد غیب ہے۔

۱۷۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔"جو ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے۔"یعنی غیب ایمان والوں کے مشاہدے میں ہوتا ہے۔اسی مشاہدے کی وجہ سے وہ شک میں مبتلا نہیں ہوتے جب کہ جو لوگ ایمان میں داخل ہیں وہ یوں کہتے ہیں "ماذا اراد اللہ وھذا مثلا۔"یعنی اللہ کی کیا مراد ہے اس مثال سے یعنی وہ شک میں ہیں۔

۱۸۔ جسم ظاہر ہے اور روح پس پردہ ہے جو کہ غیب ہے۔شعور کے ساتھ لاشعور کو جو کہ روح کا شعور ہے جان لینا، دیکھ لینا ہی غیب پر ایمان لانا ہے۔روح کا عرفان حاصل ہو جانا ہی غیب پر ایمان لانا ہے۔

www.ksars.org

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ غیب کا مشاہدہ کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۲۔ یقین اور شک میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۳۔ علم اللدنیہ کیا ہے اس کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

سوال نمبر ۴۔ غیب پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

سوال نمبر ۵۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین میں کیا فرق ہے؟

☆☆☆☆☆

ہم ہر شئے کو حواس کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ ہمارے اندر دو قسم کے حواس کام کر رہے ہیں۔ ایک مادی حواس جو ظاہری حواس ہیں۔ جن کا آلہ کار ہمارا مادی جسم ہے مادی حواس اور جسم کے ساتھ ہم جو کچھ حاصل کرتے ہیں وہ ظاہری دنیا کے علوم ہیں۔ دوسرے حواس باطنی حواس ہیں۔ جو روح کے حواس ہیں۔ روح روح اپنے حواس کے ذریعے جو علوم حاصل کرتی ہے، یہ تمام علوم غیب کے ہیں۔ روح غیب کی مخلوق ہے۔ اب قانون یہ بنا کہ جس طرح ہمارا مادی جسم دنیا میں مصروفِ عمل ہے اسی طرح روح بھی اپنے روحانی جسم کے ساتھ غیب میں مصروفِ عمل ہے۔ آدم روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ہم مستقل طور پر ایک ہی رخ کے شعور کو استعمال کرتے رہیں گے تو دوسرا رخ حواس سے چھپ جائے گا۔ جو لوگ اپنے آپ کو دنیا میں اس قدر ملوث کر لیتے ہیں کہ انہیں لاشعور کی جانب تفکر کرنے کا موقع نہیں ملتا وہ غیب سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتے۔ کسی چیز کو جاننے سے پہلے اس پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس یقین کی وجہ سے دل میں اس شئے کو جاننے کی جستجو پیدا ہوتی

www.ksars.org

ہے۔ یہی جستجو انسان کو قدم قدم چلا کر مطلوبہ شئے تک پہنچا دیتی ہے۔ ہمارے پاس جو علوم بھی آئے ہیں وہ پیغمبروں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں۔ پیغمبروں کے پاس اللہ کے علوم جس ذریعے ہم تک پہنچے ہیں، وہ ذریعہ وحی ہے۔ وحی اللہ کے ساتھ کلام کرنا ہے۔ بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو جو علوم عطا کیے وہ علم حاصل کرنے کا براہ راست طریقہ ہے۔ جو صرف پیغمبروں سے مخصوص ہے۔ سورہ جن کی آیت ۲۶ میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''اللہ غیب کو جاننے والا ہے۔ پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرمالیا ہو۔ (غیب کی تعلیم کے لیے) تو مقدر کر دیتا ہے اس رسول کے اگے اور اس کے پیچھے محافظ تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں۔''

ان آیتوں سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں کو غیب کے علوم عطا فرمائے۔ وحی لانے والا فرشتہ جبرئیل علیہ السلام ہے۔ جبرئیل علیہ السلام کا کام صرف وحی کی روشنیوں کا شعور میں منتقل کر دینا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی کے معنی سے آگاہ نہیں ہیں۔ نہ ہی وہ اللہ کے کلام کی حقیقت اور اس کے رموز سے واقف ہیں۔ اس کی مثال یوں ہے۔ جیسے اپ کا دوست آپ کو وڈیو فلم دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ وڈیو فلم فلاں نے اپ تک پہنچانے کو دی تھی یونی لانے والا اس وڈیو فلم کے اندر علوم سے آشنا نہیں ہے۔ وہ یہ وڈیو آپ کو دے کر چلا جاتا ہے۔ اب آپ اس وڈیو کو اپنے سیٹ پر چلا کر دیکھتے ہیں اور اس کے اندر کی فلم سے واقف ہو جاتے ہیں۔ آپ کا دوست آپ تک صرف یہ فلم پہنچانے کا ذریعہ بنا۔ اسی طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی پیغمبر تک اللہ پاک کے علوم پہنچانے والے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بشری حواس اور فرشتے کے حواس میں فرق ہے۔ بشری حواس فرشتے کے حواس سے افضل ہیں۔ اس وقت ہمارا منشاء روحانی حواس سے ہے۔ فرشتے کے حواس وحی کے علوم کو سمجھنے سے قاصر ہیں جب کہ پیغمبر کا شعور وحی کے ساتھ انوار کو الفاظ و معنی میں ڈھال دیتا ہے۔ کائنات کا نظام نہایت ہی منظم قوانین پر قائم ہے۔ ان قوانین میں کوئی ردو بدل نہیں ہے۔ عالم ناسوت یا مادی دنیا کا یہ قانون ہے کہ یہاں کوئی چیز وسیلے کے بغیر نہیں ہے۔ اسی لیے اس عالم کو عالم اسباب بھی کہا جاتا ہے۔ اسی قانون کے تحت پیغمبر کے پاس وحی لانے کا سبب ایک فرشتہ بنا۔ اللہ کے

www.ksars.org

قانون سے عام ہو یا خاص کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔اس کے علاوہ وحی کے لیے خاص بندوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو وحی کے متحمل ہو سکیں۔اس کے لیے بچپن ہی سے پیغمبروں کی خصوصی تربیت و نگہداشت کی گئی۔ان کے دل میں وحدانیت کا تصور قائم کیا گیا جب کہ تقریباً سارے ہی پیغمبر کافروں کے درمیان پیدا ہوئے۔ وحدانیت کا تصور ذہن کے تمام خیالات کو ایک نقطے پر لا کر جمع کر دیتا ہے۔اس طرح آدمی کو ملنے والی انرجی کم سے کم خرچ ہوتی ہے۔ذہنی انتشار خیالات کی یلغار سے پیدا ہوتا ہے۔ذہنی خیالات کو قبول کرنے اور رد کرنے میں دماغ کی ساری قوتوں کو خرچ کر دیتا ہے۔یہاں تک کہ عملی حرکت کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا اور وہ غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔پیغمبر کی طرزِ فکر وحدانیت پر قائم ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے ان کا ذہن اپنے کیالات کو اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے تصور کے ایک نقطے پر ٹھہرانے کا عادی ہو گیا پھر چونکہ یہ تصور خالق کا تھا، خالق تمام کائنات کو قوت بخشنے والا ہے۔چنانچہ ذہن کی مرکزیت کی وجہ سے ان کے تصور کی فکر کا نقطہ کے اندر انوار و تجلیات کا ذخیرہ ہو گیا اور ان انوار و تجلیات نے تمام مادی روشنیوں کو نگل لیا۔بالکل اسی طرح جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدھا بن کر جادوگروں کے تمام سانپوں کو نگل لیا اور ان پر غیب کے دروازے کھل گئے۔اللہ کا نور ان کے حواس میں داخل ہو کر روحانی حواس کو متحرک کرنے کا باعث بنا اور روحانی حواس نے غیب کا مشاہدہ کر لیا۔

غیب میں جو کچھ ہے جب اللہ نے پیغمبروں کو اس کا مشاہدہ کروایا تو پیغمبروں کے ذریعے غیب کی خبروں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔قانون یہ بنا کہ اللہ کا نور جب قلب کے اندر ذخیرہ ہو جاتا ہے تو یہ نور قلب کی آنکھ بن جاتا ہے اور قلب کی آنکھ غیب میں دیکھتی ہے۔ایمان اور غیب لازم و ملزوم ہے۔ایمان نور ہے جو قلب میں جاگزیں ہے۔یہ نور خود ہی ادراک بھی بنتا ہے اور خود ہی غیب بھی ہے۔جس طرح اسکرین پر پڑنے والی فلم کی روشنی کے اندر فلم کی تصاویر بھی ہوتی ہیں اور یہی روشنی ان تصاویر کو دکھانے کا باعث بھی بنتی ہے۔قلب کا نور قلب کا ادراک بھی بنتا ہے اور قلب کے اسکرین پر غیب کے نورانی خاکے بھی نشر کرتا ہے۔یہی قلب کی نظر کا دیکھنا ہے۔ قلب کی نظر کا نام یقین ہے۔اگر غیب پر ایمان نہ لائیں تو مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔کوئی

www.ksars.org

روحانی علوم حاصل کرنے والا اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ اس کے اندر روح متحرک ہے۔ یہی یقین اس کے حواس میں داخل ہو کر اس کی روح سے اسے قریب کر دیتا ہے اور روح کے ذریعے اللہ پاک تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ میں نے اللہ کو اپنی ناامیدوں اور امیدوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ ہر آدمی کبھی نہ کبھی ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے جہاں باوجود انتہائی کوششوں کے اس کا کام رک جاتا ہے۔ اس کی ناامیدی اس کے اندر ایک خالق کا تصور ابھارتا ہے اور اسے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کام کرنے والی انرجی کا مخزن اللہ کی ہستی ہے۔ ایسے ہی اسے غیب پر پورا پورا یقین آجاتا ہے وہ اچھی طرح پہچان جاتا ہے کہ اس کے شعور و ارادے پر مکمل طور پر خالق کے ارادے و قوت کا کنٹرول ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انسان کی ہٹ دھرمی اور جھوٹی انا کا تقاضہ ہے جو اسے اللہ اور غیب پر ایمان لانے کے اظہار پر روکتا ہے۔ ورنہ دل تو کسی نہ کسی موڑ پر ضرور کہہ اٹھتا ہے کہ میری ذات سمندر کی لہروں پر تنکے کے مانند ہے جس کی اپنی کوئی قوت نہیں ہے۔

ایسی صورت میں جہاں مادی حواس دم توڑ دیتے ہیں وہیں باطنی حواس کا سراغ ملتا ہے۔ یہ حواس آدمی کو غیب سے روشناس کر دیتے ہیں۔ غیب کی خبریں ہمارے پاس دو طرح سے ملتی ہیں۔ ایک طرز میں تو پیغمبروں کا لایا ہوا علم غیب ہے۔ دوسری طرز میں استدراج کے وہ علوم ہیں جو شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہیں۔ پیغمبروں کے لائے ہوئے تمام علوم رحمانی انسپائریشن ہیں۔ اس انسپائریشن کو قبول کر کے کوئی بندہ رحمانی صفات اور قوتوں کا حامل ہو جاتا ہے اس کے اندر انوار جذب ہو جاتے ہیں اور یہی انوار اس کے حواس بنتے ہیں جن کے ذریعے وہ غیب میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے سفر کرتا ہے۔ اس سفر میں رحمان کی جانب سے اسے پوری پوری ہوتی ہے۔ وہ لامحدودیت میں خود کو اجنبی اور تنہا محسوس نہیں کرتا۔ اس کے برخلاف استدراج چونکہ شیطانی قوتوں کی انسپائریشن ہے۔ یہ تمام انسائریشن غیب کی جھوٹی خبریں ہیں۔ ایسی خبریں جو شریر مبنی ہے۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کسی لڑکے کو لڑکی کے کپڑے پہنا کر آپ کے سامنے کر دے۔ ظاہر کی نظر اسے دیکھ کر ضرور دھوکا کھا جائے گی اور آپ اسے لڑکی کہہ اٹھیں گے۔ اگر آپ کہ پہلے سے علم ہو کہ یہ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے تو آپ اس کے ظاہری حلیے کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیں گے

www.ksars.org

یعنی آپ نے ظاہر کی نفی کر دی اور وہ علم جو ظاہر کے پردے میں ہے اس علم کو قبول کر لیا اس طرح اصل ذات کی پہچان ہو گئی۔ اس سے دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ اصل ذات حقیقت ہے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اصل ذات کو یا حقیقت کو پہچاننے کا سب سے بڑا سبب علم ہے۔ وہ علم جو باطن کے اندر ہے یا ظاہر کے پس پردہ موجود ہے۔ باطنی علم در حقیقت ذات اور اس کی صفات سے تعلق رکھتا ہے اور اصل ذات اور اصل ذات کی صفات لا تغیر ہے۔ استدراج میں آدمی شیطانی انسپائریشن کو قبول کرتا ہے۔ شیطانی انسپائریشن شر پسند جنات اور اعراف کی تخریب پسند روحوں کے خیالات ہیں جو آدمی کا دماغ وصول کر لیتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن ہمیں یہ اطلاع ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ شیطانوں کا داخلہ آسمانوں میں ممنوع ہے اور اگر وہ آسمان میں داخل ہونے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو انہیں شہاب ثاقب کے ذریعے جو کہ فرشتوں کی فوج ہے، مار گرادیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ شیطانوں اور تخریب پسند روحوں کا دائرہ عمل محدود ہے۔ وہ صرف عالم ناسوت کی حد میں اپنی زندگی گزارتی ہیں اس سے اوپر نہیں جاسکتی۔ عالم ناسوت مادی حدود ہے جو محدودیت کا شعور ہے۔ اس حدود میں جب کوئی اطلاعات پہنچتی ہیں تو ان اطلاعات کو آدمی کا دماغ دو طرزوں میں معنی پہناتا ہے۔ ایک طرز میں پازیٹو دوسرے میں نیگٹیو۔ یہ رحمانی اور شیطانی طرزیں ہیں۔ علام ناسوت میں پہنچنے والی ہر اطلاع دو قسم کی روشنیوں پر قائم ہے۔ ایک نور دوسرا نار۔ رحمانی طرز فکر رکھنے والا بندہ نور کی مقداروں کو جذب کر کے اس نور کے اندر اطلاع کا جو خاکہ ہے وہ اپنے ذہن کے پردے پر منعکس کرتا ہے اور ذہن کی آنکھ یا قلب کی آنکھ اس خاکے کو دیکھ کر اس کے معنی پہناتی ہے۔ یہ پازیٹو خیالات ہیں جن پر عمل کرنا نیکی یا خیر کا ریکارڈ ہے۔ تخریبی طرزِ فکر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل اور دماغ کے اندر نور یا نار کی مقداریں ذخیرہ ہو جاتی ہیں اگر نور کی مقدار زیادہ ہو گئی تو یہ نور اطلاع کے اندر سے نور کو اپنی جانب کھینچ لے گا اور اگر نار کی زیادہ ہوئی تو نار کو اپنی جانب کھینچ لیا ہے۔ یہ طرزِ فکر ذہن کے سوچنے کا انداز ہے جو ان دو طرزوں میں سوچتا اور معنی پہناتا ہے۔ جب نار کی مقداریں قلب و دماغ میں زیادہ ذخیرہ ہو جاتی ہیں تو اطلاع کا شر کا رخ سامنے آجاتا ہے اور دماغ کی آنکھ اس خاکے کو دیکھ کر معنی پہناتی ہے جس کی وجہ سے

www.ksars.org

شک وسوسہ پیدا ہوتا ہے اور آدمی غیب کی حقیقت سے قطعی طور پر ناواقف رہتا ہے اور شر پسند عناصر کے قبضے میں آجاتا ہے۔ جن کا علم باطل اور محدود ہے۔ ایسی حالت بندے کے لیے بے چینی بے سکونی اور غیر تحفظی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ محرومی اس کے ہر عمل کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

ایسے عذاب سے بچنے کے لیے اللہ پاک نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہمیں غیب پر ایمان لانے کا علم اور حکم دیا ہے۔ آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کی معراج اور مشاہدات غیب میں تفکر کرنے سے ہمارا ذہن نور کو جذب کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ آدمی اگر ہر روز قرآن کی ایات میں غور و فکر کرنا اپنی عادت بنالے اور پیغمبروں کی طرزِ فکر کے متعلق غور و فکر کر کے اپنی طرز فکر کو بھی اس کے مطابق ڈھال لے تو یہ مسلسل عمل اس کے اندر قرآن اور پیغمبروں کے انوار جذب کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔ پھر اس کا ذہن اپنے پاس پہنچنے والی ہر اطلاع کو مثبت انداز میں سوچنے لگتا ہے اور ظاہر سے نظر شئے کے باطن میں پرنے لگتی ہے جس کی وجہ سے اس پر غیب کے علوم منکشف ہو جاتے ہیں اور وہ شیطانی قوتوں سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ جیسا کہ حضرت غوث پاکؓ کے تربیتی دور کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار شیطان نے انہیں بہکانے کی غرض سے اپنی استدراجی قوتوں کا سہارا لیا اور آسمان پر نور پھیل گیا۔ حضرت غوث پاکؓ نے اس نور کو دیکھا اس نور کے اندر سے آواز آئی میں تمہارا رب ہوں اور آج سے تم پر نماز قائم کرنے کی فرضیت اٹھادی جاتی ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت غوث پاکؓ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ نور اللہ کا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ نے اپنے محبوب حضور پاک ﷺ کے لیے تو یہ نہیں فرمایا کہ تم صلوۃ قائم کرنے کی اب ضرورت نہیں ہے جب کہ وہ معراج میں ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کوئی بندہ نہیں پہنچ سکتا کہ یہ حضوری کا سب سے اعلیٰ مقام ہے پھر میری کیا حیثیت ہے۔ فوراً انہوں نے لاحول پڑھی، جان گئے کہ شیطان پھر اپنے ہتکھنڈوں سے جال پھینک رہا ہے۔ آپ نے لاحول پڑھی تو رحمانی قوتوں نے آپ کو تحفظ دے دیا اور شیطان غائب ہو گیا یہ کہتے ہوئے کہ اے عبدالقادرؓ تیرے علم نے تجھے بچالیا ورنہ اس ہتھکنڈے میں میں نے بڑے بڑے صوفیوں کو پھنسا دیا اور انہیں راہ سے بھٹکا دیا۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے اور شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

www.ksars.org

اس واقعہ میں ہم سب کے لیے بہت بڑا سبق یہ ہے کہ غیب پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے اور ایمان کے ساتھ ساتھ پیغمبروں کے لائے ہوئے علوم کا جاننا بھی اشد ضروری ہے۔ کیونکہ علم ہی شیطان کے شر سے آدمی کو بچاتا ہے۔ اگر حضرت غوث پاکؓ کو قرآن کا علم نہ ہوتا تو وہ شیطان کے شر میں پھنس جاتے۔ شیطان اور تمام مخلوق پر انسان کی برتری صرف علم کی وجہ سے ہے کہ اللہ پاک نے اسے اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اسمائے الٰہیہ کے علوم اللہ پاک کی ذات اور صفات اور کائنات کے علوم ہیں۔ علم ہی کی وجہ سے انسان کی حاکمیت تمام مخلوق پر ہے۔ اگر علم نہیں ہے تو آدم بھی کائنات کی دوسری مخلوق کی طرح ناخواندہ اور محکوم ہے۔ اللہ لامحدود ہستی ہے۔ اللہ کے علوم بھی لامحدود ہیں۔ غیب میں کام کرنے والے حواس لامحدودیت کا شعور ہے۔ شعور کا عمل آنکھ ہے جب نظر غیب میں کام کرنے لگتی ہے تو غیب کے علوم حاصل ہو جاتے ہیں۔ باطنی نظر یا دل کی نظر یقین کامل ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

اللہ صبر کرنے والوں کا رفیق ہے

۱۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنے کا نام صبر ہے۔

۲۔ ہر شئے کو اللہ کی جانب سے مان کر کسی دکھ یا تکلیف میں اسی ہستی کی جانب مکمل بھروسے کے ساتھ بہتری کی توقعات وابستہ کرنے کا نام صبر ہے۔

۳۔ قرآن میں ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے یعنی اللہ پر مکمل بھروسہ اللہ کو پسند ہے اسی کا نام صبر ہے۔

۴۔ ہر تکلیف کو اللہ کے لیے برداشت کرنا اور اپنی کوشش کو جاری رکھنا صبر ہے کیونکہ صبر کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ زندگی میں پیش انے والی تکالیف کو نظر انداز کرنا صبر ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ اور رب ہے اس کی عطا کردہ نعمتوں کا جاننا اور ان پر مطمئن رہنا صبر ہے۔

۷۔ اپنے اندر وسعت پیدا کرنے کا نام صبر ہے۔

۸۔ آدمی کے صبر سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ نفس کی خواہشات پوری ہوتی عنے سے خوشی کم ہو جاتی ہے اور دل مر جاتا ہے۔ خواہش پوری نہ ہونے پر خوش رہنا صبر ہے۔

۹۔ عزیز ترین شئے کھو جانے اور نامساعد حالات میں بھی غم کو پاس نہ آنے دینے کا نام صبر ہے۔

www.ksars.org

۱۰۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا وہی محسن ہے۔ محسن یعنی احسان پر فائز ہونے والا اللہ کے قریب ہوتا ہے اور ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صبر سے مراد یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

۱۱۔ ایک روحانی آدمی کا اللہ کی مشیت کو جانتے ہوئے اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا صبر ہے۔

۱۲۔ اللہ پاک اپنے قرآن میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور صبر کرنے والوں کی نشانی یہ ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت اتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے اور وہ اس بات سے بھی واقف ہیں کہ اللہ پاک کسی پر اس کی سکت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔

۱۳۔ صبر کرنے کی صلاحیت آدمی کو مضبوط اور باہمت بناتی ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! ہر حال میں صبر اور شکر کرو۔ اللہ ہر حال میں صبر اور شکر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۱۴۔ صبر وہ صلاحیت ہے جو انسان کے اندر فرمانبرداری اور تابعداری کی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے۔ صبر کرنے والے کے اندر اللہ پر بھروسہ اور یقین زیادہ ہوتا ہے اور وہ اللہ کی رضا میں راضی رہنا سیکھ لیتا ہے۔ کسی سے تکرار یا بحث نہیں کرتا۔

۱۵۔ اللہ پاک صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ آل محمد ﷺ نے عملی طور پر صبر کا مظاہرہ کیا یعنی کربلا کے مقام پر تقریباً ساری آل نے شہادت کا جام نوش کیا۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے یعنی صبر کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔

۱۶۔ By being patient your reward will always be greater from Allah.

۱۷۔ جو اللہ کی رضا میں صبر کرتے ہیں وہی فلاح پانے والے یعنی قرب خداوندی حاصل کرنے والے ہیں۔

www.ksars.org

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ صبر کیا ہے؟اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے،اس کا مفہوم بیان کریں۔

سوال نمبر ۲۔ صبر کے فوائد کیا ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟

سوال نمبر ۴۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں صبر اور صلوۃ کے ساتھ اللہ سے مدد مانگو۔اس کی حکمت بیان کریں۔

☆☆☆☆☆

صبر ایک ایسی صلاحیت ہے جسے ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ دنیاوی زندگی ٹائم اینڈ اسپیس میں بند ہے اور دنیا کی ہر خواہش اور ضرورت پورا ہونے کے لیے وقت درکار ہے۔ہر شخص اس قانون سے آگاہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کاموں کے لیے انتظار بھی کرلیتا ہے۔اس طرح ہم صبر کرنے کی صلاحیت کو مستقل طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں مگر یہ ہمارا ایک ایسا روٹین ہے کہ ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہمارے انتظار کا وقفہ طویل ہو جاتا ہے۔اس طوالت کی وجہ سے ہمارے اندر موجود صبر کی صلاحیت گھٹنے لگتی ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حیثیت ایک مشین کی سی ہے۔یہ اللہ میاں کی بنائی ہوئی ایک مشین ہے۔اس مشین کی حرکت کے لیے جو انرجی استعمال ہوتی ہے وہ انرجی اسمائے الٰہیہ کی روشنیاں ہیں۔اسمائے الٰہیہ اللہ پاک کی صفات ہیں۔اسمائے الٰہیہ کی تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار روشنیاں ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہماری ہر صلاحیت کسی نہ کسی اسمائے الٰہیہ کی روشنی ہے۔ جب ہم اسے استعمال کرتے ہیں تو ہمیں اس کی صفت سے آگاہی ہوتی ہے۔ مثلاً جب کسی تکلیف پر صبر کرتے ہیں تو صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا شعور مسلسل کسی ایک فکر پر کام کر رہا ہے۔ ہماری تمام توجہ اس فکر میں شامل ہو جاتی ہے۔ فکر کا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے یعنی فکر کی روشنی ٹائم اینڈ اسپیس میں سفر کرتی ہوئی اس مقام تک

www.ksars.org

پہنچتی ہے جہاں حاصل فکر موجود ہے۔ فکر کی روشنی جب تک سفر کرتی رہتی ہے سفر کے لیے اسے انرجی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ انرجی اسمائے الٰہی کی روشنی ہے۔ ہم جیسے جیسے اسمائے الٰہی کی روشنی استعمال کرتے جاتے ہیں ویسے ویسے ہماری فکر ٹائم اینڈ اسپیس کا سفر کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصود کو پہنچ جاتی ہے اور ذہن اس فکر کے اندر روشنی کے علوم حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی قانون کے تحت ہر شئے دو رخوں پر کام کر رہی ہے۔ اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہم اپنی فکر کے سفر کو بھی دو رخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ذہن کی فکر خیال ہے۔ ہر خیال محرک ہے۔ خیال کی حرکت دو طرح سے ہوتی ہے ایک رخ میں خیال کی حرکت ظاہری طور پر ہوتی ہے یعنی جسمانی طور پر۔ ذہن کا خیال جسمانی اعضاء کو حرکت دے کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے اس طرح جو بھی حرکت ہوتی ہے وہ ٹائم اینڈ اسپیس کی حد کے اندر ہوتی ہے۔ دوسری حرکت جو ظاہری حرکت کے پس پردہ بیک وقت عمل میں اتی ہے وہ حرکت اس روشنیوں کے جسم کی حرکت ہے جسے ہم جسم مثالی کہتے ہیں۔ جسم مثالی عالم اعراف کا جسم ہے۔ یہ جسم مادی جسم کی نسبت لطیف ہے۔ لطیف ہونے کی وجہ سے اس کی حرکت مادی جسم کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ ہے یعنی روشنی کی رفتار پر یہ جسم کام کرتا ہے۔ ذہن کا ہر خیال ٹائم اینڈ اسپیس کی ایک یونٹ ہے۔ اس یونٹ کے اندر اس یونٹ یا لمحے کے علوم بند ہیں۔ یونٹ یا لمحہ اللہ تعالیٰ کے کن کہنے کے بعد کے ظہورات ہیں۔ کن کے بعد ظہورات لامحدودیت کا لمحہ ہے۔ آدمی یا روح کا شعور اس لمحے کو قدم قدم چل کر طے کرتا ہے۔ روح کا ہر قدم لمحہ کن کی ایک یونٹ ہے۔ اسی یونٹ کے علوم اور ادراک خیال کی صورت میں آدمی کے دماغ پر وارد ہوتے ہیں۔ خیال کے مدارج واہمہ، خیال، تصور اور مظہر روح کے ادراک کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ہم اپنے اندر کام کرنے والے ادراک کی یہ مختلف حالتیں اور ان کی اصول و قوانین کو پہچان لیں تو ہمارے اوپر صبر کی حقیقت بھی واضح ہو جائے گی اور عملی طور پر صبر کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

آپ سب روحانی اسکول کے طالب علم ہیں اور روحانی علوم سیکھ رہے ہیں۔ آپ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی کتاب لوح و قلم کے حوالے سے اور حضور باباجی جناب مرشد کریم کی تعلیمات کے حوالے سے اب تک اس بات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں کہ روح کے تین پرت ہیں۔ تجلی، نور اور روشنی۔ گویا روح تین اجسام کا مجموعہ ہے۔ تجلی، نور اور روشنی۔ یہ تینوں پرت اپنی اپنی جگہ ایک مکمل جسم ہے۔ اس کے بعد چوتھا جسم روح کا ظاہری جسم ہے جو ہمارا دنیاوی جسم ہے گویا

www.ksars.org

روح ایک کام کو چار جسموں کے ساتھ انجام دیتی ہے مگر یہ چاروں اجسام اس طرح ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے آدمی کے جسم کے اندر دل بھی ہے، جگر بھی ہے، معدہ بھی ہے، آنتیں بھی ہیں، پھیپڑے بھی ہیں، ان سب کے مجموعے کا نام آدمی ہے۔

کوئی ایک بھی حصے کو نکال دیا جائے تو جسم ناکارہ ہو جائے گا یا معذور ہو جائے گا۔ یہی مثال روح کی ہے۔ روح تجلی، نور، روشنی اور نسمہ چاروں سے مل کر بنی ہے۔ کوئی ایک دائرہ بھی حذف ہو جائے تو اس عالم سے روح کا وجود مٹ جائے گا۔ خیال کے مدارج بھی انہی چار عالمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ واہمہ خیال کا وہ ادراک ہے جو روح کا تجلی کا جسم محسوس کرتا یا جانتا ہے۔ خیال وہ ادراک ہے جو روح کا نوری جسم محسوس کرتا اور پہچانتا ہے۔ تصور وہ ادراک ہے جو روح کا نوری جسم محسوس کرتا ہے۔ مظہر خیال کا وہ ادراک ہے جو مادی جسم محسوس کرتا ہے۔ یہ چاروں ادراک روح کے شعوری حواس ہیں۔ روح کے شعوری حواس کی لہریں ان چاروں پرتوں سے گزرتی ہیں۔ جس جس جسم سے گزرتی ہیں وہ جسم اپنے شعوری حواس کے ذریعے ان لہروں کو محسوس کر لیتا ہے اور ان لہروں کا علم جان لیتا ہے۔ روح کے ادراک کی لہریں زمانہ ازل یا کن کے بعد کے ظہورات کی ایک یونٹ ہے۔ ہمارا شعور روح کے ادراک یا ازلی شعور کے علوم کو حاصل کرتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کن کہا تو کائنات کے علوم کا مظاہرہ چار عالمین میں یا چار دائروں میں عمل میں آیا۔ ایک دائرہ جو سب سے پہلا ہے وہ تجلی کا علم ہے۔ دوسرا نور کا ہے۔ تیسرا روشنی کا ہے۔ چوتھا نسمہ کا ہے۔ نسمہ کا یہی ایک رخ مادی دنیا ہے۔ ہمارا مادی جسم نسمہ کا جسم ہے۔ یہاں سے حرکت کی لہریں پھر واپس پلٹتی ہیں اور ان ہی عالمین میں سے گزرتی ہیں جہاں سے نیچے ائی تھیں۔ کن اللہ کا امر ہے۔ اللہ لا محدود ہستی ہے۔ اللہ کا امر اللہ کا ارادہ ہے جس کی اسپیڈ بھی لا محدود ہے۔ اس لا محدودیت کو تجلی کہا گیا ہے۔ روح اامر ربی ہونے کی حیثیت سے عالم تجلی سے یا اللہ کے امر اور ارادے سے منسلک ہے۔ روح کا لا محدودیت سے رابطہ روح کے تجلی کے پرت یا جسم کے ساتھ ہے۔ خیال کا آغاز اس پرت سے ہوتا ہے یعنی لمحہ کن کا ادراک تجلی کے نقطے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نقطے میں ازل سے لے کر ابد تک یا کن سے لے کر فیکون تک کے علوم بند ہیں۔ سب سے پہلے ان علوم کو روح کا تجلی کا پرت حاصل کرتا ہے پھر یہ علوم روح کے دوسرے پرت یعنی نور میں آتے ہیں۔ پھر روشنی میں اور پھر نسمہ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ہمارا شعور ان کا ادراک واہمہ، خیال، تصور

www.ksars.org

اور احساس کے ذریعے کرتا ہے۔ لامحودیت سے محدودیت میں آنے والی روشنی اپنی اسپیڈ کو بتدریج کم کرتی جاتی ہے پھر مظہر بننے کے بعد اپنی اسپیڈ کو بتدریج بڑھاتی جاتی ہے۔ کن کے کے لمحات کی روشنی کا یہ پروسس آدمی کے یا روح کے حواس کے دائروں کے اندر عمل میں آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے لاشعوری اور شعوری حواس کے ذریعے ان کے علوم کو پہچانتا ہے۔

صبر اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہنے اور اس کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ اللہ کی رضا سے شعور اس لئے بے خبر رہتا ہے کہ اس کو اپنے کام کے پردے میں چھپی ہوئی حکمت دکھائی نہیں دیتی۔ حکمت اللہ کا امر ہے۔ ہماری آنکھ ظاہری حرکت کو دیکھتی ہے اور ذہن اس ظاہری حرکات کی نوعیت کو جانتا ہے۔ مگر ان ظاہری حرکات کے پردے میں اللہ کے ارادے کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کی حرکت اور جسمانی حرکات کو اپنی عقل کے مطابق معنی پہنا دیتا ہے اور اس معنی و مفہوم کی کیفیات حواس کے ذریعے محسوس کرتا ہے۔ رنج، غم، پریشانی، دکھ وغیرہ حواس کے دائرے میں روشنیوں کے انجماد سے پیدا ہوتی ہیں۔ روشنیاں جب حواس کے دائرے سے گزرتی رہتی ہیں تو دماغ پر دباؤ نہیں پڑتا۔ آدمی پر سکون اور خوش رہتا ہے۔ حواس کے دائرے میں آنے والی ہر روشنی اپنے اندر علم رکھتی ہے۔ یہی علم خیال کی صورت میں دماغ پر وارد ہوا ہے۔ کسی خیال کا زہن میں اٹک جانے کا مطلب یہ ہے کہ حواس کے دائرے میں خیال کی روشنی کا ٹھہراؤ آگیا ہے۔ جس طرح پانی بہتا رہے تو صاف رہتا ہے۔ ٹھہر جائے تو گندا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روشنیاں بھی بہتی رہیں تو ایک تسلسل رہتا ہے۔ جب ٹھہر جائیں تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ذہن پر بوجھ پڑتا ہے۔ اس بوجھ کو ہٹانے کے لیے اور روشنیوں کا بہاؤ دوبارہ نارمل ہونے کے لیے اللہ پاک نے انسان کو صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب آدمی پر کوئی مصیبت اتی ہے اور باوجود کوشش کے اس سے دور نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خیال کی روشنی ایسی جگہ ٹھہری ہوئی ہے جہاں پر اس کی سکت کام نہیں کر رہی ہے۔ ایسے ہی مقام پر انسان اپنے آپ کو بے باس اور مجبور دیکھتا ہے اور اسے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غیب میں کوئی قوت ایسی ہے جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کی باگ دوڑ ہے اور وہ اس قوت کے آگے جھک جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی مقام پر بندہ اپنے رب کو پہچانتا ہے اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ پر سکون اور محفوظ رہے۔ اللہ اپنی مخلوق سے بے انتہا محبت

www.ksars.org

کرتا ہے وہ کسی طور نہیں چاہتا کہ بندہ پریشانی یا رنج و غم میں مبتلا ہو۔ مگر خیال کی روشنی جب تک اپنے پروسس میں ہوتی ہے آدمی کے اوپر غم اور خوشی دونوں کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ان کیفیات کو بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ روشنیوں کے بہاؤ میں تبدیلی کی جائے۔روشنیوں کے بہاؤ میں تبدیلی دو طرح سے ہو سکتی ہے۔ایک تو روشنیوں کی اسپیڈ بڑھائی جائے دوسرے گردش کا رخ تبدیل کیا جائے۔پس اس عمل کے لیے وقت درکار ہے۔کیونکہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے جہاں ٹائم اینڈ اسپیس کے حواس ہم پر غالب ہیں ہر کام اپنے وقت میں ہوتا ہے۔اسی لیے اللہ پاک نے صبر کی تلقین کی ہے۔ایک روحانی شخصیت کو فطرت کے اصولوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔کائنات کی ہر شئے ہر فرد فطرت کے اصولوں پر حرکت کر رہا ہے۔انسان کے اندر خیال کی روشنی بھی فطرت کے اصولوں پر حرکت اور عمل کرتی ہے۔حرکت زندگی ہے اور ٹھہراؤ موت ہے۔زندگی کا لمحہ خوشی کا تاثر دیتا ہے جب کہ موت کا لمحہ غم کا تاثر دیتا ہے۔ہمارے اندر روشنیوں کے بہاؤ کا سرکل چلتا رہے تو ہم خوش اور پُر سکون رہتے ہیں۔غم کا وقت بھی تیزی سے گزر جاتا ہے مگر بہاؤ رک جائے تو غم کا وقت سالوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ایک لمحہ جب فنا ہو جاتا ہے تو دوسرا جنم لیتا ہے۔ایک خیال جب گزر جاتا ہے تو دوسرا خیال آجاتا ہے۔فنائیت کا احساس غم کی کیفیت ہے کیونکہ خیال کی روشنی جب حواس کے دائرے سے نکل جاتی ہے تو دوسری روشنی آنے کے درمیان کا وقفہ روشنی سے محرومی کا وقفہ

ہے۔ہر خیال کی روشنی ایک لہر ہے جس کے اندر روشنی کی متعین مقداریں موجود ہیں۔حواس کے دائرے میں جب روشنی منتقل ہوتی ہے تو اس روشنی سے روح کا جسم کام کرتا ہے۔روح کا ادراک ہی وہ روشنی ہے جو خیال کی صورت بنتی ہے۔ادراک کی وہ تصویر جو روح کے ذہن میں بنتی ہے وہ واہمہ کہلاتا ہے۔ادراک ادراک کی جو تصویر واہمہ کے بعد روح کے ذہن کے پردے پر بنتی ہے وہ خیال کہلاتا ہے۔اس کے بعد تصور اور مظہر کی صورت میں روح کا ادراک اپنے آپ کو ظاہر کر دیتا ہے۔روح کی نظر جس پردے پر تصویر کو دیکھتی ہے اس کے علوم اسے حاصل ہو جاتے ہیں۔روح کی نگاہ بیک وقت تجلی، نور، روشنی اور نسمہ میں کام کرتی ہے مگر مادی آنکھ صرف ظاہری صورت ہی دیکھ سکتی ہے جس کی وجہ سے نظر یا روشنی کا سرکل پورا نہیں ہوتا اور حواس پر دباؤ پڑتا ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔اس

www.ksars.org

کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب کسی مشکل وقت میں صبر کرتا ہے تو حواس کے دائرے میں رکی ہوئی روشنیوں میں اللہ کا نور شامل ہو جاتا ہے اور رکا ہوا بہاؤ پھر حرکت مین آجاتا ہے۔

صبر کی تعریف یہ ہے کہ مشکل وقت میں اللہ کی مدد کا انتظار کرے اور اس انتظار میں اللہ سے جھگڑا نہ کرے۔ اللہ سے شکایت کرنا اور اپنے رنج و غم میں اس کا شاکی ہونا اللہ سے جھگڑا کرنا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے غم میں رو رو کر آنکھیں گنوادیں۔ قرآن میں درج ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کہا کرتے تھے کیا آپ یوسف علیہ السلام کے غم میں اپنے اپ کو ہلاک کر دیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کہتے میں کوئی شکوہ نہیں کر رہا، تقدیر میں جو کچھ ہے میں اس پر راضی ہوں۔ مطلب یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بچھرنے کا حضرت یعقوب علیہ السلام کو انتہائی صدمہ اور رنج تھا۔ اس رنج کی وجہ سے وہ روتے تھے کہ جدائی برداشت نہ ہوتی تھی۔ مگر وہ اس بات سے واقف تھے کہ کاتب تقدیر نے جو لکھا ہے وہ ضرور ہو کر رہتا ہے۔ پس سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصے میں غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روح کی نظر سے جب کوئی ایسی شئے اوجھل ہو جاتی ہے جس میں اس کا پورا پورا انہماک ہوتا ہے تو یہ انہماک نگاہ کا تجسس بن جاتا ہے اور نگاہ اس شئے کو تلاش کرتی رہتی ہے۔ پھر جب تک اس شئے کو دوبارہ پا نہیں لیتی اسے چین نہیں آتا۔ نظر جب تک تلاش میں بھٹکتی ہے اس کی روشنی خرچ ہوتی جاتی ہے۔ وہ مضمحل اور درماندہ ہو جاتی ہے۔ صبر کرنے سے اللہ کی مدد نور کی صورت میں اسے حاصل ہو جاتی ہے اور وہ مطلوب کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اے ایمان والو! صبر کرو اور صلوٰۃ کے ساتھ اللہ سے مدد چاہو۔ اللہ سے رابطہ قائم کرنے سے اللہ کی مدد بندے کو حاصل ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

UNITYاتحاد

۱۔ Unity get together and work in harmony togetherness One example of unity is people who agree on same belief of course or answer.

۲۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنااور آپس میں تفرقہ نہ ڈالنااتحاد(Unity)ہے۔

۳۔ محبت کا عملی مظاہرہ اتحاد ہے۔

۴۔ بہت سے فکروں کا کسی ایک نقطے پر جمع ہو جانا اتحاد ہے۔

۵۔ ان سے بھی کر سلوک جو ہیں تیرے بیخ کن

انداز سیکھ لے شجر سایہ دار کا

روحانیت کے نقطہ نظر سے ہر آدمی ایک زنجیر کی طرح جکڑا ہوا ہے اس لئے آپس میں ایک طرح کا روحانی رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے جو اتحاد پر زور دیتا ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑتا ہے اس پر میں اپنی رحمت نازل کرتا ہوں۔

۷۔ اتحاد کا سب سے بڑا مظاہرہ باجماعت نماز ہے۔امیر غریب گورے کالے اللہ کے حضور ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تمام مسلمان خانہ کعبہ کا طواف بھی ایک ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ عورت مرد تک کی تفریق نہیں رہتی اگر ہمارے اندر اتحاد ہو تو کوئی ہمیں شکست نہیں دے سکتا۔اس کی مثال لکریوں کے گٹھے کی سی ہے کہ جب تک ایک ساتھ بندھی ہوتی ہیں گٹھے کو توڑنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جب تک ایک ایک لکری علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہے تو آسانی سے ٹوٹ جاتی ہے۔

www.ksars.org

۸۔ آپس میں مل جل کر محبت سے رہنے کا نام اتحاد ہے۔

۹۔ صحابہ کرامؓ کے اتحاد نے ہی مسلمانوں کو عروج تک پہچایا اور اللہ کے مشن کو دور دور تک پھیلا دیا اور دوسری قوموں کو اتحاد کی وجہ سے تسخیر کیا۔

۱۰۔ Unity is to become more powerfull in what you are doing and what you want to do.

۱۱۔ Unity is to have one go to get close to Allah.

۱۲۔ Unity is listening to someone opinion and respecting them. At the same time surrendering your own to achieve a purpose.

۱۳۔ شعور کا لاشعور کی حدود میں داخل ہونا اتحاد ہے۔

۱۴۔ روح کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہونا اتحاد ہے۔

۱۵۔ کسی قوم کی کامیابی کے لیے اتحاد جروری ہے۔اتحاد سے قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے جس طرح ایک تنکے سے ضرب لگائی جائے تو چوٹ نہیں آتی مگر جب بہت سے تنکوں کو اکٹھا کر کے ضرب لگائی جائے تو چوٹ لگتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ا۔ ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو'' کا کیا مفہوم ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۲۔ اتحاد کیوں ضروری ہے اس کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ تفرقہ بازی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟

سوال نمبر ۴۔ اجتماعی زہن حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

☆☆☆☆☆

ایک دفعہ ایک خاتون میرے پاس آئیں۔ کہنے لگیں ''پریشان ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بھئی آخر کیا پریشانی ہے۔ بظاہر تو آپ ٹھیک ٹھاک لگتی ہیں۔'' کہنے لگیں۔ ''بات یہ ہے کہ میرے سات بچے ہیں۔ ماشاءاللہ سب جوان ہیں۔ لڑکیاں بھی ہیں اور لڑکے بھی ہیں۔ تعلیم بھی ہے، خوش حال بھی ہے مگر بس آپس میں طبیعتیں اور مزاج نہیں ملتے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے بات کرنا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''چلو اب جوان ہیں ان کی شادیاں کرو اور فراغت پاؤ۔'' کہنے لگی۔ ''ابھی تو میں ہوں تو میرے سامنے ہی ان کا میل نہیں ہے تو میرے بعد ان میں اتحاد کیسے ہو گا؟'' میں نے کہا۔ ''چلو خیر ہے۔ خواہ آپس میں ملیں نہ ملیں اپنی زندگی تو آرام سے گزاریں گے۔ اپنے گھر تو چین سے رہیں گے۔'' کہنے لگی۔ ''مگر اگر یہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام نہ آئے تو مجھے تو تکلیف ہو گی کیونکہ میں ان سب کی ماں ہوں۔ جس طرح ان سب کی تکلیف کو میں اپنا دکھ سمجھتی ہوں اسی طرح یہ چاہتی ہوں کہ یہ سب بھی ایک دوسرے کی تکلیف کو اپنا دکھ سمجھیں۔

خیر اس خاتون کو تو میں نے سمجھ بجھا کے رخصت کیا مگر میں غور کرنے لگی کہ ماں اپنی تخلیق اپنے ہی رنگوں سے کرنا چاہتی ہے۔ جیسا ذہن اور مزاج ماں کا ہے ویسا ہی وہ اپنی اولاد کا دیکھنا چاہتی ہے۔ اپنے بچوں کے لیے ماں ایک نقشہ تیار کرتی ہے۔ اس نقشہ سے ہٹ کر تعمیر ہو جائے تو ماں کو دکھ پہنچتا ہے۔ جب میں نے مزید اس واقعہ پر غور کیا تو یہ بات سامنے ائی کہ بچوں میں اپس میں میل جول اس لئے نہیں ہے کہ ماں کے ساتھ بچوں کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر ہر بچے کا ذہن ماں سے مل جائے تو بچوں کا آپس میں بھی سلوک ہو جائے گا کیونکہ ماں مرکزی کردار ہے تب مین سوچنے لگی کہ سب سے بڑا اتحاد تو بندے اور خالق کا ہے۔ آج کے دور میں ساری دنیا میں فساد اور خون ریزی پھیلی ہوئی ہے۔ اسلحہ

www.ksars.org

کا استعمال دشمن پر کم اور اپنوں پر زیادہ ہو رہا ہے۔ اس انتشار کی وجہ یہی دکھائی دیتی ہے کہ سب کے ذہنوں کی مرکزیت ٹوٹ گئی ہے۔ کسی نے اپنی انا کو اپنا مرکز بنالیا ہے کسی نے سونا چاندی کو اپنا مرکز مان لیا ہے۔ کسی نے اولاد کی محبت کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اس کے لیے حلال و حرام کی تمیز چھوڑ دی ہے۔ قرآن نے وہ قوتیں جو بندے کے ذہن سے اللہ کی مرکزیت کے تصور کو توڑتی ہیں انہیں طاغوت کا نام دیا ہے۔ جب بندہ اللہ کے سوا دنیاوی عیش و آرام کی چیزوں سے دل لگا لیتا ہے تو اس کے اندر خود غرضی آجاتی ہے اور خود غرضی کی وجہ سے تفرقہ پسندی آجاتی ہے۔ جسے اللہ نے کسی طور بھی پسند نہیں کیا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ تم سب ہمارے پاس سے ہی ائے ہو اور ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنے والے ہو۔ یہ انسان کی زندگی کا ایک سفر ہے کہ جو اللہ کے ذہن یا علم سے شروع ہو کر اس کے علم پر ہی ختم ہوتا ہے اس دنیا میں آدمی اپنے ارادے سے راستہ اختیار کرتا ہے۔ اگر ناپسندیدہ راستہ اختیار کرے گا تو اللہ کی بندے سے اور بندے کی اللہ سے دوری بڑھتی ہی جائے گی۔ اللہ سے دوری اللہ کا قہر ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کی قہر میں داخل ہو جائے گا۔ کہنا یہ ہے کہ ہر بندہ اس دنیا میں اللہ تک جانے کا ایک راستہ اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے ارادے سے اس پر چل پڑتا ہے تو وہ اللہ سے اسی راستے پر ملتا ہے۔ مگر ایک راستے پر خوشیاں ہیں دوسرے میں غم واندوہ ہے اور اللہ ہی خیر و شر کا مالک ہے۔ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ''دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے اور اہل کتاب نے جو اختلاف کیا تو علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا اور جو شخص اللہ کی ایتوں کو نہ مانے تو اللہ جلد حساب لینے والا۔''(سورہ آل عمران۔۱۹)

آج جو ہم دین میں بے شمار فرقہ بندیاں دیکھ رہے ہیں اس ایت کی روشنی میں آپ کو اس کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے کہ سب آپس کی ضد کی وجہ سے ہے۔ جب اپس میں ضد ہو جائے تو خود غرضی ہی پیدا ہوتی ہے اور پھر اتحاد ٹوٹ جاتا ہے پھر جس طرح گھر میں پھوٹ پرنے سے گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ قوم میں پھوٹ پرنے سے قوم باقی نہیں رہتی اور دین میں تفرقہ پڑنے سے دین خالص نہیں رہتا۔ جس طرح بچوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے تو ماں باپ کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے اور ماں باپ قصوروار گردانے جاتے ہیں۔ بندوں میں اپس میں پھوٹ پڑ جائے اور ماں باپ قصوروار گردانے جاتے ہیں۔ بندوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے تو بندوں کے ذہن اللہ سے بدگمان ہونے لگتے ہیں۔ اللہ پاک سورہ انعام میں فرماتے ہیں۔ ''جن لوگوں نے اپنے دین میں بہت سے راستے نکالے اور کئی کئی فرقے ہو گئے ان سے

www.ksars.org

تم کو کچھ کام نہیں۔ان کا کام خدا کے حوالے پھر جو جو کچھ وہ کرتے رہتے ہیں وہ ان کو بتائے گا۔"(آیت :۱۵۹)۔گھروں میں ذہنی دوریاں اپس میں بدگمانیاں پیدا کرتی ہیں اسی طرح قوم وملک میں تفرقہ بندیاں ملک و قوم میں خانہ جنگیاں پیدا کرتی ہیں اور دین میں تفرقہ اللہ سے بندوں کو بدگمان کر دیتا ہے جب کہ اللہ پاک اپنی مخلوق کے لیے انتہائی رحیم وکریم ہے اور اپنی بندگی کے دائرے سے کسی کو خارج نہیں کرتے۔بندہ خود ہی اسے توڑنے کے چکر میں لگا رہتا ہے۔

اتحاد کے جو دنیاوی فوائد ہیں وہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی اجتماعی ہے وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔اجتماعی زندگی میں وہ ایک دوسرے سے سیکھتا بھی ہے۔اگر ہم غور کریں تو ہماری ساری زندگی اک دوسرے کی نقل دکھائی دیتی ہے۔بچہ پیدا ہوتے ہی ماں باپ کی نقل کرتا ہے تو سیکھتا ہے۔اسی طرح بڑا ہو کر ارد گرد کے ماحول کی نقل کرتا ہے تو معاشرتی رنگ اس پر چڑھتا ہے اور وہ معاشرے کا ایک فرد بن جاتا ہے۔غرضیکہ وہ جس جس کی نقل کرتا جاتا ہے اسی کا ایک جز بن جاتا ہے اور اسی کے ساتھ وابستہ ہوتا جاتا ہے۔ماں باپ کے اندر بھی بچے کے لیے یہی تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی ہی تقلید کرے۔بچے کو بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ماں باپ بھائی بہنوں کے ساتھ اس کی بنی رہے۔گھر کا سکون مل جل کر رہنے میں ہے۔اس کے علاوہ ماں باپ سے جو دین اور مذہبی عقائد ملتے ہیں بچے کے لیے وہی دین اور انہی عقائد پر عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔کیونکہ اس کی طرزِ فکر اور فہم اسے ماں باپ سے منتقل ہوتا ہے۔تمام مذاہب میں چند ایسے اصول ہین جو عقیدے کے اختلاف کے باوجود بھی یکساں طور پر ہر مذہب میں موجود ہیں۔مثلاً عید تہوار کا دن جس میں ساری قوم اور ملک اکٹھے ہو کر خوشی مناتے ہیں۔یہ مذہبی عقیدے کی بنیاد پر ہونا ضرور ہے۔مگر اس کے پس پردہ جو فکر کام کر رہی ہے وہ یہی ہے کہ ساری قوم کا ذہن ان لمحات میں ایک مرکز پر آجائے اور یہی وجہ ہے کہ ساری قوم اس دن جب ایک ہی خیال پر سوچتی ہے کہ آج عید کا دن ہے تو ساری قوم کے اوپر ایک احساس طاری ہو جاتا ہے اور سب کے زہنوں سے خوشی کی روشنیاں نکلنے لگتی ہیں۔سارا شہر ان روشنیوں میں دوب جاتا ہے۔یہ اتحاد کی ایک عظیم مثال ہے۔اسی طرح حج اور مختلف مذاہب میں جو یاترا وغیرہ ہوتی ہے وہ سارے دن اسی وجہ سے منائے جاتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور اپس میں تبادلہ خیال ہو۔ظاہری طور پر بھی اور ذہنی ریز کے ایک دوسرے میں ٹرانسفر کے طور پر بھی۔قدرت کے یہ سارے اصول انسان کے اندر کام کرنے والی فطرت پر رکھے گئے ہیں اور یہ انسان کی ضرورت ہے تاکہ لوگ

www.ksars.org

ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں۔ گویا یہ فطرت کی جانب سے ذہنی ہم آہنگی کے لئے اصول ہیں اور اس کا فائدہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک کی فطرت تخلیق کرنا ہے۔ تخریب کرنا اور اجاڑنا نہیں ہے۔ اتحاد اور بھائی چارہ آدمی کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ گھر میں سکون ہو گا تو گھر کے انتظامی امور بہتر طور پر ہو سکیں گے اور ذہن گھر کو اچھے سے اچھا بنانے کی سوچتا ہے اور ملک میں سکون ہو گا تو قوم کا ذہن ملک کی بہتری اور فلاح کے لیے اچھے اچھے تعمیری منصوبے بناتا ہے اور سکون کی فضا میں اس پر آرام سے عمل کرتا ہے۔ جن قوموں میں اپنے وطن کی محبت ہوتی ہے اور اپنے ہم وطنوں کی محبت ہوتی ہے وہ قومیں پھلتی پھولتی ہیں ان میں ہر قسم کے علوم سیکھنے کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ دنیاوی علوم کی جانب توجہ کرتی ہیں تو دنیاوی ایجادات اور دنیاوی آرام و آسائش کے لیے نئی نئی چیزیں دریافت کر لیتی ہیں اور اگر روحانی علوم کی جانب توجہ کرتے ہیں تو روحانی علوم کے راستے ان پر نکل جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ ایک بنیادی اصول ہے جو ہر نوع کا تقاضہ ہے۔ جانور بھی اپنی نوع کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر نسلی بڑھوت نہیں ہوتی۔ دنیا تو دنیا آسمان پر ستارے بھی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ غرضیکہ قدرت کی تخلیق میں جدھر بھی نظر کی جائے اتحاد مخلوق کی بنیادی ضرورت دکھائی دیتی ہے۔ اتحاد ذہنی مرکزیت قائم کرنے میں سب سے زیادہ مدد دیتا ہے۔ اس لئے کہ آدمی جب مختلف افراد اور مختلف انواع کے اندر کام کرنے والی فطرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو فطرت کے تمام رنگ ایک ہی مرکز سے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔

اللہ پاک کی بنائی ہوئی کائنات میں جہاں بھی غور کریں ہر شئے ایک دوسرے سے منسلک نظر آتی ہے۔ بیج کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ مگر درخت بیج سے اس طرح منسلک ہے کہ بغیر بیج کے درخت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پھول کی اپنی ایک الگ پہچان ہے مگر بغیر ڈالی کے پھول کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خود آدمی کی اپنی جسم کی مشینری کے اندر بے شمار پرزے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں اور منسلک ہونے کی وجہ سے اکٹھے مل جل کر کام کرتے ہیں۔ جسم کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا ہے تو اس کا درد بدن کے روئیں روئیں کو ہوتا ہے۔ سارا جسم ایک حصہ جسم کی وجہ سے بیمار ہو جاتا ہے۔ اتحاد کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کائنات کا ہر تفکر ہمارے اپنے اندر ہی کام کر رہا ہے۔ بس ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قدرت کی نشانیوں کو اپنے اندر ہی تلاش کریں تو قدرت ہمیں ہر وقت ایسے مواقع

www.ksars.org

عطا کرتی رہتی ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ انسان کی توجہ خود اپنی جانب کبھی نہیں جاتی۔ وہ ہر نقائص کو اپنی ذات سے باہر تلاش کرتا ہے۔ حالنکہ اللہ پاک تو یہ کہتے ہیں کہ میں تمہارے نفسوں میں ہوں تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں۔ جب اللہ ہمارے اندر ہے تو اللہ کی تمام نشانیاں بھی ہمارے اندر ہی ہیں۔ رگ گلو سے قریب ہونے کا مطلب بھی یہ ہے کہ اللہ ہمارے اندر ہی ہے یعنی اللہ کے نور سے ہمارا تعلق ہمارے انر یا باطن کے ذریعے ہے نہ کہ جسم کے ذریعے۔ باطن ہی جسم کو کنڑول کرتا ہے۔ قدرت کی تمام نشانیاں باطن سے ظاہر میں اپنا اظہار کرتی ہین۔ اگر آدمی ظاہر سے باطن میں غور کرے تو باطن میں اللہ کے نور سے ان کا رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ ایک ذات ہے اور اس ایک ذات کا تعلق کائنات کے زرے ذرے سے ہے۔ جب ایک ذات ساری کائنات کی خالق بھی ہے اور ساری کنڑولنگ پاور بھی اس کے ہاتھ میں ہے تو پھر ساری کائنات کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی ضرورت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کی ہر شئے ہمارے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ مثلاً ہوا، پانی، بارش، سورج، چاند، زمین، سبزہ، جانور غرضیکہ زمین کی ہر شئے ہمارے ساتھ اس طرح تعاون کرتی ہے کہ ہم اسے اپنے ارادے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ گویا قدرت کی ہر شئے کا ہمارے ساتھ تعاون ہے مگر اگر نہیں ہے تو انسان کا انسان کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوائے انسان کے اور جنات کے باقی ہر شئے غیر مکلف ہے یعنی انسان اور جنات کو اللہ تعالی نے اپنے ارادے پر اختیار دیا ہے۔ باقی تمام مخلوق اللہ تعالی کے ارادے سے کام کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اور جنات کے کاموں میں گلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور اعمال کا حساب کتاب ہے۔ مگر قدرت کی جانب سے جو نعمتیں اور رحمتیں انسان کے اوپر ہیں ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر انسان قدرت کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے تو راحت ہی راحت ہے۔ دنیا میں بھی وہ جنت کا آرام و سکون حاصل کر سکتا ہے۔ جن گھروں میں اتفاق، محبت اور ایثار کی فضا ہوتی ہے وہ گھر جنت کا نمونہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن قوموں میں باہمی سلوک اور رواداری و اتحاد پایا جاتا ہے وہ قومیں دنیا میں بھی سپر پاور بن جاتی ہین اور اللہ کی جانب سے بھی انہں مراعات ملتی رہتی ہیں۔ زندگی تنظیم اور اتحاد کا نام ہے جو خوشی جو سکون مل جل کر زندگی گزارنے میں ملتا ہے وہ اکیلے نہیں ملتا۔ مچل مشہور ہے کہ اکیلا آدمی نہ روتا اچھا لگتا ہے نہ ہنستا ہوا اچھا لگتا ہے۔ ایک روحانی فرد کی تیاری اللہ تعالی کے بنائے ہوئے اصولوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے اندر فطرت کے اصولوں کو پہچان کر ان کے

www.ksars.org

مطابق اپنی شخصیت کو سنوارتا ہے اور اپنے اندر کام کرنے والی فطرت کے ذریعے اس بات سے واقف ہو جاتا ہے کہ فطرت ایک ماں کی طرح ہے جس سے ہر فرد کے منسلک رہنے میں ہی عافیت ہے۔ فطرت سے منسلک رہنا اتحاد ہے۔ ساری کائنات ایک جسم کی طرح ہے اور کائنات کا ہر فرد اس جسم کا عضو ہے۔ عضو معطل خود اپنے لیے بھی بوجھ بن جاتا ہے اور جسم کے لیے بھی۔ ایک مدت تک جسم اس کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے اور جب ناقابلِ برداشت ہوتا ہے تو کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ جب جسم کے ساتھ ایسا واقعہ پیش اتا ہے تو دل ڈرتا ہے اور دکھ کے انسو بہاتا ہے کیونکہ اتحاد کی فکر اس کی جدائی برداشت نہیں کرتی۔ کسی قوم کے ذہن جب پارہ پارہ ہو جاتے ہیں تو ساری کائنات کی فطرت میں درد کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ یہ لہریں ہورے کائناتی ادراک کو متحرک کر دیتی ہیں۔ ادراک کے سمندر میں طوفان آجاتا ہے جس کے طوفانی تھپیڑے روحانی شعور کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ ساری کائنات میں ایک ہی روح کام کر رہی ہے اور یہ روح اللہ کی پھونکی ہوئی ہے۔ روح کے سمندر کی جب ایک روح ایک لہر کی طرح اٹھتی ہے تو اس کے ساتھ اور بھی لہریں شامل ہو جاتی ہیں۔ رحمت کا سارا سمندر جوش میں آجاتا ہے۔ قدرت کا نظام ازل سے ابد تک ایک ہی طرز میں قائم ہے۔ حرکت ہمیشہ ایک نقطے سے شروع ہو کر سارے دائرے میں پھیل جاتی ہے۔ یہ نقطہ سورس اور حرکت کا مرکز ہے۔ سارا دائرہ نقطہ ہی کا پھیلاؤ ہے۔ ایک روحانی شعور اس بات سے جب واقف ہو جاتا ہے کہ نقطے کا ظہور خود اس کے اپنے اندر ہے یہ نقطہ روح کی ایک فکر ہے اور جب اس کی روشنی پھیلتی ہے تو ایک عالم کو روشن کر دیتی ہے تو وہ روح کی روشنی کا طالب ہو جاتا ہے اور اس عالم کے اندر کی ہر شئے کو روح کی نظر سے دیکھتا ہے۔ روح کی ہر صلاحیت اللہ کی ایک سفت کی روشنی ہے۔ جب بندے کے اندر اللہ کی نظر کام کرنے لگتی ہے تو وہ ساری مخلوق کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ تب سارا عالم اللہ کے رنگوں میں دوبا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ روح کی نگاہ میں ساری کائنات کو متحد دیکھتا ہے اور اتحاد کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

آزادی

۱۔ اصل انسان روح ہے اور روح کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر مذہب دراصل انسان کو اللہ سے روح کے ذریعے متعارف کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ ایک روحانی آدمی اس بات کو جانتے ہوئے کسی مذہب کو تعصب سے نہیں دیکھتا۔

۲۔ ایک روحانی طالب علم چونکہ ہر ایک سے محبت اور ہر انسان سے حسن سلوک بغیر کسی نسل وامتیاز کے کرنے کا عہد کرتا ہے اس لیے وہ بغیر روک ٹوک کے ہر نوع انسانی سے دوستی رکھتا ہے۔

۳۔ روحانی نقطہ نظر سے روح کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ روح اپنی ذات میں آزاد ہے۔ روح کی صفت علم ہے۔ علم سیکھنے کا عمل لامحدود ہے۔

۴۔ ہر مذہب کی الگ الگ قدریں ہیں۔ کچھ مذاہب ایسے ہیں جن کے قوانین سخت ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو فطرت سے قریب ہے اور فطرت سے آزاد ہے۔

۵۔ ہر مذہب کے پیچھے اس مذہب کے لانے والے پیغمبر کی فکر کام کر رہی ہے اور اس فکر کا تعلق براہ راست اللہ سے ہے۔ اس طرح تمام پیغمبروں کی فکر دراصل ایک ہستی سے وابستہ ہے جس کو مختلف لوگوں نے مختلف وقتوں میں اپنایا اور اپنی فکر کو دوسرے مذہب کی فکر سے الگ قرار دے دیا۔ ایک روحانی انسان کسی ایک فکر کو پکڑ کر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ یہ راز پالیتا ہے کہ تمام مذاہب دراصل ایک ہی ہستی تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔

www.ksars.org

۶۔ آزاد فکر ہی اللہ تک پہنچ سکتی ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں۔اگر آپ کا رب چاہے تو ساری دنیا کو مسلمان بنادے۔ آپ کا کام پیغام کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی راہ دکھاتے ہیں۔اس لیے ایک روحانی آدمی کو مذہب میں زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔

۷۔ کسی فرد کی طرزِ فکر کے بلا روک ٹوک اظہار کو آزادی فکر کہتے ہیں۔مذہب آزادی تسلیم کا دوسرا نام ہے۔یعنی مذہب میں جبر نہیں ہے۔جو جبر سے اختیار کیا گیا وہ مذہب نہیں ہے۔اس کی ایک مثال ہے۔حضرت عمرؓ کا ایک غلام کافر تھا۔آپؓ نے اسے مسلمان ہونے کو کہا۔اس نے انکار کر دیا۔آپ □ نے جواب دیا۔بے شک دین میں جبر نہیں ہے۔

۸۔ غیب میں رہنے کا نام آزادی ہے اور غیب میں داخل ہونے کا قانون مذہب ہے۔ایک روحانی طالب علم کو دونوں قوانین پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۹۔ اللہ نے روح کو آزاد پیدا کیا ہے اور انسان کی فطرت بھی آزاد ہے۔دین میں کوئی جبر نہیں ہے اور جبر ہی علم سیکھنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔روحانی علوم حاصل کرنے سے انسان آزاد طرزِ فکر پر چلنے لگتا ہے۔

۱۰۔ قرآن میں اللہ پاک فرماتے ہیں کہ دین میں جبر نہیں ہے اور حدیث میں ہے کہ کسی کے معبود کو برا نہ کہو ورنہ تمہارے معبود کو برا کہے گا۔اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فکر و مذہب کی پوری پوری آزادی دی ہے۔انسان کو چاہیے کہ اللہ کے اس فرمان کو اپنا کر ہر ایک کے لیے فکر و مذہب کی آزادی تسلیم کرے۔

۱۱۔ روحانیت میں نیوٹرل ہونا ضروری ہے جو روحانیت کی بنیاد ہے۔نیوٹرل آدمی کسی پر کسی طرح کا جبر نہیں کرتا نہ ہی کسی کو تنگ نظر سے دیکھتا ہے۔

۱۲۔ اللہ پاک لامحدود ہیں۔لامحدودیت میں داخل ہونے کے لیے کوئی ایک دروازہ یا راستہ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے اللہ پاک فرماتے ہیں۔" لااکراہ فی الدین"۔دین میں جبر نہیں ہے اور فرماتے ہیں تو کہہ

www.ksars.org

دے کہ ہر آدمی اپنی طرزِ فکر کے مطابق عمل کرتا ہے اور فرماتے ہیں کہ تمہارے لیے تمہاری راہ اور میرے لیے میری راہ۔ دین زندگی گزارنے کے لیے اصولوں کا نام ہے۔ اصول فکر کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔ فکر میں جتنی گہرائی ہوگی اتنی ہی فکر آزاد ہوگی اور حقیقت کے قریب ہوگی۔ فکر کی انتہائی انسان کو منبع سلامتی یعنی صفت اسلام سے وابستہ کر دیتی ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ دین اللہ کے نزدیک تو اسلام ہی ہے یعنی سب سے احسن یا آزاد فکر تو وہی ہے جو انسان کو منبع سلامتی تک پہنچادے اور وہ فکر اسلام ہے۔

۱۳۔ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت آزاد ہے۔ دین کے معاملے میں انسان کا ذہن کھلا ہوا ہے۔ محدودیت انسان کو ٹائم اینڈ اسپیس میں مقید رکھتی ہے۔ لامحدودیت روح کے حواس ہیں۔ اللہ لامحدود ہے۔ انسان لامحدودیت میں رہ کر یعنی آزاد طرزِ فکر کے ساتھ ہی روح کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ مَن عَرَفَ رَبَّهُ فَقَدْ عَرَفَ نَفْسَهُ۔

۱۴۔ ازلی شعور ہی آزادی فکر مذہب ہے۔

۱۵۔ ایک روحانی آدمی کے اندر طرزِ فکر کی سوچ یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے حسن سلوک سے انسانیت کی خدمت کرے۔ خواہ وہ کسی بھی مذہب وفرقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ اللہ کی محبت کا پیغام عمل اور علم کے ذریعے لوگوں تک پہنچاتا ہے اور اپنے دین و مذہب کا اتباع سختی سے نہیں کرواتا کیونکہ وہ اللہ کے قانون کو سمجھتے ہوئے کسی دوسرے مذہب کو تعصب سے نہیں دیکھتا۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ فطرت اور جبلت میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۲۔ قلندر شعور کیا ہے اور آزاد طرزِ فکر سے کیا مراد ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر۳۔ دین میں جبر نہیں،اس کا مفہوم بیان کریں۔

سوال نمبر۔۴ اللہ کے قوانین کو بندہ کس طرح سمجھ سکتا ہے؟

سوال نمبر۵۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں''دین تو صرف اللہ کے نزدیک اسلام ہے''اس کی تشریح کریں۔

☆☆☆☆☆

دین سے مراد وہ طرزِ فکر اور وہ قوانین واصول ہیں جن کو اپنا کر اور جن پر عمل کر کے انسان دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں اپنی زندگی اللہ تعالی کی رضا کے مطابق گزار سکتا ہے۔اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ''دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔''

(سورہ آل عمران ۱۹۔)

سورہ انعام میں فرماتے ہیں۔''تو جس شخص کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔اس طرح خدا ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔''(۱۲۶)

ان اور ان جیسی کئی آیتوں میں اللہ پاک نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ دین کا مطلب اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غور و فکر کیا جائے کہ اسلام کی تعریف کیا ہے۔اسلام کن قوانین و اصولوں کا مجموعہ ہے اور اسلام کس مشن کی تبلیغ کرتا ہے۔ان سوالوں کے جواب میں سب سے پہلے تو اسلام کا سورس معلوم کرنا ہے۔اس کا جواب ہر کوئی یہی دے گا کہ اسلام اللہ تعالی کی جانب سے بھیجا ہوا دین ہے۔ گویا اسلام وہ دین ہے جس کا ہر اصول اللہ پاک کی جانب سے مقرر کیا گیا ہے۔اس لیے اسے دین فطرت بھی کہا گیا ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر علیہ السلام آئے اور انہوں نے اللہ پاک کا پیغام لوگوں تک پہنچایا وہ تمام کے تمام اللہ تعالی کی جانب سے دین اسلام لے کر آئے۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک تو دین کا مطلب ہی اسلام ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا

www.ksars.org

کہ دین اسلام ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا لایا ہوا دین ہے۔ یہ بات قابل غور طلب ہے کہ جب تمام پیغمبر ایک ہی دین لے کر آئے اور ایک ہی ہستی کی جانب سے آئے تو پھر دین کا نام کیوں بدل دیا اور نام کے ساتھ ساتھ دین کو الگ الگ کیوں شمار کر لیا گیا۔ یہ تو بالکل اسی طرح کی بات ہے کہ کوئی آدمی کو دل کہے، جگر کہے، پھیپھڑے کہے، گردہ کہے، مگر آدمی نہ کہے تو آدمی کی تعریف پوری تو نہ ہوئی البتہ آدمی کے ایک جز کی تعریف ہو گئی مگر اس جز کو آدمی سے الگ مانا نہیں جا سکتا۔ اس جز کو بھی آدمی کے اندر ہی شمار کرنا ہو گا اور جز کے نام پر پکارنے پر بھی مراد آدمی ہی لیا جائے گا۔ یہی مثال اسلام کی ہے کہ خواہ کسی بھی پیغمبر کے نام سے دین کو منسوب کیا جائے جیسے یہودا، جو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا، سے یہودی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عیسائی، حضرت محمد ﷺ سے محمدی۔ یہ تمام مذاہب اسلام ہی کی یونٹ میں شمار ہوں گے۔ اگر ہم اسلام کو ایک کتاب مان لیں تو اس کتاب کے تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ورق ہیں۔ خالق کائنات نے اس کتاب کو تمام انسانوں کے لیے پڑھنا پسند فرمایا ہے بلکہ اس کتاب کا پڑھنا انسانوں کے لیے فائدے مند قرار دیا ہے۔ اس کے بغیر انسان کا سینہ اس قدر تنگ ہو جاتا ہے کہ جیسے آدمی اونچائی پر چڑھتا ہے تو سانس پھول جاتا ہے اور سینے میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح بغیر اسلام کو اپنائے ہوئے انسان کی حالت ہو جاتی ہے کہ اس پر زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ تمام ہدایات اللہ نے دنیا والوں پر ظاہر تو کر دیں مگر اس کے بعد فرمایا کہ ''دین میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور خدا سمیع اور علیم ہے۔'' (سورہ یونس ۹۹)

دنیا میں دین لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ دنیاوی شعور جہالت ہے۔ وہ دنیا میں آ کر علم سیکھتا ہے۔ پہلے سے سیکھا سکھایا نہیں آتا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس کا شعور قطعی طور پر ہر قسم کے علوم سے مضر ہوتا ہے۔ اللہ پاک اس شعور کو جہالت سے نکال کر علم میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ جہالت ظلمت ہے۔ علم روشنی ہے مگر اللہ پاک نے انسان کو شعوری طور پر اختیار عطا کیا ہے کہ وہ روشنی کو قبول کرے یا جہالت کے اندھیرے کو۔ جو جس کو پسند کرے گا وہی روشنی اس کے حواس بنے گی۔ اندھیرے کے حواس میں بندہ اللہ پاک کے ناپسندیدہ اور رد کیے ہوئے تصورات کو دیکھتا ہے جو بندے کے اندر شک، شبہ، خوف و دہشت، عدم تحفظ، رنج و غم، تکلیف

www.ksars.org

و آزاری کے حواس پیدا کرتے ہیں اور علم کی روشنی کو قبول کرنے سے بندہ اللہ پاک کے پسندیدہ اور قبول کیے ہوئے تصورات دیکھتا ہے اور اللہ کی رضا اسے حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ خوش رہتا ہے اور مستقل طور پر رب کا پسندیدہ بن جاتا ہے۔ یہ دونوں تصورات کن کے بعد کے ظہورات ہیں۔ ان دونوں تصورات کا رابطہ انسان کے ذہن سے ہے یا شعور سے ہے۔ جو آیت ابھی بیان کی گئی ہے اس میں اسم سمیع اور اسم علیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سمیع سے مراد شئے کی صفت ہے مگر سننے کی صلاحیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آواز آتی ہے یعنی آواز کی لہروں میں ہی سماعت بنتی ہیں۔ آواز کی لہریں اللہ پاک کی آواز کن ہے۔ اور علیم جاننے والا یعنی علم کی صلاحیت ہے۔ علم کی روشنی صفت علیم کی تجلی یا نور ہے۔ علم کا تعلق دماغ، ذہن یا شعور سے ہے اور سماعت یا آواز کا تعلق حواس سے ہے۔ کن کے بعد کے ظہورات میں علم اور حواس دونوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ تمام افراد کائنات ان دو رخوں کا مجموعہ ہیں۔ آدم یا انسان میں یہ خصوصت ہے کہ اسے ان دونوں رخوں کے علوم بھی عطا کیے گئے ہیں۔ خالق کائنات بے نیاز ہستی ہے جو اس کی صفت صمدیت ہے۔ وہ مخلوق سے محبت بھی کرتی ہے اس کی بھلائی بھی چاہتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ مخلوق کو جبراً ان علوم سے آشنا نہیں کرنا چاہتی کیونکہ خالق کا مخلوق کے اوپر جبر اس کی صمدیت اور بے نیازی کے خلاف ہے۔ خالق کا مخلوق پر جبر کرنے سے یہ مراد لی جائے گی کہ خالق خدانخواستہ حاجت مند ہے جبھی تو جبراً اپنی بات منوا رہا ہے جب کہ خالق قادر مطلق ہستی ہے اور ہر قسم کی حاجت سے پاک ہے۔ یہی وجہ کہ اللہ پاک نے یہ جانتے ہوئے بھی کم لوگوں کو دین اسلام کو جاننے، پہچاننے اور ان کے اصولوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی آدم کے لیے دین میں جبر اختیار کرنا پسند نہیں کیا۔ جب ہم دین کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں عام طور پر صرف وہی ارکان آتے ہیں جن کی بنیاد عقائد پر ہے۔ کسی قوم یا فرقے کا عقیدہ مختلف ہونا ہی نہیں چاہیے کیونکہ عقائد کا سورس اور مرکز ایک ہے مگر عقائد میں اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب ان کا رخ اللہ کی جانب سے پھیر کر بندوں کی جانب کر دیا جاتا ہے کہ فلاں پیغمبر کا کہنا ہے کہ فلاں ولی کا کہنا ہے۔ آدمی کی نظر وسیلہ پر تو ہوتی ہے مگر وسیلے کی مرکزیت پر نہیں ہوتی یا پھر وہ اسے اہمیت نہیں دیتا جس کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے اور جھوٹے عقائد جنم لیتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ تو یہ فرماتے ہیں کہ۔

www.ksars.org

''تو تم ایک طرف ہو کر دین پر سیدھا منہ کیے چلے جاؤ۔ خدا کی فطرت کو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

(سورہ روم ۳۰)

اس آیت میں اللہ پاک یہ کہہ رہے ہیں کہ فطرت انسان سے ہٹ کر نہیں ہے بلکہ فطرت وہ ہے جس پر لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بات اس مثال سے بخوبی سمجھ میں آجائے گی مثلاً انسان خون سے بنا ہے وہ نطفہ جب انسان کے ارادے سے قرار پاتا ہے تو اس کے اندر تخلیقی نشو نما شروع ہو جاتی ہے اور یہ نشو نما خون کے قطرے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد نشو نما ہوتے ہوتے آدمی کی سورت بن جاتی ہے اور مرتے دم تک آدمی تو برقرار رہتا ہے مگر نشو نما جاری رہتی ہے۔ یہ عمل جاری رکھنے کے لیے مستقل طور پر خون کی ضرورت رہتی ہے تاکہ آدمی کا نظام برقرار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی خون ہے۔ اگر خون نکال دیا جائے تو جسمانی نظام ختم ہو جائے گا۔ خون بنیادی ضرورت بھی ہے اور تخلیقی ضرورت بھی۔ انسانی جسم کا سارا نظام خون کی فطرت ہے جس میں تبدیلی لائی نہیں جاسکتی۔ اگر خون کے بجائے انسان کے اندر پیٹرول ڈال دیا جائے اور سارا خون نکال دیا جائے تو انسان کا جسمانی نظام فیل ہو جائے گا۔ خون وہ بنیادی ضرورت ہے جس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی مثال فطرت کی ہے کہ انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ فطرت وہ ہے جس میں تغیر نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے کائنات کی اور کون سی شئے ہے جس میں تغیر نہیں ہے۔ موت وحیات کا سلسلہ بذات خود ایک تغیر ہے جو کائنات کے ذرے ذرے میں واقع ہوتا ہے اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ فطرت اللہ ہے اور اللہ نور ہے۔ اب بات یوں بنی کہ اللہ پاک اس آیت میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو نور سے پیدا کیا ہے اور نور ہی لوگوں کی بنیادی توانائی اور ضروت ہے۔ اگر لوگوں نے نور سے رو گردانی کی تو ان کی نشو نما رک جائے گی اور اس شعور پر موت واقع ہو جائے گی یا وہ شعور بالکل فنا ہو جائے گا جو شعور و عقل اللہ کو پہچانتی ہے۔ اس طرح بندہ ہمیشہ کے لیے اللہ سے دور ہو جائے گا۔ اللہ سے دور رہنا ہی موت ہے اور فنائیت ہے۔ مگر کائنات قدرت کے ایک منظم نظام کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اسی نظام کا ایک قانون ''دین میں جبر نہیں ہے'' کا ہے۔ اس کی وجہ سے شیطان کو دی گئی مہلت ہے۔ دین

www.ksars.org

اسلام کو جاننے کے لیے دنیامیں رائج تمام مذاہب کی کڑی درکڑی ملانے کی ضرورت ہے اوران کی سچائی کی پرکھ قرآن کے ذریعے کی جاسکتی ہے جس کی حفاظت کاذمہ اللہ نے اپنے سر لیاہے۔

دین اسلام دراصل فطرت وہ نور ہے جو کائنات کی نشونما کررہاہے۔یہ نور لامحدودیت کاعالم ہے۔ اس نور کی صفات اسمائے الٰہیہ ہیں۔دین اسلام اس نور کی ذات اور صفات کے علوم ہیں ان علوم کو سیکھ کر بندہ کائنات کے اندر جاری وساری تخلیوی و تکوینی نظام کو سمجھ سکتاہے اوراللہ نے جو نعمتیں اس کے اندر پیدا کی ہیں انہیں استعمال میں لاسکتا ہے۔ذہن مین یہ سوال بھی ابھر سکتاہے کہ آخر جو بندے اللہ کے علوم نہیں سیکھتے اور اللہ پر ایمان نہیں لاتے وہ بھی اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ہوا، پانی، غذا، نباتات، جمادات، زمین سب ہی کچھ تو وہ استعمال کرتے ہیں پھر سیکھنے اور نہ سیکھنے والوں میں کیا فرق ہوگا۔ سوال اپنی جگہ درست ہے مگر فرق محدودیت اور لامحدودیت کا ہے۔ محدودیت عالم ناسوت یعنی مادی دنیااور مادی زون۔اور لامحدودیت نور ہے،اللہ ہے، جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔اگر ہم دین اسلام سے ہٹ کر اپنی زندگی گزارتے ہیں تواس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ کو خالق نہیں مانتے کیونکہ اسلام کی مرکزیت اللہ ہے۔یہی اس کا بنیادی عقیدہ ہے۔جب مرکزیت سے ہٹ گئے تو دائرہ ہی بدل گیا۔آپ پرکار کی نوک کو ایک جگہ رکھ کر دائرہ لگائیں توایک دائرہ بنتاہے۔اب پرکار اٹھالیں اوراس کی نوک کسی دوسرے صفحے پر رکھ دیں تو یہ دوسرا دائرہ بنے گا یعنی مرکز بدلنے سے دائرہ بھی بدل گیا۔اب اپ یوں سمجھیں کہ ایک مرکز اللہ یا رحمٰن ہے۔دوسرا مرکز ابلیس یا شیطان ہے۔انسان کا وجود دائرے میں ہے، مرکز میں نہیں ہے۔مرکز تو ذات ہے جس میں تبدیلی نہیں ہے۔اللہ کی ذات پاک وہ ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے یعنی یہ مستقل مرکز ہے۔ابلیس یا شیطان وہ ہے جس کو اللہ نے صرف قیامت تک کی مہلت دی ہے۔قیامت کے بعد انسان اس طرح ابلیس کے شر سے محفوظ ہو جاتاہے کہ جب وہ اپنا مرکز اللہ کی ذات کو بنا لے۔مرکز اللہ کو بناتاہے تو راستہ وہ دائرہ بنتاہے جو اس مرکز کی جانب سے ہوتاہے۔دائرہ ہی الگ ہے جس کی وجہ سے شیطان سے نجات مل جاتی ہے مگر مرکز ابلیس کی ذات کو بنالیا جائے تو دائرہ یعنی راستہ بدل جاتاہے اور اس راستے کا ہر قانون ہر شئے ابلیس کے ذہن کی پیداوار ہے۔یعنی اللہ پاک کے رد کیے ہوئے تصورات،ان تصورات کے ڈسپلے کا زون صرف عالم ناسوت ہے، جو محدود ہے۔اس راستے پر چل کر آدمی آزادی محسوس نہیں کرتا بلکہ تنگی اور قید محسوس کرتاہے

www.ksars.org

جس سے ناخوش ہوتا ہے یعنی شعور کی نشو نما عالم ناسوت پر جا کر رک جاتی ہے اور شعور بڑھنے نہیں پاتا اور ذہن پر دباؤ پڑتا ہے۔ ذہن چونکہ روشنیاں جذب کرتا ہے۔ مادی روشنیاں ٹھوس احساس رکھنے کی وجہ سے ذہن پر بوجھ بن جاتی ہیں اور یہی بوجھ شعور کو غیب میں داخل ہونے سے نشو نما پانے سے روک دیتا ہے۔ جب کہ اللہ چاہتا ہے کہ وہ غیب میں داخل ہو کر اللہ پاک کی کاریگری کے نمونے دیکھے چونکہ نور توانائی ہے جب توانائی اور قوت نہیں ہو گی تو آدمی کیسے سفر کرے گا۔ توانائی اور قوت حاصل کرنے کے لیے جسم میں جذب کرنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ جیسے اپ دو دن کے بچے کو پلاؤ زردہ نہیں کھلا سکتے۔ وہ ہضم نہیں کر سکتا، نہ ہی کھا سکتا ہے اور نہ ہی اسے جبراً کھلا سکتے ہیں، وہ مر جائے گا۔ دین اسلام فطرت کا وہ نور ہے جو انسان کے شعور کی غذا ہے۔ غذا اصولوں کے مطابق کھانے سے توانائی حاصل ہوتی ہے۔ نہ کھانے سے بالآخر ایک دن آدمی مر جاتا ہے۔ کوئی بھی ماں ساری عمرؓ بچے کے منہ میں نوالہ نہیں ڈالتی۔ بچے کو خود ہی کھانا دیکھنا پرتا ہے ورنہ بچہ معذور ہو جاتا ہے۔ فطرت بھی ماں ہے۔ اللہ پاک نے بندوں کو پیدا کر کے ان کے اندر شعوری نشو نما لامحدودیت تک رکھی ہے تاکہ بندہ اپنے خالق کو دیکھ اور پہچان لے۔ اگر اللہ پاک دین میں جبر کا قانون لاگو کر دیتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ آدمی اپنے ناقص عقل کی بناء پر اللہ پاک پر یہ تہمت لگا دیتا کہ اس نے اپنے فائدے کے لیے مجھے یہ صلاحیتیں اور علم عطا کیا ہے۔ پھر انسان اللہ کی پاکی اور بے نیازی کو پہچان نہ سکتا۔ آزادی فکر و مذہب انسان کو اللہ کی خلافت و نیابت کی زمہ داریوں کو قبول کرنے اور نبھانے کی صلاحیت بھی بخشی ہے۔ دراصل میں آزادی کا مطلب ہی فطرت ہے۔ اللہ کا نور جو ہمارے اندر روحانی اور جسمانی توانائی بنتا ہے اس نور کی ایک فطرت ہے۔ یہ فطرت اس نور کے اندر کی صفات ہیں جنہیں اسمائے الٰہیہ کہا ہے۔ ہر صفت ایک مخصوص صلاحیت یا رنگ ہے جس میں کوئی تبدیلی یا تغیر ناممکن ہے اور ہر صفت ایک مخصوص نظام کی انرجی ہے۔ اللہ نے کائنات کے اندر اسمائے الٰہیہ کے یہ نظام جاری کیے ہوئے ہیں۔ آزادی فکر و مذہب کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کرنے والی اس صلاحیت کو اپنے ارادے کے ساتھ پہچان کر اسے استعمال کرے اور کائنات کی وسعتوں میں جہاں جہاں یہ نظام جاری و ساری ہے، سفر کرے اور ان سے فائدہ حاصل کرے اور ان کے ذریعے اپنے خالق کو پہچانے۔

www.ksars.org

دین سارے کا سارا اللہ پاک کو جاننا اور اپنی ذات کو پہچاننے کا مطلب ہے۔ انسان کا ذہن دباؤ کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا اور زیادہ دباؤ سے اس کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔ یہ دماغ یعنی شعور یا عقل کی فطرت ہے۔ جبر کا مطلب ہی دباؤ ہے۔ جب اللہ پاک جانتا ہے کہ شعور انسانی دباؤ برداشت نہیں کر سکتا پھر وہ ایسا قانون خود کیسے بنا سکتا ہے جس میں شعور انسانی کی موت اور تباہی ہو۔ اگر انسان اپنے ذہن کو دنیاوی افکار کے بوجھ سے آزاد رکھ کر فراخ دلی کے ساتھ اور فراخ ذہنی کے ساتھ پیغمبروں کے لائے ہوئے احکامات اور آسمانی کتابوں میں غور و فکر کرے تو اسے اپنے اندر کام کرنے والی فطرت کے ذریعے اللہ کا سراغ لگ سکتا ہے اور اس رابطہ کا سراغ مل جاتا ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان محبت کا رشتہ ہے۔ اللہ نے انسان کو کل مخلوق میں سب سے زیادہ صلاحیتیں عطا کر کے اس بات کی نشاندہی کر دی ہے کہ اللہ تمام مخلوق میں سب زیادہ بندوں سے محبت کرتا ہے۔ محبت کی فطرت آزادی ہے۔ محب اور محبوب کے درمیانی رمز کو آزاد ذہن اور آزاد شعور ہی سمجھ سکتا ہے۔ جبر کے ساتھ دوستی، محبت اور اخوت کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ البتہ جبر کے ساتھ ناگواری کا رشتہ ضرور قائم ہو جاتا ہے جس کی حقیقت بندہ مرنے کے بعد حشر کے دن ضرور پالے گا۔ جب وہ شیطان کو اپنے دوست یا معبود کی حیثیت سے دیکھ لے گا تب جبر و قدر کی حقیقت سے واقف ہو جائے گا کہ قانون جبر اصل میں قدر کی حقیقت ہے۔ یہاں حکم نواہی اللہ کے امر اثبات کی اہمیت اور حکمت کی ترغیب دلا رہی ہے تاکہ اللہ کے دین سے بندے کو چھٹکارا دلانا مقصود ہے۔ فطرت تو ہمارے اندر خون کی طرح رچی بسی ہے۔ فطرت کے بغیر تو ہمارا وجود ہی نہیں ہے۔ فطرت ہم سے جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ سے ہٹ کر ہم کہاں جائیں گے۔ اس سے ہٹ کر اور اس سے خالی کون سی جگہ ہے۔ مگر اللہ نے جو آزادی فکر و مذہب عطا کی ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے کہہ کر۔ یہ اللہ کا ایک ایسا رمز ہے جسے روحانی شعور ہی سمجھ سکتا ہے۔ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''اے میرے بندے! میں تو ازل میں ہی تجھے اپنا محبوب جان لیا اور تمام مخلوق سے ہٹ کر تجھ پر ایک خاص نگاہ محبوبیت ڈالی۔ میرا عشق تو تجھ سے ہی ہے۔ اس میں میرا ارادہ کام کر رہا ہے۔ مگر عشق کا دستور ہے کہ عشق اسی وقت کامل ہوتا ہے جب محب اور محبوب واصل ہو جاتے ہیں۔ وصل کا یہ دستور ہے کہ جبر ناپسند ہے۔ محب اور محبوب دونوں کا ارادہ ایک دوسرے کے لیے ہونا چاہیئے۔ پس اب میری نگاہ محبت کا جواب بھی تو مجھے عنایت کر۔ مجھے قبول کر یا مجھے رد کر۔ مگر ایک بات یاد رکھ روز محشر میں جب تو قہر و لطف کو

www.ksars.org

جان لے گا اور پا نہ سکے گا تو محرومی کی کسک تجھے رلائے گی۔ دین اسلام دراصل اللہ سے واصل ہو جانے کا نام ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار جو سب کے سب انسان تھے، اپنی اپنی سکت کے مطابق اللہ سے واصل ہوئے اور عالم شہادت میں اس بات کی گواہی دی کہ بلاشبہ دین اسلام ہی سچا مذہب ہے اور ہم مسلمین میں سے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے صفت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے اول المسلمین ہونے کا اقرار کیا۔ آج کے دور میں اگر ہم دین اسلام کی سچائی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اصولوں میں غور و فکر کرنا ہوگا اور قرآن کی ایات میں جستجو کرنی ہو گی کہ جس کے اندر فطرت کے تمام اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ پیغمبروں نے ہمارے لیے سب سے آسان اور کم مدت میں اسلام کی حقیقت کو پہچاننے اور اس کے ذریعے اللہ تک پہنچنے کا جو راستہ بتایا ہے وہ روحانیت ہے۔ اپنی روح سے قریب ہو کر کوئی بھی بندہ اسلام کو پا سکتا ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

www.ksars.org

راز و نیاز

۱۔ راز ایک خفیہ علم ہے جو ایک امانت کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ راز فاش کرنا خیانت ہے اور اس کے حق سے خود کو محروم کرنا ہے۔ صبر وضبط سے رازداری کی سکت بڑھائی جاسکتی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا رازدار ہے۔ رازداری ایک نیکی ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں جس نے اپنے بھائی کا راز اپنے سینے میں رکھا اور اس کو افشانہ کیا تو اللہ پاک قیامت کے دن اس کے راز دوسروں پر ظاہر نہیں کریں گے۔

۳۔ کائنات میں اللہ پاک کی جو مشیت کام کر رہی ہے وہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان راز ہے جو عام سے پردے میں ہے۔ اللہ کی عطا کردہ فراست کے ذریعے مشیت کے علوم سیکھے جاسکتے ہیں۔

۴۔ راز داری سے مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے وہ علوم جو عوام الناس کی فہم سے باہر ہیں کسی سے بیان نہ کیے جائیں کیونکہ بعض روحانیت میں ایسی باتیں بھی آدمی کے علم میں آجاتی ہیں جو فائدے کی جگہ نقصان کا باعث بن سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے خواب بھی خاص بندوں کے علاوہ ہر کسی سے بیان نہ کیے جائیں۔ رازداری کی سکت بڑھانے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ کم سے کم گفتگو کی جائے اس وجہ سے چپ کے روزے کی پریکٹس کرائی جاتی ہے۔

۵۔ ایک روحانی بندے کا اللہ سے رابطہ رازداری ہے۔ اگر بندہ یہ تینوں اصول اپنالے۔ کم سونا، کم بولنا، کم کھانا تو اس سے روحانی سکت بڑھ سکتی ہے۔

۶۔ حضرت غوث پاکؒ فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ کا سر یعنی راز ہے۔ خیال کی لہریں جو عالم امر سے دماغ پر وارد ہوتی ہیں، زیادہ بولنے سے ان کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ ایک روحانی بندہ جو اللہ تعالیٰ کا امین ہے۔ روحانی راستے پر

www.ksars.org

چلتے ہوئے اس کے اوپر ایسی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں کہ اگر بیان کر دی جائیں تو لوگوں کے لیے فائدے مند ثابت نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے ثابتہ کے ریکارڈ میں دیکھ کر کئی ہزار سال پہلے اور بعد کے ریکارڈ سے واقف ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ مجھے حضور پاک ﷺ سے دو قسم کے علوم منتقل ہوئے۔ ایک کو میں نے ظاہر کر دیا اور دوسرے کو چھپا لیا۔ اگر ظاہر کر دیتا تو لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑتے یعنی عوام کے شعور سے اونچی بات اگر کر دی جائے تو عقل اسے قبول نہیں کرتی۔

۷۔ اللہ تعالیٰ غیب میں ہے۔ غیب جس کو نظر نہیں آتا اس کے لیے راز ہے۔ روحانی آدمی کی آنکھ جب غیب میں دیکھتی ہے تو ان چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے جو عام آدمی کے لیے راز ہے۔ روحانی آدمی اللہ کے رازوں کو عوام کی سکت کے مطابق عام کرتے ہیں۔

۸۔ ایک انسان کو اپنے اوپر اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ وہ کسی کے راز کو راز رکھ سکے۔ اور یہ کہ کنٹرول انسان اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اس کے اندر صبر وضبط ہو اور اس کا ارادہ مضبوط ہو۔ اللہ نے فرمایا ہے کسی کے راز کو راز رکھو گے تو حشر کے دن اللہ بھی تمہارا پردہ رکھے گا۔

۹۔ روحانی راستوں میں سالک کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس راستے میں ورادات وکیفیات ایک راز ہے۔ جسے عوام الناس سے پوشیدہ رکھنے کی سالک میں سکت ضروری ہے۔ راز کو راز رکھنے سے سکت بڑھتی ہے۔

۱۰۔ کیفیت جذب سے امانت کی سکت بڑھتی ہے۔

۱۱۔ راز ایک امانت ہے۔ امانت میں خیانت کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہے۔ رازداری کی سکت کو بڑھانے کے لیے خاموشی کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ گاڑی جتنا روڈ پر چلتی ہے اتنا ہی اس کے ایکسیڈنٹ کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ آدمی جتنی زیادہ باتیں کرے گا اتنا ہی زیادہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس کے منہ سے راز کی کوئی بات نکل جائے اور جتنی آدمی کے اندر گہرائی اور وسعت یعنی ظرف پیدا ہو گا اتنا ہی وہ خاموش رہے گا۔

www.ksars.org

کہہ رہا ہے شور دریائے سے سمندر کا سکوت

جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

۱۲۔ A Roohani Person see's with his conscious and subconscious therefore the Rooh has a connection with Allah. An average person only see's and decide with his conscious scene. A Roohani person therefore has tolerance will power and patience and high level of under standing. He is able to decide which knowledge is tolerable to that body.

۱۳۔ رازداری ایک امانت ہے جس طرح کسی کی چیز رکھ کر امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہیے اسی طرح اگر کوئی راز اپنا آپ کو بتاتا ہے تو وہ آپ کے پاس امانت رکھواتا ہے۔ حد سے حد کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اس راز کو امانت سمجھ کر حفاظت کریں۔ پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں پر تجربہ کریں کہ اپ میں کہاں تک سکت ہے پھر بڑی باتیں خود ہی راز رکھنا آسان ہو جائیں گی۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ راز و نیاز کی کیا حقیقت ہے؟ بیان کریں۔

سوال نمبر ۲۔ راز کو راز رکھنا کیوں ضروری ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر۳۔ حضرت ابو ہریرہ □ کا فرمان ہے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے مجھے علم کے دو پیالے ملے ایک کو میں نے چھپالیااور دوسرے کو ظاہر کر دیا،اس کی تفصیلات بیان کریں۔

سوال نمبر۴۔ کم کھانا، کم بولنا، کم سونے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے، بیان کریں۔

☆☆☆☆☆

روحانی علوم کائنات کی اشیاء کے پس پردہ کام کرنے والے عوامل کے علوم ہیں۔ہر شئے کے پس پردہ اس شئے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں نے کن کہااور تمام روحیں وجود میں آگئیں یعنی روحوں کا تعلق براہ راست اللہ تعالی کے امر کن سے ہے۔اللہ تعالی کے امر کن سے روحوں کو تخلیق اور وجود میں آنے کے بعد روحوں کے اندر زندگی کی حرکت کی ترتیب کے علوم وہ ہیں جو اللہ کی جانب سے آدم کو عطا ہوئے ہیں۔یہ تمام غیب کے علوم ہیں۔غیب کی حرکات و سکنات کا سایہ ہی مادی کائنات ہے۔ظاہری حواس سائے کی حد تک کام کرتے ہیں مگر باطنی حواس سائے سے گزر کر شئے کے باطن میں پہنچ جاتے ہیں۔عام آدمی صرف ظاہری حواس سے کام لینا جانتا ہے وہ باطنی حواس سے واقف نہیں ہوتا مگر روحانی علوم کا طالب اپنے باطنی حواس کو متحرک کر کے اپنی باطنی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرتا۔ باطنی صلاحیتیں روح کی صلاحیتیں ہیں۔روح کی صلاحیتوں سے واقفیت غیب کا انکشاف کرتی ہے۔یہ انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کو آنکھ دیکھ لیتی اس کے متعلق اسے یقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے مگر آنکھ سے دیکھے بغیر یقین کی جگہ شک اور وسوسہ جنم لیتا ہے۔قلب کی آنکھ جب کھلتی ہے تو غیب میں دیکھ کر غیب پر ایمان پختہ ہو جاتا ہے مگر ایک عام آدمی کے لیے ایمان کا یہ درجہ حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی نظر غیب میں کام نہیں کرتی۔بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیب مشاہدے میں نہ ہو مگر روزمرہ زندگی کا کوئی واقعہ آدمی کو غیب پر یقین کا درجہ دلا دیتا ہے اور پھر یہی غیب کی نظر بن جاتی ہے۔غیب کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص طرزِ فکر درکار ہے جو روحانی طرزِ فکر ہے۔روحانی طرزِ فکر کے بغیر غیب میں دیکھی ہوئی اشیاء کو صحیح معنی نہیں پہنائے جا سکتے۔جس طرح استدراجی لوگ بھی غیب کا مشاہدہ تھوڑا بہت ضرور کرتے ہیں مگر استدراجی طرزِ فکر میں اور روحانی طرزِ فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔استدراجی طرز فکر میں اس کے

www.ksars.org

اندر آدمی جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے وہ مشاہدہ اعراف کی تخریبی ذہنیت کی مالک روحوں اور شر پسند جنات کی انسپائریشن کا نتیجہ ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ استدراجی علوم لوگوں کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔اس کے بر خلاف روحانی طرزِ فکر کے تحت جو کچھ بھی مشاہدہ ہوتا ہے وہ رحمانی قوتوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔رحمانی قوتوں میں اولیاء اللہ کی ارواح مقدسہ پیغمبران علیہ السلام کی ارواح مقدسہ اور ملائکہ اور رجال الغیب شامل ہیں۔استدراجی علوم اور مشاہدہ و تصرف کا دائرہ عالم ناسوت کی حدود تک ہے۔مگر رحمانی اور روحانی علوم کا دائرہ تصرف اور مشاہدہ علم و عمل عرش تک ہے۔عرش کی ایک بلندی بیت المعمور ہے اور جیسا کہ آپ پہلے بھی سن چکے ہیں کہ بیت المعمور ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے۔اس مقام پر جن تجلیات وانوار کا نزول رہتا ہے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام ان انوار و تجلیات کے علوم سے پوری طرح باخبر ہیں اور ان انوار پر آپ کو تصرف حاصل ہے۔بیت المعمور پر نزول ہونے والی تجلیات کا کائنات میں کیا عمل دخل ہے یہ اللہ تعالیٰ کے ایسے اسرار ہیں جن کے علوم اللہ پاک نے اپنے پیغمبر کو عطا کیے ہیں۔پیغمبروں کے ذریعے روحانی علوم ان کے وارثین میں منتقل ہوتے ہیں۔پس جس طرح پیغمبران علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے علم الاسرار کی سکت رکھتے تھے ان کے وارثین بھی سکت رکھتے ہیں۔سکت کے بغیر یہ علوم منتقل نہیں ہوتے۔ایک روحانی استاد بھی اپنے شاگرد کو روحانی علوم اسی وقت منتقل کرتا ہے جب اس کے اندر سکت پیدا ہو جاتی ہے۔بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاگرد اپنے تئیں یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھ میں اب اتنی سکت پیدا ہو چکی ہے کہ ہر قسم کے اسرار کو اپنے اندر محفوظ کر سکتا ہوں۔اسی سلسلے میں ایک قصہ حضرت جنید بغدادیؒ کا بھی بہت مشہور ہے جو اس طرح ہے کہ ان کا ایک مرید تھا۔کافی عرصہ ان کی صحبت میں رہنے کے بعد ایک دن اس کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اسم اعظم کے اسرار جان سکوں۔یہ سوچ کر اپنے استاد کے پاس آیا اور مصر ہو گیا کہ مجھے اسم اعظم کی تعلیم دیجئے۔حضرت جنید بغدادیؒ نے اس کے اصرار کو دیکھ کر اسے کہا اچھا پہلے تم میرا یہ کام کر دو پھر میں تمہیں اسم اعظم بتادوں گا۔آپؒ نے ایک خوان پوش ڈھکا ہوا اسے دیا کہ یہ فلاں دریا میں ڈال آؤ۔مرید ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ اس کے اندر تجسس پیدا ہوا کہ خوان پوش کو کھول کر تو دیکھوں کہ اس کے اندر کیا ہے؟چند قدم چلنے کے بعد اس کا تجسس اتنا بڑھا کہ اس نے خوان پوش کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ڈھکنے کا اٹھنا تھا کہ ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا۔اب مرید پریشان ہو کر آدھے راستے سے ہی واپس آگیا۔حضرت جنید بغدادی □ نے پوچھا تم نے دریا

www.ksars.org

میں ڈال دیا؟ کہاڈال دیا۔ پوچھا کیادیکھا؟ کچھ نہیں۔ حضرت جنید □ نے فرمایا۔ جب تم ایک چوہے کی حفاظت نہیں کر سکے تواسم اعظم کی کیا کروگے۔

ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے اسرار کسی کو بتائے ہی نہیں بلکہ اللہ کے اسرار اللہ کے بندوں کے لیے ہیں۔ اللہ کے بندے وہ ہیں جن کا ذہن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہوتا ہے یعنی مشیت ایزدی کے تحت کائنات میں جو کچھ رونما ہو رہا ہے اس سے اللہ کے بندے واقف ہوتے ہیں۔ یہ واقفیت بھی اللہ کی رضا اور اس کی مصلحت کے تحت ہوتی ہے تاکہ اس کے بندے اس کے عطا کردہ

اختیارات کو پہچان سکیں۔ اللہ پاک نے اسمائے الٰہیہ کے علوم عطا کر کے انسان کو اپنا نائب اور زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔ بندے کے اختیارات نیابت اور خلافت کے دائرے میں کام کرتے ہیں۔ نیابت کے علوم کائنات کے انتظامی امور اور تخلیقی فارمولوں کے علوم ہیں۔ اس شعبے کو شعبہ ارشاد کہا جاتا ہے۔ شعبہ تکوین کا انتہائی درجہ نبوت ہے اور شعبہ رشد و ہدایت کا انتہائی درجہ رسالت ہے۔ اللہ پاک کے پیغمبران علیہ السلام نے ان درجات میں علوم حاصل کیے ہیں اور سب پیغمبروں کے ذریعے سے یہ علوم لوگوں تک پہنچ رہے ہیں۔ روحانی طرزِ فکر پیغمبروں کی طرزِ فکر ہے۔ جیسے جیسے کوئی بندہ روحانی طرزِ فکر اختیار کرتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ ذہنی طور پر پیغمبروں کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس ذہنی ہم آہنگی کے نتیجے میں سالک کے اندر پیغمبروں کے اور اپنے مرشد کے علوم منتقل ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ دماغ ایک کمپیوٹر ہے اور اس کمپیوٹر کی کنجی انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کمپیوٹر کے اندر اسمائے الٰہیہ کے علوم فیڈ ہیں۔ پیغمبران علیہ السلام علوم کو لوگوں کے دماغ یا کمپیوٹر میں فیڈ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک دماغ پروگرامنگ کرتا ہے تو دوسرا دماغ اس پروگرام کو ریسیو کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ذہنی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں روحانی سلاسل کی بنیاد پڑی۔ روحانی علوم حاصل کرنے کے لیے مرید کا اپنے مرشد یا روحانی استاد کے ساتھ ہم آہنگی نہایت ہی ضروری ہے۔ سوچنے کا انداز جب ایک ہو جاتا ہے تو ایک ذہن کی فکر دوسرے ذہن میں منتقل ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ مرید اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کے ذہن کا رابطہ غیب میں کام کرنے والی فرشتوں پیغمبروں کی ارواح اور روحانی طرزِ فکر کی حامل ارواح سے ہو جاتا ہے اس پر غیب کے علوم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

www.ksars.org

پیغمبروں کا مشن لوگوں کو اللہ پاک کی ذات وصفات سے متعارف کرانا ہے۔پیغمبروں کا مشن رہتی دنیاتک قائم رہنے والا ہے کیونکہ ہر دور میں بنی نوع انسانی کو اپنے خالق اور رب کو پہچاننے اور جاننے کی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں قدرت ایسے انسان پیدا کر دیتی ہے جو اللہ کے مشن کو جاری وساری رکھتے ہیں۔روحانی مشن میں کام کرنے والا لوگوں کا روحانی معالج بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا سابقہ بہت سے دکھی اور ضرورت مند لوگوں سے پڑتا رہتا ہے۔ایسے میں لوگوں کی ذاتی اور نجی باتوں کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنا اس کی ایک اخلاقی زمہ داری ہے جس کی وجہ سے آپس میں انس ومحبت کے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں اور بھروسہ قائم ہو جاتا ہے۔زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہلکے پھلے ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ آدمی آدمی کا علاج ہے۔ایک روحانی شخصیت بہت سے دکھی انسانیت کا مداوا بن جاتی ہے۔بشرطیکہ اس کے اندر رازداری کی سکت ہے جو بندوں کے راز اپنے اندر چھپالیتا ہے۔اللہ اس سے اس قدر خوش ہو جاتا ہے کہ اس پر اپنے اسرار کھول دیتا ہے۔

انسان کے اندر کام کرنے والی تمام صلاحیتیں اسمائے الٰہیہ کا نور ہے۔جب بندے کے اندر یہ نور متحرک ہو جاتا ہے تو اس کے اندر اس نور کا ادراک پیدا ہو جاتا ہے۔یہی ادراک آگے چل کر حواس میں منتقل ہو جاتا ہے اور آدمی اس نور وروشنی کو اپنی صلاحیت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔اللہ پاک ستار العیوب ہیں۔اسم ستار کا نور ہر عیب کا ڈھانپنے والا ہے۔جب کوئی بندہ لوگوں کے راز جاننے کے باوجود بھی انہیں اخفا نہیں کرتا بلکہ انہی اپنے سینے میں محفوظ رکھ کر اسے اس کی شرمندگی اور رنج وغم کے نقصان سے بچانے کی فکر میں لگا رہتا ہے تو اس پر اسم ستار کے انوار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ خود اس کے عیب اس روشنی میں چھپ جاتے ہیں اور جس طرح اللہ کا نور اس کے عیبوں پر پردہ ڈال دیتا ہے بندے کے اندر اس کے نور کے ساتھ ساتھ اسم ستار کا ذہن اور فکر بھی منتقل ہو جاتی ہے۔اسی فکر اور صلاحیت کے ساتھ وہ لوگوں کے عیبوں پر بھی پردہ ڈالنا سیکھ لیتا ہے اور ان کے رازوں کو اپنے قلب میں پوشیدہ رکھنے کا گر سیکھ لیتا ہے۔روحانی علوم کتابیں پڑھ کر حاصل نہیں ہوتے بلکہ علم کی روشنیاں جذب کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ہر روشنی کسی نہ کسی اسم کی روشنی ہے۔جب یہ انوار قلب وذہن میں جذب ہو جاتے ہیں تو آدمی کے ذہن میں اسمائے الٰہیہ کی فکر کام کرنے لگتی ہے اور دل اس فکر کو تصوراتی سانچے میں ڈھال دیتا ہے جہاں قلب کی نظر اسے دیکھ لیتی ہے اور آدمی اسے پہچان لیتا

www.ksars.org

ہے۔روحانی فکر جان لیتی ہے کہ آدمی کے اندر اللہ کی صفات کام کر رہی ہیں۔پس وہ اپنا رخ فطرت کی جانب موڑ دیتا ہے اور خود اپنے اندر کام کرنے والی فطرت سے قریب ہو کر اس کے اصل سورس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔فطرت کا پہچاننا ہی اسمائے الٰہیہ کا پہچاننا ہے۔اسمائے الٰہیہ کی پہچان آدمی کی باطنی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے۔

اللہ پاک ہمیں ایسے روحانی حواس عطا فرمائے کہ ہم ان کے ذریعے کائنات میں کام کرنے والے اسمائے الٰہیہ کے نظام کو پہچان جائیں اور اللہ پاک کو اس کی صفات کے ساتھ پہچان جائیں جیسا اس کے پہچاننے کا حق ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

خوش مزاجی

۱۔ ہر پیغمبر نے اللہ کے مشن کو اپنی خوش کلامی کے ذریعے پھیلایا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو ان کی (پیغمبروں) پیروی کرو۔ پھر اللہ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ جس طرح ایک پیغمبر نے اللہ کے مشن کو محبت، ایثار، خوش اخلاقی اور خوش کلامی سے گھر گھر پہنچایا۔ ایک روحانی آدمی چونکہ پیغمبر کا نائب ہوتا ہے اسی طرح خوش مزاجی اور خوش خلقی سے ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔

۲۔ آدم اللہ پاک کی نافرمانی کے نتیجہ میں پریشان ہوگئے۔ اس سے پہلے وہ خوش و خرم رہ رہے تھے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ آدم نے اللہ سے ذہن ہٹا کر شیطان کی انسپائریشن کو قبول کر لیا تو وہ پریشانی کا شکار ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک منبع سکون و سلامتی ہے۔ جب تک ذہن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے بندہ خوش رہتا ہے اور جب ذہن اس حالت سے نکل آتا ہے انسان پریشان ہو جاتا ہے۔ بقول اللہ تعالیٰ ''شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا اور اس حال سے انہیں نکلوا دیا جس میں وہ تھے۔'' یعنی ان کے ذہن کی فریکوئنسی کو بدل دیا۔ لہذا خوش مزاجی کے لیے ضروری ہے کہ بندے کا ذہن اللہ سے وابستہ رہے۔

۳۔ خوشی اور غمی باہر کی چیز نہیں بلکہ ذہن کی مختلف حالتوں کے نام ہیں۔ جب آدمی اس راز سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ منفی خیالات کو مثبت میں کس طرح بدل دیا جائے یعنی انفارمیشن کو مثبت معنی کس طرح پہنائے جائیں ایسا بندہ چونکہ اس بات کو جان لیتا ہے کہ ہر چیز اللہ ہی کی جانب سے ہے وہ کسی کو کسی چیز کا اصل فاعل نہیں سمجھتا۔ لہذا اسے کوئی دوش نہیں دیتا اور نتیجتاً پریشان نہیں ہوتا بلکہ خوش رہتا ہے۔

www.ksars.org

۴۔ حدیث شریف ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے مسکرا کے ملنا بھی صدقہ اور نیکی ہے۔ روز مرہ کے تعلقات میں خوش مزاجی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کو سب میں ممتاز کرتی ہے اور اس کی شخصیت کو دلفریب بناتی ہے۔ حقیقی خوش مزاجی یہ ہے کہ انسان پریشانی سہہ کر بھی خوش مزاج رہے۔

۵۔ خوش مزاجی دلوں میں محبت پیدا کرتی ہے۔ ایک روحانی خوش مزاج آدمی اللہ کے قریب ہوتا ہے اور اپنی خوش مزاجی سے دوستوں کو بھی اللہ سے قریب کر دیتا ہے۔ بڑے سے بڑا غم خوش مزاجی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھنا اور ہر حال میں مثبت سوچ اور غم کو اپنے نزدیک نہ آنے دینا اور ہر کسی سے محبت سے پیش آنا خوش مزاجی ہے۔

۷۔ دوسروں کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنا اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ستائش کرنا خوش مزاجی ہے۔

۸۔ خوش مزاجی ایسی صلاحیت ہے جس میں بندہ خود بھی خوش رہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک روحانی آدمی کا رابطہ چونکہ اپنی روح کے ساتھ ہوتا ہے اور روح ہر شئے کی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے اس لیے روحانی آدمی ہر وقت خوش رہتا ہے۔

۹۔ ہر حالت میں خوش رہنے والے انسان بھی خداوند کریم کا ایک تحفہ ہے جو اپنی فطرت سے دوسروں کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ ایک روحانی آدمی اللہ پاک کی تعلیمات کو نہایت ہی موثر الفاظ میں لوگوں کے دل و دماغ تک پہنچا دیتا ہے۔

۱۰۔ خوش مزاج آدمی کے پاس بیٹھ کر دوسرا شخص اپنا دکھ درد بھول جاتا ہے۔ وہ اس طرح لوگوں کی دلداری کرتا ہے کہ دوسروں کی پریشانی کو سکون میں بدل دیتا ہے۔

۱۱۔ By being happy by nature you make others happy and Allah likes it when you make others happy.

www.ksars.org

۱۲۔ Happy by nature is a sign of being positive.

۱۳۔ رسول پاک ﷺ ہر کسی کے ساتھ خوش مزاجی سے پیش آتے تھے اور کسی سے سخت لہجے میں بات نہیں کرتے تھے۔ دوسروں کو بھی خوش مزاجی سے بات کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اس سے محبت اور آپس میں اخلاص بڑھتا ہے اور تحمل مزاجی پیدا ہوتی ہے۔ خوش مزاج آدمی کی موجودگی ماحول کو بھی خوشگوار بنا دیتی ہے۔

۱۴۔ سچی خوشی روحانی خوشی ہے جو آدمی کے اندر ہے۔ برے حالات میں آدمی کی پرکھ ہوتی ہے۔ اگر وہ صبر اور خوش مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اس بندے کا ساتھ دیتا ہے اور جلد ہی اس کو اس مصیبت سے نکال دیتا ہے اگر آدمی بدمزاج ہو تو خراب حالات میں اور بھی زیادہ خدا کا منکر ہو جاتا ہے اور پھر خدا بھی جلد اس کی حالت نہیں بدلتا۔

۱۵۔ ہم جب کسی سے رابطہ قائم کرتے ہیں تو اپنا خیال دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ ہمارا بات کرنا اس کے ذہن پر فوراً اثر انداز ہوتا ہے۔ الفاظ ایک قسم کی لہر ہے جو روشنی کی بنی ہوتی ہے۔ خوش مزاج آدمی مسکرا کر دھیمی آواز میں اچھے الفاظ میں بات کرتا ہے تو سننے والے کے ذہن میں اس کی روشنی منتقل ہو جاتی ہے۔ اس ماحول میں مثبت خیالات پیدا ہوتے ہیں اس کے برعکس بدمزاج آدمی کی زبان سے گلہ شکوہ اور منفی خیالات نکلتے ہیں جس کے نتیجے میں اس کے ارد گرد کے لوگ بیزار ہو جاتے ہیں۔

۱۶۔ حدیث میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔“ خوش اخلاق آدمی خوش مزاج ہوتا ہے۔

۱۷۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے

www.ksars.org

مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

۱۸۔ خوشی ایک باطنی کیفیت ہے۔جب یہ باطنی کیفیت متحرک ہو جاتی ہے تو اس کا مظاہرہ خوش مزاجی ہے۔خوشی جنت کے دماغ یعنی لاشعور سے رابطہ قائم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ سچی خوشی کیا ہے؟اس کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

سوال نمبر ۲۔ فطرت کے اصولوں سے ہم کس طرح واقف ہو سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ خوش مزاجی کے کیا فوائد ہیں، بیان کریں۔

سوال نمبر ۴۔ گردش کا کیا قانون ہے؟کلاک وائز اور وینٹی کلاک وائز گردش میں کیا فرق ہے اور یہ حواس پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں؟

☆☆☆☆☆

انسان اشرف المخلوقات ہے۔اسی اعتبار سے ہر اچھی صفت و صلاحیت کا مظاہرہ انسان کے ذریعے ہی ہونا چاہیے۔اگر انسان کسی بھی صفت کے اظہار میں دوسری مخلوق سے کمتر رہ گیا تو گویا کہ اس صفت میں وہ دوسری مخلوق سبقت لے گئی۔حالانکہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ اپنے اندر موجود ہر صلاحیت کا دوسری تمام مخلوق کی نسبت بہترین طور پر مظاہرہ کر سکتا ہے۔مخلوق کی تمام صلاحیتیں اسمائے الٰہیہ کی روشنیاں اور انوار و تجلیات ہیں۔اسی حوالے سے روحانی نقطہ نظر سے یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر موجود تمام اسمائے الٰہیہ اسم اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی انسان اپنے اندر موجود صلاحیتوں کا مظاہرہ اور استعمال جس بلندی پر کر سکتا ہے اس بلندی و عروج پر پہنچنا کسی اور مخلوق

www.ksars.org

کا مقدر نہیں ہے۔ خود شناسی کے متعلق یہ ایک جنرل بات اپ کو معلوم ہو گئی جو قانون اور سنت الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب ہم اپنے عنوان کی جانب اتے ہیں۔ خوش مزاجی یوں تو ہر انسان کے لیے فائدہ مند ہے مگر روحانی آدمی کے لیے اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ اس کا رابطہ بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔ روحانی راستے پیغمبروں کے راستے ہیں۔ ان راستوں پر چل کر کسی بھی آدمی کو انہی تمام چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جن سے پیغمبران علیہ السلام پہلے ہی گزر چکے ہیں۔ پیغمبروں نے اس راستے پر جو علوم حاصل کیے وہ علوم عوام تک پہنچانا اپنی ذمہ داری سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ اج دنیا والے ان علوم کی کچھ نہ کچھ سمجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیغمبروں کے ساتھ ساتھ ان کے علوم بھی پردہ غیب میں لوٹ جاتے۔ لوگوں سے کنارہ کش رہ کر جینا اتنا مشکل نہیں جتنا لوگوں کے درمیان رہ کر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ ہر شخص کا اپنا ایک دماغ ہے جس سے وہ کام لیتا ہے اور ہر فرد کا دماغ اپنی معنویت کے اعتبار سے یکتا ہے یعنی ہر ایک کا دماغ ایک ایسی مشین ہے جو اپنے اندر منتقل ہونے والی خیال کی روشنی کو منفرد معنی پہناتا ہے۔ ایسی صورت میں آدمی جتنے زیادہ لوگوں سے واسطہ رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ نظریات کی بھیڑ میں گویا کہ گھر جاتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اس بھیڑ میں رہ کر اپنے نظریئے اور اپنے نقطہ نظر کو دوسروں کے نظریات پر حاوی کر دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں دوسروں کی طرزِ فکر کو اپنی طرزِ فکر میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کام پیغمبروں کا ہے کہ ایک انسان نے پوری پوری قوم کے ذہن کو اپنے ذہن کے مطابق بدل ڈالا اور ان کے اندر پلنے والے صدیوں کے فرسودہ عقائد کو بہت تھوڑے عرصے میں نئی بنیادوں پر تبدیل کر دیا۔ پیغمبروں کے بعد جو لوگ بھی پیغمبروں کے مشن پر کام کرتے ہیں۔ ان کے اندر پیغمبروں کا ذہن اور ان کی طرزِ فکر منتقل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اسی انداز میں کام کرتے ہیں جس طور پر پیغمبروں نے عمل کیے اور کامیاب رہے۔ گویا پیغمبروں کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر قدم بنی نوع انسانی کے لیے اللہ کی جانب سے متعین کردہ راستے ہیں جن پر چل کر ہی کوئی بندہ اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔

کسی روحانی مشن میں شامل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک ایسے اسکول میں داخلہ لے لیا ہے جس میں آپ کے اندر پیغمبرانہ سوچ منتقل کی جاتی ہے۔ طرزِ فکر یا ذہن کے سوچنے کا انداز ایک ایسی فریکوئنسی ہے جس فریکوئنسی پر شعور لاشعور سے اطلاعات وصول کرتا ہے۔ پیغمبرانہ طرزِ فکر منتقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی فکر کے

www.ksars.org

ساتھ بندے کا رابطہ ہو جانا۔اس طرح لاشعور سے انے والی اطلاع میں وہ بندہ اپنی سکت کے مطابق اسی انداز میں معنی پہناتا ہے جس انداز میں پیغمبر نے اسے سمجھا تھا۔ جاننا چاہیے کہ تمام مخلوق کے ذہن کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں پیغمبروں کے دماغ اور فکر سے منتقل ہو رہی ہیں کسی بھی مخلوق یا بشر کا رابطہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے یا اس کی صفات سے ہر گز بھی نہیں ہے بلکہ خالق سے تمام مخلوق کا رابطہ بواسطہ پیغمبران علیہ السلام کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بندوں کے لیے پیغمبروں کی زندگی کا ہر عمل قابل اتباع ہے۔ روحانی استاد وہی ہو سکتا ہے جسے اپنے پیغمبر کی نسبت حاصل ہو۔ نسبت سے مراد طرزِ فکر ہے۔ شاگرد جب اپنے استاد سے علم سیکھتا ہے تو علم اسی وقت منتقل ہوتا ہے جب استاد کی طرزِ فکر شاگرد میں منتقل ہوتی ہے۔ یہی اصول دنیاوی علوم سیکھنے کے لیے بھی ہے۔ بچہ جب استاد سے علم سیکھنے بیٹھتا ہے تو استاد کہتا ہے یہ الف ہے تو بچہ بھی بغیر اپنا ذہن استعمال کیے ہوئے استاد کے ذہن سے الف کو الف کہتا ہے۔ اس کے بغیر وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔ اسی طرح روحانی استاد بھی اپنے شاگرد کے اندر اپنی طرزِ فکر یا ذہن منتقل کرتے ہیں۔ پھر وہ خود نظر سے غیب کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جس تفکر سے غیب کو سمجھتے ہیں شاگرد بھی اسی نظر اور تفکر سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے اور غیب کے علوم سیکھتا ہے۔ طرزِ فکر کی منتقلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایسی باطنی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں جو اس سے پہلے خوابیدہ تھیں۔ بیدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ان صلاحیتوں کا مظاہرہ اور استعمال کرتا ہے۔ روحانی زندگی اور تعلیمات اس اعتبار سے نہایت ہی عملی زندگی ہے۔ اس زندگی کا ہر عمل روح کا ایک قدم ہے جو وہ اللہ کی جانب ان راستوں پر بڑھاتی ہے جن راستوں پر چل کر پیغمبران علیہ السلام اللہ تک پہنچے۔ ہر اچھی صلاحیت بندے کو اللہ کی صفات اور اس کے اسماء سے متعارف کراتی ہے۔ ہر آدمی کے اوپر اللہ پاک کی کسی نہ کسی صفت کی روشنی کا غلبہ ہے اور اس روشنی میں وہ اپنی زندگی کی حرکات و سکنات کو عملی صورت بخشتا ہے۔ بہت سے لوگوں سے رابطہ رکھنے میں اور اجتماعی زندگی گزارنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک فرد اپنے اندر خوابیدہ صلاحیتوں کو پہچان لیتا ہے جب وہ اس صلاحیت کا مظاہرہ مدمقابل دیکھتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے میں ایک دوسرے کی عادات واطوار آدمی قبول کرتا ہے۔ روحانی فرد روحانی اعتبار سے میسر مجلس ہوتا ہے یعنی وہ اپنی اچھی اور مثبت صلاحیتوں کا اس بلندی پر مظاہرہ کرتا ہے کہ تمام لوگ جو اس کے ارد گرد ہیں اس کی روشنی کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب خود اس کے اندر اتنی صلاحیت اور روشنی موجود ہو کہ

www.ksars.org

لوگ اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔ خوش مزاجی کا اجتماعی زندگی میں بہت دخل ہے۔ بڑی سے بڑی محفل میں ایک خوش مزاج آدمی ساری محفل پر چھا جاتا ہے۔ اللہ پاک نے ہمارے اندر ایک ایسی صلاحیت رکھی ہے جو دوسروں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے یہ صلاحیت ہماری آواز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آواز اور الفاظ میں بڑی تاثیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز اور الفاظ خیالات کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہر خیال روشنی کی ایک مخصوص لہ کا نام ہے۔ جب یہ لہر زبان کے ذریعے سے باہر آتی ہے تو وہ آواز اور الفاظ میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ ساری کائنات روشنی کی لہروں پر متحرک ہے۔ ساری کائنات کی حرکت اللہ تعالیٰ کی آواز ہے۔ جسے کن کے نام تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی کائنات کے اندر کن کی لہریں حرکت کی بنیاد ہیں جو کائنات کی حرکت کے پس پردہ رہ کر کام کر رہی ہیں۔ ساری کائنات ان لہروں کا پھیلاؤ ہے۔ ہر لہر ایک مخصوص فریکوئنسی ہے۔ روح اس فریکوئنسی پر غیب کی انفارمیشن شعور کو فراہم کرتی ہے۔ سب سے پہلے اس اطلاع کی روشنی ہمارے دماغ سے ٹکراتی ہے اور لہر کے ٹکرانے سے ہمارے اندر حواس پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ہمارا دماغ اس روشنی یا لہر کو قبول کرتا ہے فوراً ہی ایک فلیش ہوتا ہے۔ اس فلیش کو ہمارا دماغ واہمہ کے معنی پہناتا ہے جو نہایت ہی مبہم خیال ہے جب یہ لہر یا فلیش دماغ میں چند سیکنڈ کے لیے ٹھہر جاتا ہے تو خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر جب مزید چند سیکنڈ کے لیے ٹھہر جاتا ہے تو کیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر جب مزید چند سیکنڈ اور ٹھہرتا ہے تو خیال کی ایک تصویر ذہن میں آجاتی ہے۔ اسی کو تصور کہتے ہیں اور پھر جب تصور ذہن میں یادل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو شئے کو آنکھ دیکھ لیتی ہے۔ تصور کی آنکھ جو کچھ قلب میں دیکھتی ہے ہمارے اندرونی حواس اسے بہت قرب محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے احساس میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیال کی ہر ہر لہر ہمارے لئے دو قسم کی اطلاع لے کر آتی ہے۔ ایک خوشی کی دوسرا غم کی۔ خوشی اور غم کی اطلاعات ہر ان اور ہر لمحے ہمارا دماغ وصول کر رہا ہے کیونکہ حرکت کی لہروں پر دونوں قسم کے خیالات کی روشنیاں حرکت کر رہی ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی فرد کا ذہن صرف خوشی کی اطلاعات کو ہی موصول کرتا رہے اور غم کی اطلاعات کو قطعی طور پر رد کرتا رہے۔ یہ خلافِ قانون فطرت ہے۔ البتہ انسان کو اللہ نے ایسی صلاحیت اور ارادہ عطا کیا ہے کہ جس کے ذریعے سے آدمی خوشی اور غم کے احساسات میں ایک بیلنس رکھ سکتا ہے اور اس بیلنس کی وجہ سے اس کے اوپر خیالات کا دباؤ نہیں پڑتا اور وہ خوش باش رہتا ہے۔ ایک خوش مزاج آدمی اپنے اندر اس بیلنس کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتا ہے جس کی وجہ سے نہ وہ غم سے

www.ksars.org

اتنا زیادہ رنجیدہ ہوتا ہے کہ پھر ہنس ہی نہ سکے نہ خوشی سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے بلکہ اس کے اندر سکون کی لہریں موجزن ہو جاتی ہیں جو اعتدال کی علامت ہے۔

روحانی راستے پر روحانی استاد کی زیر نگرانی شاگرد فطرت کے ایسے اصولوں سے واقف ہو جاتا ہے جو اصول خود اس کی اپنی ذات کے اندر بھی اور کائنات کے اندر ہر طرف جاری و ساری ہیں مگر اس سے پہلے اس کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ پہلے ان اصولوں سے ناواقف رہتا ہے۔ایسی لاعلمی میں استاد کے توسط سے اس کے اوپر جب علوم کے انکشافات ہوتے ہیں تو یہ انکشاف اس کے لیے بے جان جسم میں روح پھونکنے کا کام کرتا ہے اور اس سے اس کے اندر کی خوابیدہ صلاحیت متحرک ہو جاتی ہے۔ خوشی اور غم دو ایسے احساسات ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ غیب سے ملنے والی ہر اطلاع روح کی جانب سے ہماری طرف آتی ہے۔ ہر اطلاع میں دونوں رخ موجود ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ خوشی کی لہر اور ہے اور غم کی لہر اور بلکہ ہر لہر کے دو رخ ہیں۔ان دونوں رخوں کی حرکات ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ایک حرکت کلاک وائز ہے تو دوسری حرکت اینٹی کلاک وائز۔ جب دماغ کے خلیوں میں جذب شدہ روشنیاں کلاک وائز گردش کرتی ہیں تو مثبت معنی اور خوشی کا احساس ہوتا ہے اور جب اینٹی کلاک وائز گردش کرتی ہیں تو منفی خیالات اور غم کے احساس کا دباؤ ہوتا ہے۔ ہمارا ارادہ اپنے دماغ کے اندر جذب ہونے والی روشنیوں کی حرکات کو کنٹرول کرتا ہے۔ روحانی استاد اپنے شاگرد کو ذہن پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت منتقل کرتا ہے اور اسے اپنے خیالات کو مثبت انداز میں معنی پہنانے کی سکت عطا کرتا ہے یہی سکت اس کے اندر خوش مزاجی پیدا کر دیتی ہے اور ارادے میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ منفی خیالات یا لہروں کا دباؤ اس کے احساس کو مجروح نہیں کرتا بلکہ وہ قدرت کے اس قانون کو پہچان لیتا ہے کہ عالم ناسوت میں منفی و مثبت لہروں کا آنا جانا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ ہماری مجبوری ہے کہ دماغ سے دونوں قسم کی لہروں کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے جیسے کبھی ہوا پورب کی چلتی ہے تو کشتی کو پورب کی جانب دھکیل دیتی ہے اور جب پچھم کی چلتی ہے تو کشتی کو پچھم میں لے جاتی ہے۔ مگر اگر کشتی کے اندر ایسی موٹر لگی ہو جس کی اپنی قوت ہوا کے دباؤ سے زیادہ ہو تو کشتی اپنی قوت پر اپنے ارادے کے مطابق سمت اختیار کرے گی۔ ہوا کا جھونکا اسے ہلا نہ سکے گا۔

www.ksars.org

انسان کاارادہ بھی ایسی ہی موٹر ہے جس کی قوت خیالات کی لہروں کی حرکات کو مثبت اور منفی انداز میں کنڑول کرتی ہے۔ ایک روحانی آدمی اس گر سے واقف ہوتا ہے یعنی اس کے اندر اتنی قوت ارادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر آنے والے خیالات کے بہاؤ میں اپنے آپ کو چھوڑ نہیں دیتا بلکہ حالات اور معاشرے کا مقابلہ کرتے ہوئے مثبت انداز میں جینا سیکھ لیتا ہے۔ یہی مثبت اندازاسے خوش مزاج بنادیتا ہے جس میں وہ ہر مصیبت وپریشانی کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے اور ہر دکھ درد کو ہوا کے ایک جھونکے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ پس جس طرح ہوا کا جھونکا آکر گزر جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں دکھ اور مصیبت کالمحہ بھی جھونکے کی طرح آکر گزر جاتا ہے اور جلد ہی پھر سکون کی لہریں اسے اعتدال پر لے آتی ہیں۔ انسان فطرتاً راحت پسند ہے اور راحت اسے گم میں نہیں بلکہ خوشی میں ملتی ہے۔ خوشی کے لمحات کو وہ طول دینا پسند کرتا ہے۔ خوش مزاجی آدمی وحوا کی فطرت میں داخل ہے۔ اللہ پاک اپنے قرآن میں فرماتے ہیں کہ اے آدم وحوا تم دونوں جنت میں خوش ہو کر رہو اور خوش ہو کر کھاؤ پیو اور یہاں کی سیر کرو۔ اس کلام سے اللہ پاک کا مطلب ومنشاء یہی ہے کہ آدم وحوا کے لیے اللہ پاک نے خوش رہنے اور خوش ہو کر زندگی گزارنے کو پسند فرمایا ہے اور یہی اللہ کا آدم وحوا کے لیے حکم بھی ہے کہ خوش ہو کر رہو اور اللہ کی نعمتوں کا خوش ہو کر استعمال کرو۔ جب تک کوئی بندہ خوش رہتا ہے وہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں ہے اور جب کوئی بندہ ناخوش ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم سے روگردانی کرتا ہے۔ گویا خوش مزاجی اللہ کے تفکر کا نور ہے۔ فکر کا یہ نور ہی جنت پر محیط ہے۔ گویا جنت اللہ تعالیٰ کے جس انوار وتجلیات کے اندر موجود ہے ان انوار کے اندر خوشی کی لہریں اور خوشی کا تفکر ہے۔ خوش مزاجی کا مطلب یہ ہے کہ بندے کا رابطہ جنت کی لہروں سے ہو جاتا ہے یعنی ہمارا دماغ جنت کی روشنیوں کو جذب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ہمارے اندر لہروں کا انا جانا لگا ہوا ہے جس طرح ہمارا دماغ روشنیوں کو جذب کرتا ہے اسی طرح جذب شدہ روشنیوں کو خارج بھی کرتا رہتا ہے۔ خوشی کی لہریں جذب ہوں گی تو خوشی کی لہریں ہی دماغ سے خارج بھی ہوں گی۔ اس اصول کی بناء پر خوش مزاج آدمی کے ارد گرد کا ماحول جنت کے ماحول کی طرح خوشگوار بن جاتا ہے اور راحت وسکون کے متلاشی اسی ماحول میں پناہ لینے کے لیے کھینچے چلے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خوش مزاج آدمی بہت سے دکھی دلوں کا مداوا بن جاتا ہے۔ تمام پیغمبران علیہ السلام نے اپنے اندر کی خوشی اور سکون کی لہروں کو دنیا میں اس قدر پھیلا دیا کہ لوگ اس کی ٹھنڈک اور طمانیت کو محسوس کرنے لگے اور ہزاروں سال گزرنے کے

www.ksars.org

باوجود بھی ان کے تفکر کی لہریں دنیا میں اسی طرح موجود ہیں کہ جب بھی دنیا والے پیغمبروں کا نام لیتے ہیں تو ان کے تصور میں خوشی، اطمینان اور سکون و تحفظ کی لہریں ذخیرہ ہونے لگتی ہیں۔ ایک روحانی آدمی بھی پیغمبروں کے فکر کے انوار کو زیادہ سے زیادہ جذب کر کے اپنے حواس میں ان کا ذخیرہ کر لیتا ہے اور پھر اس ذخیرے سے وہ مطلوب لوگوں کو روشنی پہنچاتا ہے۔ روحانی مشن ایک مشعل کی مانند ہے۔ یہ مشعل پیغمبروں کے ہاتھ میں ہے۔ پیغمبران علیہ السلام اللہ کے اذن پر جسے چاہتے ہیں اس مشعل کی روشنی میں

اللہ کی طرف راستہ دکھاتے ہیں۔ پیغمبران کا ہر عمل ان کی فکر کی روشنی میں ہے اور یہ روشنی اللہ کے اسماء کی روشنی ہے۔ مشعل کی ہر شعاع گویا پیغمبر کی ایک فکر ہے جو دنیاوی زندگی میں ان کی ایک صلاحیت بن کر ابھرتی ہے۔ خوش مزاجی بھی اسی مشعل کی روشنی کی ایک شعاع ہے جس کا مظاہرہ پیغمبروں کے ذریعے ہوا ہے۔ روحانی مشعل کی روشنی میں ایک روحانی طالب علم بھی اس روشنی سے مستفیض ہوتا ہے اور پھر وہ اپنی سکت کے مطابق ان انوار کو جذب کر کے ان کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خیال رہے کہ کسی بھی فکر کے مظاہرے کا انتہائی درجہ پیغمبروں کے اعمال وافعال ہیں اور ایک روحانی طالب علم کے لیے انہی کی زندگی مشعل راہ ہے۔ اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آدابِ مجلس

۱۔ ہر حال میں بااخلاق، بامعنی اور روحانی گفتگو۔ فضول گوئی سے پرہیز، بولنے میں اپنی باری کا انتظار، مجلس میں بولنے والے کو دل لگا کے سننے والا۔ مجلس برخاست ہونے سے پہلے نہ اٹھنے والا آداب مجلس سے واقف مانا جائے گا۔

۲۔ بادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ ان کلمات پر عمل کرنے والا آداب مجلس سے واقف ہو جاتا ہے۔

www.ksars.org

۳۔ مجلس دو آدمیوں کی ہو یا بہت سے آدمیوں کی۔اس میں سب سے بڑاادب یہ ہے کہ کوئی بات نیگیٹو انداز میں نہ کی جائے کہ جس سے کسی کا دل دکھے کیونکہ آدمی آدمی کی دوا ہے نہ کی آدمی آدمی کے لیے زہر۔

۴۔ مجلس میں دوسروں کے نقطہ نظر اور ان کے تاثرات کا خیال رکھنا چاہیے۔چہرے پر غم نہیں بلکہ خوشی کا تاثر ہونا چاہیے۔سوائے ایسی جگہ کہ جہاں دوسرے کے غم میں شرکت کی خاطر ہو،قرآن وحدیث کی کوئی بات ایسی نہیں کرنی چاہیے جس سے آپ اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ مجلس میں اس طرح بیٹھنا چاہیے جیسے آپ عبادت میں مصروف ہیں اور اللہ کو آپ کو دیکھ رہا ہے کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جس مجلس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے وہاں فرشتے نازل ہوتے ہیں اور مجلس کے اختتام تک وہیں رہتے ہیں۔

۵۔ روحانی طالب علم یا سالک چونکہ منزل بہ منزل ترقی کرتا ہوا حضور پاک ﷺ کی مجلس تک پہنچتا ہے اور ان کی مجلس کے آداب وہ اپنے پیر و مرشد کی مجلس میں سیکھتا ہے۔آداب مجلس جاننے والا آدمی ہی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

۶۔ مجلس میں داخل ہوتے ہی حاضرین کو سلام کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہر کام اللہ کی سلامتی اور اللہ کی رحمتوں کے ساتھ شروع کرے۔آداب مجلس کا یہ پہلا اصول ہے۔ایک روحانی طالب علم کسی بھی محفل میں بغیر جگہ کا تعین کیے ہوئے جہاں بھی جگہ ملے بیٹھ جاتا ہے۔اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکلے جس سے دوسروں کا دل دکھے۔ صرف خود ہی نہ بولتا رہے بلکہ دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دے۔اگر حاضرین محفل سے کسی بات پر اتفاق نہ ہو تو ایک دو بار اپنی رائے کا اظہار کرے اور پھر خاموش ہو جائے۔ مجلس میں نرم اور مٹھاس بھرے لہجے میں بات کرنا چاہیے۔اسلام مساوات سکھاتا ہے۔اس لیے محفل میں ہر چھوٹے بڑے کا خیال رکھنا چاہیے۔

www.ksars.org

۷۔ ہمارے حضور پاک ﷺ ادب کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ حضور پاک ﷺ کے فرمان کے مطابق بہترین محفل وہ ہے جہاں اللہ کا ذکر ہے۔ محفل میں جا کر سب کو سلام کرنا۔ دوسروں کی بات دھیان سے سننا۔ زیادہ اونچی آواز میں نہ بولنا۔ قہقہے نہ لگانا بلکہ چہرے پر مسکراہٹ رکھنا سب آداب مجلس میں آتا ہے۔

۸۔ اچھے لوگوں کی صحبت سے آدمی پر اچھا اثر ہوتا۔ اچھی مجلس میں علم کی باتوں کے ساتھ ساتھ دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔ مجلس کے آداب میں یہ بات بہت ضروری ہے کہ آدمی خود کو دوسروں سے برتر نہ سمجھے۔

۹۔ آداب مجلس میں میزبان کے لیے ضروری ہے کہ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے صاف ستھری جگہ کا انتظام کرے اور ان کی تواضع کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کھانے کا انتظام کرے۔ مہمانوں کے لیے لازم ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر جائیں اور تہذیب اور خوش اخلاقی کے ساتھ محفل میں شرکت کریں۔ میزبان پر کسی طریقے سے بوجھ نہ بنیں اور میزبان کا شکریہ ادا کریں۔

۱۰۔ آدمی کی پہچان اس کے دوستوں سے ہوتی ہے۔ اگر دوست اچھے ہوں گے تو مجلس بھی اچھی ہو گی۔ اچھی مجلس میں آدمی مجلس کے آداب سیکھتا ہے۔ اس لیے آداب مجلس سیکھنے کے ساتھ ساتھ دوستی کا حلقہ بھی بہترین ہونا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ آداب مجلس کے آداب کیا کیا ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ اس کی تشریح کریں۔

www.ksars.org

سوال نمبر۳۔ صحبت کااثر شخصیت پر کس طرح اثرانداز ہوتا ہے۔

سوال نمبر۴۔ ایک لمحے کا تقرب سو سالہ نفلی عبادت سے افضل ہے، یہ کس کے بارے میں کہا گیا ہے، اس کی تفصیل بیان کریں۔

☆☆☆☆☆

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک نفس سے تمہیں پیدا کیا۔ایک نفس یا نفس واحدہ کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسانی کی فطرت ایک ہے۔اپنے نفس کو پہچاننے کا نام ادب ہے جو آدمی اپنے نفس کو پہچان لیتا ہے اور اپنے اندر کام کرنے والی فطرت کے آداب جان لیتا ہے وہ دوسروں کے درمیان بھی آداب کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔اللہ پاک کے نزدیک سب سے بڑا گناہ جہل ہے جس کی نشانی شیطان ہے۔شیطان اپنی جاہلیت کی وجہ سے راندہ درگاہ ہوا اور آدم اپنے علم کی وجہ سے مقبول بارگاہ الٰہی ہوا۔شیطان نے اپنے جہل کو اپنا علم قرار دیا۔اس کی نگاہ نے حقیقی علوم پر اپنے جہل کا پردہ ڈال دیا اور اسی وجہ سے اس کے اندر تکبر ابھر آیا۔وہ جہالت و تکبر کے خول میں یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس وقت اس علیم و خبیر کی بارگاہ میں حاضر ہے۔وہ اپنے رب کی بارگاہ عظیم میں گستاخی کا مرتکب ہوا۔اگر اسے اپنے نفس کی پہچان اور ادب ہوتا ہے تو اپنے خالق کی بارگاہ ادب کا بھی اسے لحاظ ہوتا اور اس کے آداب وہ جان لیتا۔قرآن کی ہر تمثیل اللہ کے علوم کی ایک کتاب ہے جس کے علوم آدم کو عطا کیے گئے ہیں اور ہر انسان پر ان کا جاننا ضروری ہے۔قرآن کی ہر تمثیل میں اللہ کی کوئی نہ کوئی فکر اور ارادہ کام کر رہا ہے۔جب ان آیات میں غور و فکر کیا جائے تو اس کے پردے میں اللہ کی حکمت دکھائی دیتی ہے۔اللہ کے ارادے کی تحریک اس کے امر کا دائرہ ہے جو لوح محفوظ کی ایک تمثیل ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہر شئے اللہ کی جانب سے آرہی ہے اور اللہ ہی کی جانب لوٹ کر جانے والی ہے۔گویا لوح محفوظ کی ہر تمثیل ازل سے ابد تک اپنے امر کی حرکت کا دائرہ پورا کرتی ہے۔مخلوق کی نظر اس دائرے میں اپنے آپ کو دیکھتی ہے۔نظر جہاں تک پہنچتی ہے وہیں تک ذہن کی بھی رسائی ہوتی ہے جیسے ہاتھی کے اوپر اگر چیونٹی چڑھ جائے تو اگر اس کے دانت پر چڑھے گی تو یہی سمجھے گی کہ سارا ہاتھی ہی سفید چکنا اور سخت ہے اور اگر پاؤں پر چڑھے گی تو یہی کہ ہاتھی ایک سیاہ ستون ہے کیونکہ چیونٹی کی

www.ksars.org

نگاہ ہاتھی کو پورا کا پورا نہیں دیکھ سکتی جس کی وجہ سے وہ ہاتھی کے جسم کے مختلف حصوں کی کڑیاں نہیں ملا سکتی۔ اور اپنے تھوڑے علم کو کامل سمجھ لیتی ہے۔ مگر اس علم سے حقیقت آشکار نہیں ہو گی بلکہ حقیقت پر باطل کا پردہ پڑ جاتا ہے کہ جس نے ہاتھی نہ دیکھا ہو وہ چیونٹی کی بتائی ہوئی تعریف پر کبھی بھی ہاتھی کی شناخت نہیں کر سکتا کہ وہ تو ہاتھی کا سارا وجود ہاتھی کا دانت سمجھے گا یا پھر ایک ستون اور پھر باطل کو حقیقت جان کر اپنی بات منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جائے گا۔ شیطان کی بھی یہی مثال بیان کی گئی ہے کہ خود اس کی اپنی کوتاہ نظری اور کوتاہ ذہنی نے حقیقت کو اس کے اوپر منکشف نہ ہونے دیا اور اپنی بات منوانے کے لیے اس نے آدابِ مجلس کا بھی خیال نہ کیا کہ وہ کس کے ساتھ مخاطب ہے۔ کیونکہ وہ اپنے نفس کے چشمے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اس لیے اپنے سامنے اسے اور کوئی دکھائی ہی نہ دیا۔ اس پوری تمثیل میں اللہ تعالیٰ نے یہی نصیحت اور سبق رکھا ہے کہ نفس کو پہچاننے کا نام ہی ادب ہے جو آدمی اپنے نفس کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے وہ اپنے اندر فطرت کے تقاضوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے اور جب اپنی نوع کے دوسرے لوگوں سے ملتا ہے تو اسے یہ جانتے ہوئے دیر نہیں لگتی کہ دوسروں کے اندر بھی وہی تقاضے کام کر رہے ہیں جو اس کے اندر ہیں تب وہ لوگوں کے ساتھ میل جول کے اداب سیکھ بھی لیتا ہے اور ان پر عمل کر کے انہیں اچھی طرح نبھا بھی لیتا ہے۔

اس سلسلے میں سورہ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

”مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے لوگوں کے گھروں میں گھر والوں سے اجازت لیے بغیر اور ان کو سلام کیے بغیر داخل نہ ہوا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔“

ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں میں سلام کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کوئی ہیلو کہتا ہے، کوئی سلام کہتا ہے، کوئی نمستے

کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اصل میں سلام کے ذریعے ایک آدمی دوسرے آدمی کے درمیان اجنبیت کی دیوار گراتا ہے۔ اس کے بعد تخاطب کا ایک سلسلہ چل جاتا ہے اور ایک ذہن دوسرے ذہن کی لہروں کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے اور خیالات میں ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔ جس سے ماحول دوستانہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے اس بات کو لازم قرار

www.ksars.org

دے دیا کہ جب بھی کسی دوسرے کے گھر جاؤ تو ان کی اجازت لو اور پہلے سلام کرو۔ اجازت طلب کرنے میں پردہ اور حیا کا پہلو نکلتا ہے کہ ہر شخص دوسرے کے سامنے اپنے آپ کو بہتر طور پر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس میں جسمانی پردہ اور حیا بھی شامل ہے اور گھریلو معاملات میں بھی پردہ داری مطلوب ہے۔ پھر سلام کرنے سے گفتگو کا آغاز بہتر طور پر شروع ہو جاتا ہے اور دوستی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ تمام بنی نوع انسانی ایک خالق کی مخلوق کی اور ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے اللہ پاک یہی چاہتے ہیں کہ خلق خدا آپس میں انس و محبت کے رشتے میں بندھے رہیں تاکہ دلوں کو سکون رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی جانب سے ایسے اصول بنائے گئے ہیں جن اصولوں کی پیروی کرنے سے بنی نوع انسانی کو راحت و سکون میسر اتا ہے اور دنیا میں امن چین قائم ہو جاتا ہے۔ سورہ نور کی اس آیت میں اللہ پاک نے مومنین کو مخاطب کیا ہے کہ

''اے مومنو! آپ سب جانتے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کے سینے کے اندر اللہ کا نور ذخیرہ ہوتا ہے۔ مومن اللہ کے نور کے ذریعے سے ہر شئے کو پہچانتا ہے۔ یہاں مومنوں کو مخاطب کرنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قانون ہے جو مومنین کے لیے لازمی ہے۔ مومن روحانی شعور رکھنے والے کو کہتے ہیں کیونکہ نور کا شعور ہی روح کا شعور ہے۔ پس اللہ پاک نے مومنوں کو مخاطب کر کے جو یہ حکم دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو اللہ کا حکم سب کے لیے ہے مگر مومن کے لیے اس پر عمل کرنا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جنت میں جب لوگ جائیں گے تو وہ امنے سامنے بیٹھے ہوں گے اور ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنت میں بھی سلام کرنے کا قانون اور اصول رائج ہے۔ جنت کا شعور روحانی شعور ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے روحانی بندوں کے لیے سلام کرنے کی تاکید کر دی اور گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کرنا ضروری قرار دے دیا تاکہ ایک روحانی آدمی کے اندر روحانی شعور زیادہ سے زیادہ متحرک ہو جائے اور وہ روحانی اصولوں کی جانکاری حاصل کر کے ان پر عمل کرنا اپنا معمول بنالے۔ اس طرح اس کا شعور روحانی شعور کے تابع ہو کر کام کرے گا اور روح کا ارادہ شعور میں منتقل ہو جائے گا۔ پھر ہر کام اللہ کے امر کے عین مطابق ہو جائے گا۔ روح کے آداب مجلس سیکھ کر شعور بھی عملی طور پر روح کا ساتھ دے سکے گا۔ اس سے ایک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ایک روحانی شخصیت کے لیے اپنے کردار کا ہر پہلو روح کے ادب و آداب کے مطابق اختیار کرنا چاہیے۔ مومن کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کی ہر حرکت سے اللہ کے امر کی نشاندہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کے ہر عمل میں اللہ کی رضا

www.ksars.org

شامل ہو۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی عقل و شعور پر روحانی عقل و شعور غالب آجائے اور وہ روحانی عقل کے ذریعے کائنات کو اور اللہ کو پہچان لے۔

اللہ پاک نے اپنے کلام میں فرمایا ہے۔

''مومنو! جب تم سے کہا کہ مجلس میں کھل کر بیٹھا کرو۔ خدا تم کو کشادگی بخشے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا اور خدا تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔'' (سورہ المجادلہ)

ان آیات میں بھی مومنو کو مخاطب کیا گیا ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایسا کرنے سے ان کے درجات میں اضافہ ہو گا۔ درجات میں بلندی سے مراد شعور میں زیادہ سے زیادہ وسعت ہے۔ شعور میں وسعت روح کی روشنیوں کے جذب کرنے سے آتی ہے۔ روح کا نور جتنا زیادہ سے زیادہ دل میں اور عقل میں جذب ہو گا اتنا ہی زیادہ حواس کا پھیلاؤ ہو گا اور حواس کا جتنا زیادہ پھیلاؤ ہو گا اتنا ہی زیادہ علم میں اضافہ ہو گا۔ علم میں جتنا زیادہ اضافہ ہو گا بندہ اللہ کے اور غیب کے قریب ہو سکے گا۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ مومن کی ہر حرکت اس کے قلب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مجلس میں جب ایک روحانی بندہ لوگوں میں بہت گھس کر بیٹھنے کی بجائے ذرا کھل کر بیٹھتا ہے تو اس سے اس کا ذہن بھی ہلکا اور کشادہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب بہت گنجان اور ملے ملے بیٹھیں تو دھیان اس شخص کی طرف زیادہ جاتا ہے بہ نسبت محفل میں دوسرے ذکر و اذکار کی جانب جانے کے قریب رہنے پر اس کی جسمانی حرکت اور پسینے وغیرہ کی بو ہر وقت آئے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کر لی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس میں کشادہ بیٹھنے سے دل میں کشادگی آنے کا لکھا ہے کہ دوسرے کے لیے ذہن و دل میں کوئی ناگوار خیال نہ آئے۔ میزبان کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے سے اس کے گھر کا دروازہ مہمان پر کھل جاتا ہے اور محبت و انس اور دوستی کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کہنے پر اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جب آداب مجلس کو ملحوظ خاطر رکھ کر ایک دوسرے کا خیال رکھا جاتا ہے تو اس سے اللہ پاک اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ روحانیت میں انہیں ترقی ہوتی ہے۔ اس کا

www.ksars.org

مطلب یہ کہ جب کوئی اللہ کے بندوں کی خوشی اور ان کے آرام کا خیال رکھتا ہے تو اللہ بھی اس کے آرام و پسند کا خیال رکھتا ہے۔ آداب مجلس کا ہر اصول لوگوں کے درمیان انس و محبت، اخوت و ہمدردی اور بھائی چارہ پیدا کرنے کے لیے ہے تاکہ لوگوں میں اپس میں بلا تفریق مذہب وملت رنگ و نسل ایسے تعلقات قائم ہوں جن سے ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فطرت کا اظہار ہو سکے اور فطرت سے قریب ہو کر وہ اپنے رب کو پہچان لیں۔ دنیاوی لحاظ سے بھی ان اصولوں پر کاربند رہنے سے اپس میں ایسے رشتے قائم ہو جاتے ہیں جن پر معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور دنیاوی معاملات میں ایک دوسرے سے مدد ملتی ہے۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔

وہ محفل جس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے اللہ پاک کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ محفل میں اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اللہ پاک بھی اس بندے کا ذکر فرشتوں کی مجلس میں کرتے ہیں اور فرشتوں کو اس بندے پر اور اس مجلس کے تمام اراکین پر رحمتیں اور نعمتیں نازل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک ایسی مجلس میں اپنی پوری توجہ کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور اپنی خوشی کا اظہار فرشتوں کے سامنے کرتا ہے۔ ایک روحانی طالب علم روحانی علوم سیکھنے کے لیے ایسی ہی مجلسوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے جہاں اللہ کا ذکر ہو۔ اللہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اللہ پاک کی توجہ ایسی مجلسوں کو نورانی بنا دیتی ہے۔ نور خواہ آنکھ سے نظر نہ آئے مگر اس کے اثرات ہمارا قلب ضرور قبول کرتا ہے اور ہمارے اندر کثافت دور ہوتی ہے۔ نور کی لطافت اور پاکی ہمارے قلوب اور نفس پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہے کہ اس پاک مجلس کا ایک رعب ہمارے اوپر طاری ہو جاتا ہے اور نفس اس سے ادب سیکھتا ہے اور مجلس کے آداب خود بخود آجاتے ہیں۔ آدمی مجلس کے آداب مجلس میں بیٹھنے سے ہی سیکھتا ہے۔ آدمی کے اندر نقل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اچھی بات کی نقل کرنا انسانیت ہے جب کہ فضول باتوں اور بے ہودہ حرکتوں کی نقل کرنا بندر کا کام ہے اور یہ انسان کو انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے۔ چناچہ مجلس کے اداب سیکھنے کے لیے آدمی کو ایسی مجلس میں شرکت کرنا چاہیے جہاں سے وہ کچھ سیکھ سکے اور کچھ حاصل کر سکے۔ ورنہ ضیاع وقت ہوگا۔ روحانی محفل میں گزارہ ہوا ہر لمحہ عبادت میں شمار ہوتا ہے کیونکہ جس طرح عبادت کے ذریعے اللہ کا نور قلب وذہن میں جذب ہوتا ہے، روحانی محفلوں میں بھی اللہ کے ذکر کے انوار منتقل ہوتے ہیں۔ جس سے روحانی شعور بیدار اور متحرک ہوتا ہے۔

www.ksars.org

اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

www.ksars.org

نام ونمود کی خواہش

۱۔ خواہش نام ونمود شیطنت ہے۔ باباجی کا ارشاد ہے کہ حاسد، متکبر، غصیلا اور وہ بندہ جس میں خواہش نام ونمود ہو وہ روحانی ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ کائنات کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی جو فکر کام کر رہی ہے وہ فکر یہ ہے کہ ''میں اپنی صفات کے ساتھ مخلوق میں پہچانا جاؤں۔'' کائنات کے ذرے ذرے کو اللہ پاک کی یہ فکر منتقل ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ہر شئے اپنے اندر کی صلاحیتوں کا اظہار کر رہی ہے۔ مگر جب اس اظہار کا رخ بندے کی اپنی ذاتی انا کی جانب ہو جاتا ہے تو اس کے اندر تکبر پیدا ہو جاتا ہے اسی کی وجہ سے دوسری برائیاں بھی جنم لیتی ہیں جس میں سے ایک خواہش نام ونمود بھی ہے۔

۳۔ خواہش نام ونمود انا کی خواہش ہے اور انا تو صرف اللہ ہی کی ہے۔ ایک روحانی آدمی میں ایسی خواہش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ روحانی تعلیمات اپنی انا کی نفی کرنا سکھاتی ہیں بلکہ اپنے کام میں اللہ کی توفیق اور اس کی رضا کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

۴۔ خواہش نام ونمود دراصل ہوس وحرص کا دوسرا نام ہے۔ اس سے اپنی انانیت کو تقویت پہنچتی ہے اور انسانیت کی تقویت روحانی طرزِ فکر کے بالکل ہی برعکس ہے۔

۵۔ خواہش نام ونمود آدمی کو اپنے خول میں بند کر دیتی ہے کیونکہ اس کی ہر سوچ انفرادی ہوتی ہے جب کہ روحانی طرزِ فکر آدمی کو کل ذات سے متعارف کراتی ہے۔

www.ksars.org

۶۔ کبر و تکبر کی وجہ سے آدمی کے اندر خواہش نام و نمود پیدا ہوتی ہے۔ انسان فانی ہے اسے ایک نہ ایک دن فنا ہو ہی جانا ہے۔ ہمیشہ نام صرف اللہ ہی کا باقی رہنے والا ہے۔ یہ خواہش نہایت ہی منفی سوچ ہے جو روحانی آدمی میں تو کیا کسی عام آدمی میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

۷۔ روحانی ترقی میں جاہ طلبی اور خود نمائی بنیادی رکاوٹ ہے کیونکہ روحانی سفر میں آپ کو اپنی انا کی مکمل نفی کرنی پڑتی ہے۔ نام و نمود کی خواہش انا کو سرکش اور باغی بنا دیتی ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''جو اپنے رب سے ملنے کی خواہش رکھے اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔'' خواہش نام و نمود چونکہ اخلاص اور للہیت کے خلاف ہے اس لئے یہ بھی شرک ہے۔ نتیجتاً خواہش نام و نمود رکھنے والا بندہ اللہ کو نہیں پا سکتا۔ آدمی جتنا عجز و انکسار اور کسر نفسی سے کام لیتا ہے اتنا ہی وہ ہر دل عزیز ہوتا ہے۔ بقول شاعر کہ ''دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے۔'' عموماً دیکھا گیا ہے کہ خواہش نام و نمود رکھنے والے بندے شیخی بگھارتے ہیں جب کہ اللہ پاک کسی شیخی بگھارنے والے ناشکرے کو پسند نہیں کرتے۔

۹۔ روحانی آدمی کے پیشِ نظر اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہونی چاہیے۔ جیسے ہی انسان کے اندر خواہش نام و نمود پیدا ہوتی ہے اس کی فکر میں محدودیت اور جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اللہ چونکہ لامحدود ہستی ہے تو لامحدود طرزِ فکر ہی اللہ سے ملا سکتی ہے

۱۰۔ تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ قدیم سے اللہ نے جب انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ خود کو خدا سمجھ بیٹھا۔ اس کی واضح مثال فرعون کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا ہے۔ تکبر اور خواہش نام و نمود فرعونیت ہے۔

۱۱۔ جب آدمی کے اندر خواہش نام و نمود ابھرتی ہے تو وہ حلال اور حرام کا فرق بھول جاتا ہے۔

www.ksars.org

۱۲۔ خواہش نام ونمود سے آدمی اپنے اعمال کا ریکارڈ خراب کرتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن ایک سخی کا حساب کتاب ہو رہا ہو گا اور وہ کہے گا کہ اے اللہ میں نے آپ کے راستے میں اتنا اتنا مال خرچ کیا۔ اللہ پاک فرمائیں گے وہ تو تو نے میرے لیے نہیں بلکہ اپنے نام ونمود اور شہرت کے لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا سخی آدمی ہے اور یہ شہرت تجھے دنیا میں حاصل ہو چکی۔ اسی طرح ایک مجاہد کو لایا جائے گا وہ کہے گا میں نے تیرے راستے میں اپنی جان دے دی۔ اللہ پاک فرمائیں گے تو نے اس لیے جان دی کہ تو لوگوں میں بہادر کہلائے وہ کہہ چکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کام میں اخلاص کی بجائے خواہش نام ونمود ہوتی ہے وہ عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ خود نمائی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ انفرادی اور اجتماعی سوچ میں کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۳۔ کبر و تکبر کے کیا نقصانات ہیں؟ بیان کریں۔

سوال نمبر ۴۔ ''ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں'' اس کی تشریح کریں۔

سوال نمبر ۵۔ غصہ کے کیا کیا نقصانات ہیں؟ بیان کریں۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

قانون قدرت کے مطابق ہمارے اندر تقاضے بھی دو رخوں میں تخلیق ہو رہے ہیں۔ایک رخ میں تقاضوں کا مرکز اپنی ذاتی انا ہوتی ہے دوسرے رخ میں تقاضوں کا مرکز اللہ کی انا ہوتی ہے۔ہر وہ تقاضہ جس کا مرکز انسان کی ذاتی انا ہے وہ شیطنیت ہے۔آپ جانتے ہیں کہ شیطان نے نافرمانی ہی اس وجہ سے کی کہ اس کے سامنے صرف اپنی ذات تھی۔اپنی ذات کے آگے اس نے اپنے رب کو بھی بزرگ نہ جانا اور گستاخی پر اتر آیا۔پس ذاتی انا کا ہر تقاضہ اللہ سے دور کرنے والا ہے۔جب تقاضے کا مرکز اللہ کی انا ہوتی ہے تو ہر تقاضہ روح کا تقاضہ ہوتا ہے۔روح کا ہر تقاضہ وہ فطرت ہے جس میں اللہ کی حکمت اور مصلحت کام کر رہی ہے۔یعنی روح کے ہر تقاضے میں اللہ کی رضا شامل ہے۔روح کے تقاضے ہی شعور میں منتقل ہوتے ہیں اور جسمانی حرکات واعمال بنتے ہیں مگر خرابی اس وقت آتی ہے جب آدمی ان تقاضوں کے سورس اور مرکز سے واقف نہیں ہوتا یا واقف ہونے کے باوجود بھی انہیں اپنی ذات سے منسوب کر لیتا ہے تو فرد تو مٹی سے بنا ہے۔ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے۔اگر آدمی کی مرکزیت اپنی ہی ذات ہو گی تو عمل کا ہر ریکارڈ بھی اپنی ہی ذات تک محدود ہو جائے گا۔جب جسم پر موت وارد ہو جائے گی ور فرد کا دنیاوی شعور ختم ہو جائے گا تو اعمال کا ریکارڈ بھی ختم ہو جائے گا جب کہ سزا و جزا کا دارومدار اعمال پر ہے۔اگلی دنیا میں آدمی بالکل ہی مفلس اور تہی دست ہو گا۔اسی کے متعلق اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ”مومنو!اس شخص کی طرح مت ہو جانا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہے اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔یہ لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔اور خدا ایسے ناشکروں کی ہدایت نہیں دیا کرتا۔“(سورہ بقرہ ۲۶۴)

جس طرح کرنسی میں کھوٹے سکے کی کوئی قیمت نہیں ہے اسی طرح انفرادیت کے دائرے میں اعمال بھی کھوٹے سکے کی طرح ہیں۔جو آخرت کی دنیا میں قابل قبول نہیں ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ نے نام ونمود کی خاطر احسان جتانے والے کو سخت ناپسند فرمایا ہے اور صرف یہی نہیں کہ آدمی مال خرچ کرنے میں ہی دکھاوے سے کام لیتا ہے بلکہ اللہ پاک کی عبادت کرنے میں بھی دکھاوے سے کام لینا اللہ کے نزدیک سخت ناپسند فعل ہے۔ایسے ریاکار کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔چناچہ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ”خرابی ہے ایسے نمازیوں کی جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں۔“(سورہ الماعون)

www.ksars.org

اس آیت سے ہمیں یہ بھی ہدایت ملتی ہے کہ اپنی نمازوں اور عبادتوں کو پوشیدہ رکھنا چاہیے۔ انسان کا نفس نہایت ہی کمزور اور شیخی باز ہے۔ ضرورت سے زیادہ اپنی عبادات کا تذکرہ آدمی کے اندر ریاکاری پیدا کر دیتا ہے۔ درپردہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی عبادت کی وجہ سے وہ لوگوں میں متقی اور پرہیز گار مشہور ہو جائے گا اور لوگ اس کی عزت کریں۔ پس اسی بہانے اس کا ذہن اللہ کی خوشنودی سے ہٹ کر دنیاوالوں کی خونودی پر اٹک جاتا ہے اور اس کا ہر کام دنیاوی زندگی کے لئے ہو جاتا ہے مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے آدمی کی نقل کر کے اس سے کام سیکھتا ہے۔ ایسی صورت میں نیک اعمال اور عبادتیں بھی دوسرے کی نگاہ میں لائق تقلید ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں نیک اعمال کا ظاہر کرنا احسن ہے کہ یہ دوسرے کی جاہلیت دور کر کے اسے علم کی طرف راغب کرتا ہے۔

جب ہم گزشتہ ادوار میں روحانی بندوں کے واقعات اور طرزِ زندگی پر نظر کرتے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو ادب سکھانے سے پہلے خود ادب سیکھا اور جب خود اللہ کی راہوں سے واقف تب دوسرے کا ہاتھ تھاما تاکہ یقین کے ساتھ اسے اس راستے سے گزار دیں۔ حضرت عمرؓ کا قصہ ہے کہ ان کے دور خلافت میں ایک خاتون اپنے بچے کو لے کر آپ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں "یاامیر المومنین! یہ بچہ میٹھا بہت کھاتا ہے میری بات نہیں سنتا۔ آپ اسے منع فرمادیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "ایک ہفتے بعد فلاں دن آنا۔ وہ وقت مقررہ پر آگئیں، بچہ بھی ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ نے بچے کو اپنے پاس بلایا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بس یہ کہا کہ

"دیکھو بیٹے! زیادہ میٹھا کھانا اچھا نہیں ہے۔ آئندہ زیادہ میٹھا مت کھانا۔"

پھر ماں سے کہا کہ "بس ٹھیک ہے میں نے اسے نصیحت کر دی ہے اب یہ زیادہ میٹھا نہیں کھائے گا۔"

ماں سخت حیران ہوئی۔ کہنے لگی۔ "اے مومنین کے سردار! اگر اتنی سی بات کہنی تھی تو وہ تو آپ اسی دن کہہ سکتے تھے اس کے لیے ایک ہفتے کا انتظار کیوں کروایا۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ۔ "دراصل جب تم پہلی بار یہاں آئیں اس وقت میں خود میٹھے کا بڑا شوقین تھا اور میٹھا کھاتا تھا۔ اس ایک ہفتے میں میں نے میٹھا بالکل ترک کر دیا۔ بس اب بچے کے حق میں میری نصیحت بھی کام کرے گی۔"

www.ksars.org

اس سے ظاہر ہوا کہ جب تک آدمی اس چیز پر کاربند نہ ہو جائے دوسرے کو نصیحت کرنا فضول ہے۔ شعور کی تمام خرابیاں مٹی کی کثافتیں ہیں جس طرح گندے برتن میں دودھ جیسی سفید اور صاف شئے بھی خراب ہو جاتی ہے اسی طرح شیطانی طرزِ فکر کے زیرِ اثر عقل وشعور میں رحمانی فکر کو بھی شیطانی رنگ دے دیتا ہے۔ اپنے نفس کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے تمام روحانی مفکروں اور پیشواؤں نے اپنے شاگردوں کو سالہا سال تربیت کی۔ اس تربیت میں نفس کو ادب سکھانے والی ریاضتیں اور عبادتی بھی شامل ہیں اور نفس کو اس کی بے بسی، معذوری اور خلالت سے آشنا کرنے والی مشقیں بھی ہیں۔ ریاضتوں اور عبادتوں میں جسمانی سکھ اور آران کو ترک کرنے والے عملیات ہیں جب کہ خود اپنی نگاہ میں اپنے نفس کی بے وقعتی اور خلالت کو دکھانے والی مشقیں بھی ہیں تاکہ عزت نفس کا احساس ہی مٹ جائے اور اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق بندہ یہ بات یقین کی حد میں جان جائے کہ عزت بھی اللہ ہی کی جانب سے ہے اور ذلت بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ روحانی علوم سیکھنے کے لیے روحانی طرزِ فکر اختیار کرنا لازمی امر ہے اور روحانی طرزِ فکر اختیار کرنے کے لیے عبادتیں، ریاضتیں اور نفس کو قابو رکھنے والی مشقیں کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ روحانی طرزِ فکر کا مطلب یہ ہے کہ دماغ میں انے والے ہر خیال کو عقل روحانی طرزِ کے مطابق معنی پہنائے۔ ہر اطلاع جو شعور کو ملتی ہے وہ روح کی جانب سے ملتی ہے۔ روحانی طرزِ فکر میں روح کے ذہن سے اطلاع کو معنی پہنائے جاتے ہیں۔ قدرت کا قانون سب کے لیے یکساں طور پر کام کر رہا ہے۔ روحانی طرزِ فکر میں اپنی عقل وشعور کو ڈھالنے کے لیے جس طرح ایک روحانی بندے کو تربیتی دور سے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح ہر پیغمبر علیہ السلام بھی نبوت سے پہلے اس دور سے گزر چکے ہیں۔ پیغمبروں کے حالات زندگی ہمیں اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ تقریباً ہر پیغمبر نے اپنے بچپن ولڑکپن کے دور میں نبوت سے پہلے بکریاں ضرور چرائی ہیں۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس گئے تو وہ ان کی بکریاں چرانے پر مقرر تھے۔ پیغمبروں کی زندگی کا ہر عمل اللہ پاک کی زبردست حکمتوں کے ساتھ ہے اور باعث تقلید ہے۔ سوائے اس کے جس میں اللہ پاک نے ناخوشی کا اظہار فرمایا ہے جیسے حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ میں جانے کا واقعہ۔ مگر ایسے واقعہ بھی پیغمبروں کے اللہ پاک کی حکمت کے ساتھ ہیں اور ان کی یہ حکمت ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ پاک کن چیزوں کو پسند نہیں کرتے اور کون سی باتیں واعمال انسان کو اللہ کے غضب کا شکار بنا دیتی

www.ksars.org

ہیں تاکہ ان سے بچا جا سکے۔اب ہم پھر اس عمل کی جانب آتے ہیں جو آسمانی کتابوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ پیغمبروں کا عمل رہا ہے یعنی بکریاں چرانے کا عمل۔ غور کرنے پر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پیغمبرانہ طرزِ فکر کو استوار کرنے کے لیے بکریاں چرانے کا عمل ایک تربیتی مشق ہے۔ بکری اور بھیڑ انسانوں کے لیے بکریاں سب سے زیادہ ایثارانہ فطرت رکھتے ہیں۔ان کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ان کے کھالوں سے لباس بنایا جاتا ہے۔یہ نہایت بے ضرر جانور ہے۔گوشت کے ساتھ ساتھ ان کا دودھ بھی استعمال ہوتا ہے۔ غرض کہ ان کی ساری زندگی انسان کے لیے وقف ہے۔جب ہم پیغمبرانہ طرزِ زندگی پر غور کرتے ہیں تو ہم یہی دیکھتے ہیں کہ کسی بھی پیغمبر کی زندگی ان کی اپنے لیے نہ تھی بلکہ ان کی ساری زندگی مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت میں گزر گئی۔نہ انہوں نے اپنے بال بچوں کے لیے جائیدادیں بنا کر چھوڑیں، نہ ہی وہ اپنے بال بچوں کی ذمہ داری میں لگ کر امت کی طرف سے اور اپنے مشن سے غافل ہوئے۔نہ ہی وہ اپنے نفس کی خاطر داری میں کبھی مشغول ہوئے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع ہی سے انہیں پیغمبرانہ طرزِ فکر اختیار کرنے کی تربیت دی گئی۔اسی تربیت کا ایک حصہ بکریاں چرانے کا زمانہ بھی تھا تاکہ بکریوں کے قریب رہنے سے ان کے مزاج اور ان کی طرزِ زندگی کا مشاہدہ ہو اور چونکہ پیغمبرانہ طرزِ فکر کا انداز غور و فکر کرنا ہے۔اپنی فطرت کے مطابق پیغمبر اپنے مشاہدے میں غور و فکر کریں۔پس قدرت نے شروع ہی سے انہیں ایسے مواقع عطا فرمائے کہ وہ اپنی فطرت طبع کے مطابق غور و فکر کر کے اس میں سے مفید مطلب جواہر تلاش کریں۔روحانی علوم پیغمبروں کے علوم ہیں۔روحانی علوم سیکھنے کے لیے پیغمبرانہ طرزِ فکر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔پیغمبروں نے کبھی اپنی ذات کی حیثیت سے نہیں بلکہ کل بنی نوع انسانی کی حیثیت سے تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی وہ کچھ سوچتے اپنی ذات کو بحیثیت پوری قوم کے رکھ کر سوچتے اور ان کا ہر عمل تمام انسانوں کے لیے فائدے مند ثابت ہوتا۔جب اپنی ذات کی انفرادیت ہی ذہن سے نکل جائے تو آدمی کے اندر خواہش نام و نمود پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر آج ساری دنیا دیکھتی ہے کہ پیغمبروں کا نام ہر دور میں نہایت ہی عزت سے لیا جاتا رہا ہے اور ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ان کے کام دنیا میں پہلے کی طرح ہی باقی ہیں۔ہر موجودہ نسل آنے والی نسل کو ان کے نام روشناس کرانا اپنا فرض اور ذمہ سمجھتی ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب آدمی اپنے نفس سے فنا ہو جاتا ہے تو اللہ کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے۔پھر جس طرح اللہ کا نام ہمیشہ باقی ہے اسی طرح اس کا نام بھی جب تک اللہ چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم

www.ksars.org

نے کسی شئے کو محض نہیں بنایا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شئے کی پیدائش میں اللہ کا ارادہ کام کر رہا ہے۔روح کا ہر تقاضہ اللہ کا ارادہ ہے۔اللہ کا امر کائنات میں جو کچھ کرنا چاہتا ہے یا ارادے کا نور روح کے اندر منتقل ہو جاتا ہے اور روح کا تقاضہ بن جاتا ہے۔اس طرح کہ اللہ کا ارادہ جو کرنا چاہتا ہے روح کے اندر جب اللہ کے ارادے کی روشنی جذب ہوتی ہے تو روح کے اندر وہی کام کرنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے اور اس تقاضے کے اوپر روح فوراً عمل شروع کر دیتی ہے۔روح اس بات سے واقف ہے کہ اللہ اس سے یہ کام لینا چاہتا ہے۔روح کا تقاضہ جسم کے ذریعے تکمیل پاتا ہے۔جب جسمانی شعور یا مادی عقل اپنے اندر ابھرنے والے تقاضے کو نہیں جانتی اور ان کی حیثیت سے واقف نہیں ہو پاتی تو پھر وہ اسے جسم کا تقاضہ سمجھ لیتی ہے اور اپنی ذات سے منسوب کر لیتی ہے اور اپنی ذات سے منسوب کر لیتی ہے جس کی وجہ سے خرابیاں آتی ہیں۔عقل جب اپنی ذات کی طرف دیکھتی ہے تو اسے چھوٹا کام بھی بڑا دکھائی دیتا ہے اور اس کے اندر غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اور اپنے اعمال وافعال کو ظاہر کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔یہی اشتیاق لوگوں میں نام ونمود کی خواہش کو ابھارتا ہے۔ایک روحانی کردار کے لیے نفسانی خواہشات روحانی راستوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔یہی وجہ ہے کہ قدرت ایسے وسائل پیدا کرتی ہے کہ ان کے اندر کی انفرادی سوچ اجتماعی سوچ میں بدل جائے اور ان کی ذات سے مخلوق فائدہ فائدہ اٹھا سکے۔اللہ پاک روحانی علوم اپنے بندوں کو اسی لیے عطا کرتے ہیں تاکہ اللہ پاک دنیا میں اپنی مخلوق کے لیے جو ارام وآسائش بہم پہنچانا چاہتے ہیں وہ ان بندوں کے ذریعے سے عطا کریں اور بندوں کے اندر محرومی کا خوف دور کر کے ان کے ذہنوں کو سکون آشنا کریں اور انہیں اپنی جانوں کے لیے مستقل طور پر سکون وآرام پہنچانے والی ہستی سے روشناس کرادیں۔جب بندہ اللہ کے ارادے پر کام کرتا ہے تو اللہ اسے اپنے کام کے لیے چن لیتا ہے اور اس کا رابطہ لامحدودیت سے جا ملتا ہے پھر وہ اپنے نفس کی کمزوریوں اور خرابیوں سے امن حاصل کر لیتا ہے۔

www.ksars.org

رزق حلال

۱۔ حلال روزی نصف ایمان ہے۔ محنت سے کمائی ہوئی روزی اللہ کے نزدیک بہت ہی پسندیدہ عمل ہے۔

۲۔ حلال رزق میں اللہ پاک برکت ڈالتا ہے اور کئی چیزوں کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ آدمی کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ کیسے پوری ہوئی؟

۳۔ اللہ تعالیٰ حلال کو استعمال کرنے اور حرام سے اجتناب کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ حلال وہ ہے جس کے استعمال میں اللہ کی رضا شامل ہے اور حرام وہ ہے جو اس کے برعکس ہے۔

www.ksars.org

۴۔ اللہ پاک قرآن میں فرماتے ہیں کہ حلال اور طیب چیزیں کھاؤ۔ رزق حلال احسن عبادت ہے۔ رزق حلال سے صالح خون بنتا ہے اور مثبت طرزِ فکر بنتی ہے۔ رزق حلال کے ثمرات آئندہ نسلوں تک پہنچتے ہیں۔

۵۔ رزق حلال کی کاوش اور تگ ودو سے معاشی، معاشرتی اور کائناتی حرکت جاری وساری رہتی ہے۔

۶۔ رزق حلال کما کر فیملی کو سپورٹ کرنے میں اللہ کی صفت ربوبیت کا استعمال ہے۔

۷۔ رزق حلال کا استعمال احکام الٰہی کا عملی مظاہرہ ہے۔ رزق حلال کے ذریعے قرب خدا نصیب ہوتا ہے۔ حضور بابا جی فرماتے ہیں۔ حرام رزق کھانے والے کے اندر انوار جذب نہیں ہوتے۔

۸۔ حلال روزی کا استعمال بندے کے اندر اللہ کی طرزِ فکر پیدا کرتا ہے۔

۹۔ حلال روزی کے استعمال سے ذہن اور دل اللہ پاک کی فرمانبرداری کی جانب راغب ہوتا ہے۔

۱۰۔ آدمی جو کچھ کھاتا ہے اس خون بنتا ہے خون بدن میں داخل ہو کر جس طرح عضلات بناتا ہے اسی طرح دماغ اور دل میں داخل ہو کر خیالات اور حواس پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ حرام روزی سے جو خون بنتا ہے دل اور دماغ اس خون سے منفی اثرات جذب کرتے ہیں جس کی وجہ سے طرزِ فکر میں منفیت اور نافرمانی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ جس طرح انسان کی بنائی ہوئی موٹر میں مخصوص انرجی ڈالی جاتی ہے جیسے ڈیزل کی موٹر میں میں ڈیزل ہی ڈالا جاتا ہے اس طرح پیٹرول سے چلنے والی موٹر میں اسی قسم کا پیٹرول ڈالا جاتا ہے جو موٹر بنانے والے نے اس کے لیے منتخب کیا ہے۔ انسان بھی اللہ کی بنائی ہوئی مشین ہے اس کے اندر بھی وہی انرجی ڈالی جائے گی جو بنانے والے نے اس کے لیے منتخب کی ہے اور مخصوص کی ہے۔ یہ مخصوص انرجی حلال رزق سے فراہم ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سوالات

www.ksars.org

سوال نمبر ۱۔ رزق حلال عین عبادت ہے، تشریح کریں۔

سوال نمبر ۲۔ حرام روزی کے کیا کیا نقصانات ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ عذاب اور ثواب سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر ۴۔ جو لوگ سود کا کاروبار کرتے ہیں وہ اللہ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اس پر روشنی ڈالیں۔

☆☆☆☆☆

انسان کی زندگی میں رزق حلال کو بڑا دخل ہے۔ رزق حلال کے اثرات اور ثمرات آدمی اپنی ہی زندگی میں بہت جلد دیکھ لیتا ہے۔ آئے دن ہمارے سامنے ایسی مثالیں ایسے واقعات اور ایسے مشاہدات اتے رہتے ہیں کہ جس میں رزق حلال یا حرام کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے، گھر تباہ ہو جاتے ہیں، جانیں تلف ہو جاتی ہیں، موذی بیماریاں لگ جاتی ہیں، غرضیکہ حرام کی دولت سے آدمی اپنا سکون کھو بیٹھتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے جب کہ کھانا تو ایک ہی پیٹ میں جاتا ہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اللہ کو تمہاری قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری نیت پہنچتی ہے۔ ان آیات میں اللہ پاک نے عمل کے ریکارڈ کا قانون بیان کیا ہے۔ قانون یہ ہے کہ ہر عمل اور ہر حرکت کے دو رخ ہیں۔ ہم ان دو رخوں کو دو ریکارڈ کہتے ہیں۔ ایک ریکارڈ عمل یا حرکت کی ظاہری صورت ہے۔ دوسرا ریکارڈ عمل کی باطنی صورت ہے۔ ظاہری اور مادی صورت میں ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے قربانی کی مثال دی ہے تو قربانی کا ارادہ جب کیا جائے گا اس ارادے کی تکمیل کے لیے جانور کی ضرورت ہے اور بھی چیزیں جو اس سلسلے میں درکار ہیں وہ تمام وسائل کے زمرے میں شامل ہیں۔ جس طرح قربانی کا عمل ظاہر میں انجام کو پہنچا اور قربانی ہو گئی، جانور ذبح ہوا، خون بہا اس کا گوشت کھایا گیا بالکل اسی طرح باطنی رخ میں بھی قربانی کے عمل کی فلمبندی ہوتی ہے۔ یہ فلمبندی ظاہری حرکات کی نہیں ہے۔ ظاہری حرکات کی فلمبندی تو عمل کا عملی مظاہرہ ہے بلکہ یہ فلمبندی قربانی کے عمل میں دلی کیفیات کی ہے کہ قربانی کا ارادہ کرتے وقت اور قربانی کے عمل کے اختتام تک دل کی جو جو کیفیات تھیں، ان کی الگ فلم بن جاتی ہے اس طرح ہر عمل کے دو ریکارڈ بنتے ہیں جو ریکارڈ ظاہری ہوتا مرنے کے بعد ظاہری جسم کت ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی تلف ہو جاتا ہے یعنی مرنے

www.ksars.org

کے بعد یہ جانور گوشت پوست کی حیثیت سے آپ کو نہیں ملے گا کیونکہ مرنے کے بعد جس طرح ہمارا گوشت پوست کا جسم مٹی کے ذرات میں منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح دنیا کی ہر شئے کا جسم مٹی کے ذرات میں منتقل ہو جاتا ہے اور روشنیوں کے جسم کے ساتھ اعراف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر عمل میں دلی کیفیات جس کو اللہ پاک نے نیت کہا ہے یہ روشنیوں کے جسم یا اعراف کے جسم مثالی کا عمل ہے۔اس کا مطلب

ہر عمل جو آدمی کرتا ہے۔ یہ دو جسموں کے ساتھ کرتا ہے ایک مادی جسم کے ساتھ اور ایک روشنیوں کے جسم مثالی کے ساتھ،مادی جسم کے ساتھ جو کرتا ہے وہ مادی جسم کی حرکت ہے۔مادی جسم کے فنا ہونے کے بعد یہ حرکت بھی ختم ہو جاتی ہے مگر روشنیوں کے جسم کے ساتھ جو حرکت کرتا ہے یہ حرکت روشنیوں کے جسم باقی رہتی ہے حافظے کا ریکارڈ بن کر۔ مرنے کے بعد جسم مثالی اپنے حافظے کے ریکارڈ کو دہراتا ہے اور اس سے وہی حرکات سرزد ہوتی ہیں جو اس ریکارڈ میں فیڈ ہوتی ہیں مگر چونکہ اب مرنے کے بعد ہم خود بحیثیت جسم مثالی کے زندگی گزارتے ہیں جس کی وجہ سے عمل کی ہر حرکت روشنیوں کے جسم کے حواس بن جاتی ہے۔ جس طرح دنیا میں عمل کی ہر حرکت مادی جسم کے حواس بنتی ہے اور ہم قربانی کا جانور ذبح بھی کرتے ہیں۔اس کے گوشت کا مزا بھی چکھتے ہیں۔ دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔اس پورے عمل میں جو کچھ دلی کیفیات ہیں یہ جسم مثالی کا شعور ہے کہ اس نے اس عمل کو کس نظر سے دیکھا۔اب جس طرح اس نے دیکھا بالکل اسی طرح اعراف میں وہ اس عمل کی کاپی کرتا ہے اور ہم روشنیوں کے جسم کے احساس کے ساتھ قربانی کے عمل کو محسوس کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ جو کچھ دنیا میں کرتا ہے ہر عمل دو رخوں میں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ایک رخ میں تو ہم مادی جسم کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں۔ مرنے کے بعد دوسرے رخ میں روشنیوں کے جسم کے ساتھ دیکھ لیں گے۔تب کہیں جا کر ایک عمل انجام پائے گا مگر جس طرح خوشی اور غم یہاں محسوس کیا جاتا ہے وہاں بھی خوشی اور غم کی کیفیات ہوں گی چونکہ مادی جسم سے ہزاروں گنا روشنی کے جسم کا احساس ہے یہی وجہ ہے کہ اعمال کو درست رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روشنی کی رفتار مادے سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔مادے اور روشنی کی رفتار سے مراد ذہن کی اور حواس کی رفتار ہے۔اس رفتار کو ہم یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر مادی جسم نے حلال کا ایک لقمہ کھایا تو روشنی کے جسم نے حلال کے دس ہزار یا اس سے زیادہ لقمے کھائے۔ روشنیوں کے جسم مثالی کی حرکت مادی جسم سے دس

www.ksars.org

ہزار گنا زیادہ سے لے کر ساٹھ ہزار گنا زیادہ تک ہے۔اب اسی حساب سے ہم رزق حرام کا تصور کرتے ہیں۔مادی جسم اگر ایک لقمہ حرام کا کھاتا ہے تو جسم مثالی کم از کم دس ہزار لقمے حرام کے کھا جاتا ہے۔آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ غذا سے خون بنتا ہے اور خون سے زندگی کی حرکت جسمانی طور پر جاری رہتی ہے۔حرام اور حلال می فرق یہ ہے کہ حرام میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہے اور حلال میں اللہ کی رضا شامل ہے۔اب صورتحال یہ بنی کہ جب ہم حلال کا ایک لقمہ کھاتے ہیں تو اللہ خوش ہو کر کہتا ہے دیکھو میرا بندہ میرے حکم سے کھا رہا ہے جیسا میں نے اس سے کہا ویسا کر رہا ہے اور جب حرام کا ایک لقمہ کھاتا ہے تو اللہ بندے سے سخت ناخوش ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ میرا نافرمان ہے۔میں نے اسے منع کیا پھر بھی کھا لیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ ہمیں کیوں اجازت دیتا ہے یا منع کرتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے تھوڑی دیر کو آپ اپنے آپ کو ماں باپ کے روپ میں دیکھیں۔ویسے بھی آپ میں سے اکثر ماں یا باپ ہیں۔اب غور کریں کہ آپ اپنے بچے کو کسی چیز سے کیوں روکتے ہیں اور کسی چیز کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔آپ یہی کہیں گے کہ بچے کی بھلائی کے لیے ایسا کرتے ہیں۔اللہ بھی تو ماں اور باپ کی جگہ ہے اس نے سب کو پیدا کیا ہے پھر اگر وہ روکتا ہے یا اجازت دیتا ہے تو اس پر الزام کیوں ہے نافرمان بچہ سرکش ہوتا ہے اور سرکشی کی وجہ سے نافرمانی کا نقصان اٹھاتا ہے۔مگر بچے کے دکھ پر ماں باپ بھی تو دکھ اٹھاتے ہیں۔اگرچہ بچے کی سرکشی میں ان کا دخل نہیں ہوتا وہ تو پہلے ہی بچے کو تنبیہ کر چکے ہوتے ہیں پھر دکھ کیوں اٹھاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ ماں باپ اور بچے کے درمیان ایک تعلق ہے جس طرح ماں کے پیٹ میں بچے کا تعلق ماں کے ساتھ ہوتا ہے اور ناف کی نالی کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ماں جو کچھ کھاتی ہے اس نالی کے ذریعے سے بچے کو خوراک پہنچتی ہے۔اسی طرح بچہ پیدا ہونے کے بعد جسمانی طور پر تو ناف کا یہ تعلق کٹ جاتا ہے مگر جسم مثالی کے ساتھ بچے کے جسم مثالی کا رشتہ روشنی کے تار سے بندھا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بچے کے جسم مثالی سے اس کے دل کی تمام کیفیات روشنی کی صورت میں ماں باپ کو اور ماں باپ کی دلی کیفیات روشنی کی صورت میں بچے کو منتقل ہوتی رہتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو اس ربط کے ذریعے محسوس کرتے ہیں۔یہی صورتحال اللہ اور اس کی مخلوق کی ہے کہ تمام مخلوق اللہ کے ساتھ انا کے رشتے سے منسلک ہے۔اللہ کہتا ہے یہ میری تخلیق ہے۔جب بندہ اللہ کی رضا کا کام کرتا ہے تو اللہ خوش ہو کر کہتا ہے یہ میری تخلیق ہے۔جب بندہ اللہ کی رضا کا کام کرتا ہے تو اللہ خوش ہو کر کہتا ہے یہ میرا بندہ ہے جس

www.ksars.org

نے ایسا اچھا کام کیا ہے۔ جب سرکشی کرتا ہے تب ناراض بھی ہوتا ہے مگر اس کی ناراضگی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ سرکشی کی وجہ سے بندے کو نقصان پہنچتا ہے۔ جیسے بچہ منع کرنے کے باوجود اپنا ہاتھ جلا بیٹھے۔ اب ماں باپ اسے برا بھلا کہیں گے تو اس وجہ سے کہ بچے کا ہاتھ جل گیا۔ اس کے ہاتھ جلنے کی تکلیف ماں باپ کو ہوئی۔ اللہ کی ناراضگی بھی بندے کی تکلیف کی وجہ سے ہے۔ اللہ کا بندے کے عمل سے نہ کچھ سنورتا ہے نہ بگڑتا ہے۔ بس انا کا تعلق اللہ اور مخلوق کے درمیان مخبری کا باعث بنتا ہے کہ اللہ مخلوق کے ہر عمل اور ہر حرکت سے باخبر رہتا ہے اور انا کا تعلق کبھی ختم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ تمام مخلوق کا خالق اللہ ہی ہے۔ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مسافر ہے جس کا سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے اور کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ سے کہتا ہے۔ یا اللہ یا اللہ۔ حالانکہ اس کا کھانا پینا پہننا سب حرام مال سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا کیسے قبول کرے۔ حالانکہ ایک اور حدیث میں ہے کہ مسافر کی دعا اللہ قبول کرتا ہے۔

حال ہی میں امریکہ میں ایک سروے کیا گیا تھا جو خوراک اور طرزِ فکر کے بارے میں تھا جس کے نتیجہ میں یہ رپورٹ آئی کہ Cheap اور Junk فوڈ کھانے والوں کی سوچ بھی ایسی ہی گھٹیا ہوتی ہے جب کہ اچھی خوراک مثلاً پھل، سبزیاں گوشت وغیرہ کھانے والوں کی سوچ بھی اچھی ہوتی ہے۔ پتہ چلا کہ طرزِ فکر کا رزق کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ حضور پاک ﷺ کی حدیث کے

حوالے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ جب مسافر نے حرام مال کھایا اور استعمال کیا تو اس کی سوچ اور طرزِ فکر منفی ہو گئی جو شیطانی طرزِ فکر ہے تو اب رحمٰن اس کی کیسے سنے گا۔

حضرت علیؓ کا ایک واقعہ ہے کہ آپ نے اپنے غلام کو بازار میں شہد لینے بھیجا تو واپسی پر یہ دیکھا کہ اس نے ایک تہائی مقدار یا کم و بیش اس میں سے چاٹ لی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اتنا ہی حصہ میں نے تمہارے لیے ذہن میں سوچا تھا کہ تم شہد لاؤ تو میں تمہاری نذر کروں گا مگر افسوس کہ تم نے اسے ناجائز طریقے سے حاصل کیا۔ اللہ پاک

www.ksars.org

فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر شئے کی مقداریں مقرر کی ہیں۔ رزق بھی اللہ پاک نے ہر بندے کے لیے مخصوص مقداروں میں مقرر کیا ہے ملتا اتنا ہی ہے جتنا اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ البتہ اس کے حصول کے دو طریقے ہیں حلال یا حرام۔

مزید برآں حجاج بن یوسف جو کہ ایک انتہائی ظالم و جابر حکمران تھا اور جس کے بارے میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز شافیؒ نے فرمایا تھا کہ تمام امتوں کے ظالم و جابر ایک جگہ جمع کیے جائیں تو اس امت کا یہ ظالم سب سے نمبر لے جائے گا۔ اس کے بارے میں آتا ہے کہ بغداد میں ایک فقراء کا فرد تھا جب لوگ کسی ظالم و جابر حکمران سے تنگ پڑ جاتے تو ان کے پاس جا کر ان سے دعا کرواتے۔ وہ فقراء دعا کرتے۔ ان کی دعاؤں سے یا تو اس جابر حکمراں کی موت واقع ہو جاتی یا حکومت بدل جاتی۔ حجاج بن یوسف نے سب سے پہلے ان کی دعوت کی اور دعوت انہیں کھلانے کے بعد کہنے لگا کہ حرام مال کھانے والے کی دعا میں کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ میں نے تم کو حرام مال کھلوا دیا ہے جاؤ اب جو دعا میرے خلاف کرنی ہے کر لو اس کا کچھ اثر نہ ہو گا اور ایسا ہی ہوا کہ ان درویشوں کی ظلم کے خلاف بد دعا کا کچھ اثر حجاج پر اور اس کی حکومت پر نہ ہوا اور ہو ظلم و ستم کرتا رہا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔

حجاج کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے بچپن میں بھیڑیے کا دودھ پیا تھا۔ لہذا ظالمانہ طبیعت کے بارے میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بھیڑیئے کا دودھ اس کے خون میں شامل ہو جانے کی وجہ سے اس کے اندر بھیڑیئے کے خصائل پیدا ہو گئے۔ اسکاٹ لینڈ میں ایک ایسے جراثیم پائے جاتے ہیں کہ سوڈ گری یعنی نقطہ ابال پر ابالنے سے بھی اس کے اثرات ختم نہیں ہوتے اور یہ جراثیم نہیں مرتے۔ اب خنزیر کھانے والی قوموں میں ہم اس کے خصائل کا مظاہرہ بر سر عام دیکھتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حرام خوراک کا تعلق براہ راست ہماری طرزِ فکر اور اعمال پر پڑتا ہے۔ ہم جو غذا کھاتے ہیں وہ دو طرح سے ہمارا جزو بدن بنتی ہے۔ ایک تو مادی جسم اس سے توانائی حاصل کرتا ہے اور عضلات وغیرہ بنتے ہیں۔ دوسرا یہ غذا روشنی بن کر ہمارے روشنیوں کے جسم مثالی کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ یہ روشنیاں جسم مثالی کی غذا بن جاتی ہے۔ اللہ کی نافرمانی کا احساس روشنیوں کو کثیف کر دیتا ہے۔ یہ کثیف روشنیاں جسم مثالی کو بیمار کر دیتی ہیں۔ اسی کثافت کا اثر جسم پر بھی پڑتا ہے اور آدمی نقصان اٹھاتا ہے۔ حرام رزق کھاتے وقت یہ خیال کرنا چاہیے کہ ہم صرف اپنے پیٹ میں ہی حرام مال نہیں ڈال رہے بلکہ مرنے کے بعد والے جسم کے اندر بھی کثافتیں اور غلاظتیں انڈیل رہے ہیں اور اگلی زندگی

www.ksars.org

میں بھی اپنے آپ کو بیمار بنا رہے ہیں۔رزق کا مطلب صرف کھانا پینا ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام وسائل رزق ہیں۔ رزق حلال کا مطلب یہ ہے کہ بندہ زندگی کے تمام وسائل کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق اس کے مقرر کردہ اصولوں کے ذریعے حاصل کرلے تاکہ اسے اس زندگی میں بھی اور آئندہ زندگی میں بھی اللہ کی خوشنودی حاصل رہے۔آمین۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

تقدیر

۱۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اللہ پاک کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ ہر چیز ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل میں آرہی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے وہ سب لوح محفوظ پر درج ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنی طرف سے کام کی تکمیل میں پوری کوشش کرے۔ مگر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔ اللہ نے جو بندے کی تقدیر میں لکھ دیا ہے وہ ہر حال میں اسے ملنا ہے۔

۲۔ تقدیر اور تدبیر کے علم سے روحانی آدمی کی آگاہی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے حسن تدبیر سے اپنی تقدیر معلق میں اپنے علم وارادے کو استعمال کر سکے۔ روحانی آدمی ہر کام کی ابتداء احسن تدبیر کے ساتھ کرتا ہے۔ تقدیر میں کوئی ردوبدل نہیں ہے وہ جانتا ہے کہ تقدیر پر کوئی زور نہیں ہے اس لیے وہ راضی برضا رہتا ہے۔

۳۔ ایک روحانی فرد کے لیے تقدیر بھروسہ رکھنا ضروری ہے۔ یہ یقین اس کے ارادے کو اس طرح تقویت بخشتا ہے کہ وہ اپنے حسن تدبیر سے بگڑے ہوئے کاموں کو سنوار دیتا ہے۔ ایک شخص جس کو کسی بزرگ نے بتایا کہ اس کو فلاں حادثہ پیش آنے والا ہے مگر ان میں اتنی قوت وسکت نہیں ہے کہ وہ اس حادثے سے اسے بچا سکیں۔ ان بزرگ نے اس شخص کو حضرت غوث پاکؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت غوث پاکؓ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ پھر اس واقعہ کو عالم رویت سے عالم رویا میں تبدیل کر دیا۔ یہ حضرت غوث پاکؓ کی کرامت بھی ہے اور ان کا علم اور حسن تدبیر بھی ہے۔ انہوں اپنی روحانی قوت سے حادثے کے واقعہ ہونے کا وقت بدل دیا۔

۴۔ تدبیر اور تقدیر سب کچھ لوح محفوظ پر درج ہے۔ اس لیے تدبیر کرنا بھی ضروری ہے اور تقدیر پر صبر شکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۵۔ تقدیر پر عمل کسی نہ کسی تدبیر کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔

www.ksars.org

۶۔ توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

۷۔ ہر آدمی کی تقدیر پیدا ہونے سے پہلے لکھی جاتی ہے۔اس لیے حالات کیسے بھی ہوں انسان کو ہر حال میں کوشش جاری رکھنی چاہیے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔اس ارادے سے کہ اللہ پاک اس بات پر قدرت رکھتے ہیں جس کو جو چاہیں عطا کریں۔

۸۔ اللہ کی رضا ہی تقدیر ہے۔ہر حال میں اللہ سے خوش رہنا چاہیے۔

۹۔ تدبیر آدمی کی کاوش اور تقدیر پر اللہ کی مرضی ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں جو انسان یا قوم اپنی حالت خود بدلنے کی کوشش نہیں کرتی اس کی حالت اللہ بھی نہیں بدلتے۔اس لیے اگر انسان کو کسی چیز کی جستجو ہو تو اسے حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرنی چاہیے ایک روحانی آدمی کی جستجو علم حاصل کرنا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتی ہے۔کوشش و محنت کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا تقدیر سے آگاہی ہے۔

۱۰۔ تقدیر دو طرح کی ہیں۔ایک تقدیر مبرم دوسری تقدیر معلق۔تقدیر معلق انسان کا ارادہ ہے اور تقدیر مبرم اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔جیسے ایک کھڑے ہوئے آدمی کو کہا جائے کہ ایک پاؤں اٹھاؤ تو وہ اپنا ایک پاؤں اٹھالے گا یہ تقدیر معلق ہے لیکن جب اس سے کہیں کہ دونوں پاؤں اوپر اٹھالو تو نہیں اٹھا سکتا یہ تقدیر مبرم ہے۔

۱۱۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔"جب تم میں سے کسی کی موت آئے تو وہ کہتا ہے اے میرے رب تو نے مجھے مزید مہلت کیوں نہ دی۔میں بھی صدقہ خیرات کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔اللہ تعالیٰ ہر گز نہیں موخر کرتے کسی نفس پر اس کا وقت جب کہ وہ آجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ خوب واقف ہیں ہمارے اعمال سے۔"

ان آیات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بندے کی تدبیر بھی اللہ پاک کی لکھی ہوئی تقدیر کا ایک جز ہے۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

سوالات

سوال نمبر ۱۔ تقدیر سے کیا مراد ہے؟ تقدیر معلق اور تقدیر مبرم سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر ۲۔ قلم لکھ کر خشک ہو گیا اس کی تشریح کریں۔

سوال نمبر ۳۔ توکل سے کیا مراد ہے؟ تفصیل بیان کریں۔

سوال نمبر ۴۔ لوح محفوظ کیا ہے؟ لوح اول دوم میں کیا فرق ہے؟

☆☆☆☆☆

تقدیر کے لغوی معنی ہیں اندازہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جب کن کہا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا وہ تمام کا تمام لوح محفوظ پر ڈسپلے ہو گیا۔ علم کا مظاہرہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کے عین مطابق ہوا۔ علم کے ساتھ ارادے کی مطابقت تقدیر ہے۔ یہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے ارادے کی وہ قوت ہے جو اللہ کے علم کو عدم کے پردے سے ثبات کے پردے پر لانے والی ہے۔ عدم سے مراد معرفت الٰہی کی نفی ہے جسے صرف لا سے تعبیر کیا گیا۔ عدم کے پردے میں بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے مگر جب تک خود ارادہ الٰہی میں اپنی ذات کو ظاہر کرنے کا خیال نہ آیا اس وقت تک معرفت الٰہی کا ذکر نہ تھا۔ جب ارادہ الٰہی اپنی ذات کو خلق میں ظاہر کرنے پر آمادہ ہوا یہی آمادگی زمانہ ازل کی بنیاد اور آغاز ہے۔ اس آغاز میں سب سے پہلے لا کی معرفت ظہور میں آئی۔ یہ پردہ عدم کے اسرار و رموز ہیں جس کے اندر ذات کی مشیت کام کر رہی ہے۔ جب مشیت ایزدی اپنے آپ کو عدم سے اثبات میں ظاہر کرتی ہے تو معرفت الا کا آغاز ہوتا ہے یعنی عدم کے پردے کے پیچھے مشیت ایزدی نے جس طرح اور جس انداز سے پر اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا مشیت ایزدی کی تجلیات نے اسی انداز میں پردہ اثبات پر اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ معرفت لا اور معرفت الا دونوں ہی معرفت ذات کے علوم ہیں جنہیں علم القلم کہا جاتا ہے۔ یہ اللہ پاک کے ذاتی علوم ہیں اسی درجہ میں کائنات ناقابل تذکرہ ہے۔ یہ ذات کی تجلیات کا عالم ہے۔ اس عالم میں ذات کائنات کی تخلیق کا ارادہ کرتی ہے۔ اس ارادے سے معرفت صفات موجود ہیں۔ معرفت صفات الٰہیہ کے بعد

www.ksars.org

معرفت اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے یعنی صفات الٰہیہ کی تجلیات کو بغرض کائنات کی تخلیق کے ایک تشکیلی صورت میں ڈھالا جاتا ہے۔ صفات الٰہیہ کی تشکیلی صورت اسمائے الٰہیہ مشیت ایزدی کی تشکیلی صورت ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے تمام اسمائے الٰہیہ حجاب محمود، حجاب کبریااور حجاب عظمت سے نکل کر لوح محفوظ پر اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسمائے الٰہیہ کا ظہور سب سے پہلے لوح محفوظ کے تئیس شعبوں میں ہوتا ہے۔ ان تئیس شعبوں میں اسمائے الٰہیہ کی تجلیات کائنات کا پورا خاکہ تیار کرتی ہیں۔ یہی وہ عالم ہے جسے وحدت الوجود کا نام دیا گیا ہے۔ اس عالم کے متعلق اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ''ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا معین مقداروں سے'' یہ مقداریں کائنات کے تخلیقی فارمولے ہیں جو اللہ کے ارادے کے تابع ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔ وحدت الوجود کی ہر حدت کائنات کا تخلیقی فارمولا ہے۔ یہ ذات کی وہ تجلیات ہیں جو آگے چل کر کائنات کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ وحدت اللہ تعالیٰ کی فکر کائنات ہے جس میں کائنات کی مصلحتوں اور حکمتوں کا ریکارڈ ہے۔ یہ حقیقت کے علوم کہلاتے ہیں۔ ان علوم کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ یا ایک درجہ تقدیر مبرم کہلاتا ہے اور دوسرا رخ یا درجہ تقدیر معلق کہلاتا ہے۔ تقدیر مبرم اٹل تحریرات ہیں جن میں کوئی ردوبدل نہیں ہے۔ ان کی حیثیت نظام کائنات کی ہے۔ یہ تدبیر سے ٹل نہیں سکتی جیسے موت، کہ کوئی بھی ذی روح موت سے نہیں بچ سکتا۔ یہ قدرت کی وہ سنت ہے جس میں کوئی ردوبدل نہیں۔ قرآن میں اسی کے متعلق ذکر ہے کہ اللہ کی سنت میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے نہ ہی تعطل واقع ہوتا ہے۔ یہ وہ تکوینی علوم ہیں جو آدم کو نیابت کے دائرے میں منتقل ہوئے ہیں اور یہی اسمائے الٰہیہ کے علوم کہلاتے ہیں۔ ان کا دوسرا رخ تقدیر معلق ہے جیسا کہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ تقدیر مبرم کی تحریرات میں کوئی تبدیلی یا ردوبدل نہیں ہے یعنی اس کے اندر آدم کا ارادہ شامل نہیں ہے۔ یہ تحریرات اسمائے الٰہیہ کے وہ نظام و قوانین ہیں جو کائنات کی بنیاد ہیں۔ اس کے اندر اللہ کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ تقدیر مبرم کے علوم بندے کو ارادہ الٰہی سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یہی ارادہ الٰہی تقدیر مبرم ہے۔ جس کے اندر بندے کا کوئی بس نہیں چلتا۔

تقدیر معلق آدم کے وہ اختیارات ہیں جو آدم کو نیابت اور خلافت کے دائرے میں عطائے ہوئے ہیں۔ یہ اختیارات تقدیر مبرم کے علوم کے دائرے میں ہیں۔ ان اختیارات کا استعمال تدبیر ہے۔ تقدیر معلق میں انسان کا ارادہ کام کرتا ہے مگر یہ ارادہ بھی اللہ کے ارادے کی مطابقت میں کام کرتا ہے۔ مثلاً دعا سے موت کا وقت بدل گیا مگر موت کا قانون نہیں بدلا۔

www.ksars.org

موت آئے گی ضرور۔اسی کے متعلق اللہ پاک فرماتے ہیں ''لکھتا ہے اللہ اور مٹاتا ہے اور اس کے پاس ہے اصل کتاب۔'' اصل کتاب یعنی تقدیر مبرم کی تحریرات۔لکھتا ہے اللہ یعنی اصل کتاب میں اللہ نے لکھ دیا کہ موت آنی ہے۔مٹاتا ہے یعنی بندے کا ارادہ اس موت کو قبول نہیں کرتا جس وجہ سے موت کا وقت بدل جاتا ہے مگر پھر بھی اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق موت آکر رہتی ہے۔بندے کا موت کو قبول نہ کرنا اور زندگی کی دعا کرنا اس سلسلے میں صدقہ خیرات کرنا وغیرہ وغیرہ تمام چیزیں اور عمل تدابیر میں آتا ہے۔تدبیر ووسائل کی تخلیق کرتی ہے۔وسائل کی تخلیق کی بنید مخلوق کے تقاضے اور روح کے تقاضے ہیں۔تقدیر معلق کی اطلاع روح کسی نہ کسی طور پر شعور کو دیتی رہتی ہے۔مثلاً خواب یا چھٹی حس کا ادراک تاکہ آدمی کا شعور بھی روح کے تقاضے کی تکمیل میں اپنی تدابیر کے ساتھ شامل ہو جائے۔

اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں۔'' بے شک یہ تو ایک نصیحت ہے۔پس جو چاہے پکڑے اپنے رب کی طرف راہ۔مگر تم نہیں چاہ سکتے سوائے اس کے جو اللہ چاہے اور اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔داخل کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت میں ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں تقدیر اور تدبیر دونوں کا ذکر کیا ہے۔پہلے فرماتے ہیں کہ یہ تو نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی طرف آنا چاہتا ہے یعنی اس میں تدبیر کا تذکرہ فرمارہے ہیں کہ انسان اللہ کی جانب آنے کی تدبیر اور ارادہ کرے پھر فرماتے ہیں لیکن تم تو کچھ چاہ ہی نہیں سکتے سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔اس میں تقدیر کا تذکرہ ہے کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔پھر اس کی وجہ بتائی جارہی ہے کہ اس وجہ سے کہ اللہ علیم اور حکیم ہے وہ جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت میں داخل کر لیتے ہیں۔یہ اللہ کی مرضی پر منحصر ہے بندے کی مرضی پر نہیں مگر جن لوگوں نے اپنی تدبیر سے غلط راہ اختیار کی ان کے لیے عذاب الیم ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ سعید اور شقی روحوں کو ازل میں ہی الگ الگ کر دیا تھا۔یوسف علیہ السلام نے اپنے بچوں کو نصیحت کی کہ ایسے ایسے کرنا اور ساتھ ہی فرمادیا کہ تقدیر کے مقابلے میں میں تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا یعنی میری نصیحت تو محض ایک تدبیر ہے جو ضروری نہیں کہ حسب خواہ نتائج برآمد کرے۔اس لیے حضور باباجی فرماتے ہیں کہ انسان تگ ودو یعنی تدبیر میں سستی نہ کرے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے یعنی نتیجے پر نظر رکھے بغیر اپنی کوششیں خلوص نیت کے ساتھ جاری رکھے۔تقدیر کو سمجھنا ہی اللہ پر توکل اور بھروسہ ہے۔تقدیر اللہ کا علم

www.ksars.org

ہے اور تدبیر بندے کا اپنے ارادے اور اختیار کا استعمال ہے یعنی بندہ چونکہ اللہ کے علم سے ناواقف، اپنی تقدیر سے ناواقف ہے اس لیے وہ اپنی

طرف سے تدبیر کرتا ہے۔ بندے کی تدبیر علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے یا جہالت کا ذریعہ بنتی ہے۔ علم اللہ کے قریب کرتی ہے جہالت اللہ سے دور کرتی ہے۔ ایک بندے کے لیے فائدے مند ہے دوسرا نقصان دہ۔ تدبیر بندے پر فرض ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک صحابی اپنے اونٹ کو ایک طرف بٹھا کر آئے۔ حضور پاک ﷺ نے پوچھا۔ گھٹنوں پر رسی باندھی ہے۔ انہوں نے کہا نہیں اللہ کے توکل پر چھوڑ آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پہلے اس کے رسی باندھو پھر اللہ کے بھروسے پر چھوڑ آؤ یعنی تدبیر بھی ضروری ہے اور تقدیر پر بھروسہ بھی۔ اس مضمون سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے دو اسماء کا ذکر آیا ہے۔ علیم اور حکیم۔ صفت علیم اللہ کا علم ہے اور صفت حکیم اللہ کے تدبیر ہے۔ آدم کو اللہ تعالیٰ کی دونوں صفات منتقل ہوئی ہیں۔ اسم علیم کی تجلیات جب آدم کے اندر منتقل ہوئیں تو آدم اسمائے الٰہیہ کے علوم کا حامل بنا۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آدم کو اسمائے الٰہیہ کے کل علوم عطا کر دیئے یعنی آدم کو اللہ کے اسم علیم کی نسبت حاصل ہو گئی اور جب اسم حکیم کی تجلیات وانوار منتقل ہوئے تو آدم کے اندر ارادہ منتقل ہوا یعنی آدم کے اندر روح کا شعور منتقل ہوا۔ اس طرح آدم کی روح اپنی ذات میں کائناتی علوم کی حامل بھی ہے اور کائناتی شعور اور روحانی شعور بھی رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں روح علم کے ساتھ ساتھ دماغ بھی رکھتی ہے یعنی اسمائے الٰہیہ کی تجلیات وانوار کا علم اسے حاصل ہے اور ان تجلیات وانوار کو اسے اپنے ارادے سے کام لینے کی تدبیر بھی آتی ہے۔ جب کوئی بندہ اسمائے الٰہیہ کے علوم کو حاصل کر کے کائنات کی اشیاء میں تصرف کرتا ہے تو یہ تصرف اس کا معجزہ و کرامت شمار ہوتی ہے جس میں اس کے مادی شعور کا دخل نہیں ہوتا۔ روحانی راستے پر چلنے والا اللہ کے فضل و کرم سے اور اپنے ارادے کی سکت کے مطابق یہ علوم حاصل کرتا ہے۔

تدبیر میں نظر کام کے نتیجہ پر ہوتی ہے یعنی انسان کی نظر عالم اسباب میں دیکھتی ہے۔ اس کا ہر کام وسائل واسباب کا پابند ہے۔ وسائل واسباب کی پابندی انسان کے عمل کو دو طرح کے نتائج سے گزارتی ہے۔ کامیابی یا ناکامی، خوشی یا غم، اچھائی یا برائی وغیرہ۔ یہ دونوں نتائج دو طرح کی طرزِ فکر سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثبت اور منفی طرزِ فکر

www.ksars.org

۔جہاں آدمی کاارادہ کام کرتاہے وہاں اس کی کوشش اور تدبیر بھی کام کرتی ہے اور کوشش کادارومدار وسائل پر ہے۔مثبت اور منفی طرزِ فکر کی لہریں اور روشنی وسائل کے اندر جذب ہو کر ان کی حرکات کو مثبت یا منفی کر دیتی ہے۔اس طرح ہر کام جب اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تو وہ حاصل شدہ لہروں کا نتیجہ ہوتا ہے۔یہ لہریں ہمارے حواس کے اندر جذب ہو جاتی ہیں اور ہمارے اوپر ان کی کیفیات وارد ہو جاتی ہیں۔تدبیر بھی تقدیر ہی کا حصہ ہے اس سے باہر نہیں۔اللہ پاک کے تفویض کردہ اختیارات کا استعمال تدبیر ہے۔ایک روحانی آدمی ان اختیارات کو اپنی سکت کے مطابق انتہائی بلندی تک لے جاتا ہے اور تمام مخلوقات پر اپنی بزرگی اور برتری بہ حیثیت علم وتدبیر کے پہنچان لیتا ہے۔یہی آگاہی اسے روحانی

راستوں پر اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتی ہے۔وسائل کا حصول،وسائل کی کمی بیشی اور وسائل کی تبدیلی آدمی کے اندر ٹائم اینڈ اسپیس کے حواس واحساس کو گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے گاڑی میں دو میل کا سفر دس منٹ میں طے ہوتا ہے اور بیل گاڑی میں دو گھنٹے میں۔وسائل انسان کی معاشرتی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے حصول کے لیے اللہ کی رضا کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔انسان کا ارادہ وسائل کے اندر کام کرتا ہے جیسے وہ چاہے تو گاڑی میں سفر کرے اور چاہے تو بیل گاڑی میں۔اسے اختیار ہے۔مگر یہ اختیار اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قانون اور نظام کے مطابق ہی نتیجہ اور انجام سے آدمی کو نوازے گا۔یہاں ایک حکایت حسب مضمون یاد آتی ہے۔

ایک شخص تقدیر اور تدبیر کے مسئلے کو جاننا چاہتا تھا۔وہ ایک بزرگ کے پاس گیا کہ مجھے تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ سمجھادو۔

ان بزرگ نے کہا کہ ”دیکھو ابھی تھوڑی دیر میں یہ عمارت گر جائے گی اور ملبہ بن جائے گی۔اگر تم تب بھی نہ سمجھے تو فلاں درزی رہتا ہے اس کے پاس چلے جانا۔“

یہ بات سن کر وہ آدمی خوف زدہ ہو کر تیزی سے عمارت کے باہر آگیا۔اس کے باہر آتے ہی عمارت گر گئی اور وہ بزرگ اس عمارت کے ملبے تلے دب کر مر گئے۔آدمی نے سوچا کیسا عجیب آدمی تھا جب اس کو پتہ تھا کہ عمارت گرنے والی

www.ksars.org

ہے تو پھر وہاں سے بھاگا کیوں نہیں۔اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ اس درزی کے پاس گیا۔وہ درزی بیٹھا کفن سی رہا تھا اس نے اس سے اپنا مدعا بیان کیا اور اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کو کہا۔

اس نے کہا کہ ''دیکھو وہ جو سامنے بچہ کھیل رہا ہے میں اس کا کفن سی رہا ہوں یہ بچہ ابھی تھوڑی دیر میں مرنے والا ہے۔''

وہ شخص بہت گھبرایا۔کہنے لگا۔''تم کیسے بے وقوف آدمی ہو جب تم کو پتہ ہے کہ یہ بچہ مرنے والا ہے تو تم اس کے ماں باپ کو اطلاع کیوں نہیں دیتے کہ وہ اس کے بچانے کی ترکیب کریں الٹا تم اس کا کفن سینے بیٹھ گئے ہو یہ تو برے ظلم کی بات ہے۔''

درزی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا کچھ نہ بولا۔اتنے میں وہ بچہ پاؤں پھسلنے سے گرا اور فوراً ہی مر گیا۔درزی دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور اسے گود میں اٹھا کر لے آیا۔وہ آدمی حیرانی سے بولا۔

''یہ کس کا بچہ ہے؟درزی بولا۔''یہ میرا بچہ ہے۔اگر تم کو اب بھی تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ سمجھ نہیں ایا تو فلاں مقام پر ایک موچی بیٹھا تمہیں ملے گا تم اس کے پاس چلے جاؤ۔''

وہ آدمی حیران وپریشان اس موچی کے پاس گیا اور گزشتہ واقعات بیان کیے اور اس سے اس مسئلے کو سمجھانے کی درخواست کی۔اس نے کہا کہ:

''دیکھو وہ جو سامنے درخت دکھائی دے رہا ہے جمعرات کے دن شام کے چار بجے تم کو اس درخت کے ساتھ لٹکا کے پھانسی دے دی جائے گی اب تم اپنے بچاؤ کے لیے جو مرضی تدبیر کرنا چاہو کر لو۔تم پہلے ہی اس مسئلے کی تلاش و جستجو میں دو بندے مروا چکے ہو۔''

یہ بات سن کر وہ آدمی فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت طلب کر کے دل میں یہ سوچتا ہوا چلا آیا کہ ابھی تو دو دن باقی ہیں جمعرات آنے میں۔میرے پاس گھوڑا ہے میں اس مقام سے دور چلا جاؤں گا پھر دیکھتا ہوں کس طرح پھانسی لگتی

www.ksars.org

ہے۔وہاں سے وہ اگلے مقام پر گیاتوایک ویرانے میں دوجوان لڑکالڑکی پریشان بیٹھے رورہے تھے اس نے گھوڑاروکااور پوچھا کہ:

''اس ویرانے میں تم کیاکررہے ہو۔''

انہوں نے کہاکہ:''ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کرناچاہتے ہیں مگر بزرگوں کی اجازت نہ ملنے پر یہاں آکر چھپ گئے ہیں۔ہمارا گھوڑا بھی مر گیااور کھانا بھی ختم ہو گیاہے۔''

لڑکی نے انگوٹھی ہاتھ سے اتار کر دی اور کہا۔''تم ہم پر ایک احسان کرو بازار جاکر اس انگوٹھی کو بیچ کر کچھ کھانالا دو۔''

اس شخص کو اس نوجوان جوڑے پر ترس آگیااس نے کہا۔''میں ابھی تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''یہ کہہ کر چلاتو بازار میں آکر ایک سنار کے پاس انگوٹھی دکھائی۔

اس نے کہا۔''ذرا ٹھہرو۔''یہ کہہ کر وہ دکان کے اندر گیاچند لمحوں بعد ایک اور آدمی اس کے ساتھ تھا۔اس شخص نے پوچھا۔

''یہ انگوٹھی تم نے کہاں سے لی۔''

اس نے کہا۔''میں نے اس طرح سے لی اور یہ واقعہ پیش آیا۔دراصل یہ انگوٹھی اسی سنار نے ایک ہفتے قبل بنائی تھی جو ایک نواب کی بیٹی کے لیے تھی۔دوسرے دن سے ہی وہ بیٹی گم ہو گئی تھی اور نواباسے ڈھونڈ رہاتھا جیسے ہی سنار نے انگوٹھی دیکھی اس شخص کا غریبانہ حلیہ دیکھ کر تاڑ گیاکہ یہ ایک غریب مسافر ہے کسی طرح نواب کی بیٹی سے اس کی ملاقات ہو گئی ہو گی اس نے اسے قتل کر کے اس کی انگوٹھی چھین لی ہو گی۔یہ سوچ کر اس نے فوراًہی دکان کے اندر جاکر نواب کو اطلاع کر دی تھی وہ دوسرا شخص نواب تھا۔پولیس بلائی گئی اور اس آدمی کو پکڑ لیا گیااس نے بہت حیل حجت کی اور اپنی صفائی میں دلیل دینے لگاکہ تم کو یقین نہ آئے تو فلاں جگہ وہ بیٹھے ہیں وہاں چلو۔اس قصے میں کافی دیر ہو گئی بالآخر وہ نواب اور

www.ksars.org

پولیس کے ساتھ اس صحرا میں آیا جہاں لڑکا لڑکی ملے تھے لیکن چونکہ کافی دیر ہو گئی تھی لڑکا لڑکی سمجھے کہ یہ آدمی شاید پکڑا گیا یا کہیں چلا گیا کہیں مخبری نہ ہو جائے اور ہم بھی پکڑے جائیں گے وہ وہاں سے چل دیئے۔اب سب کو پکا یقین ہو گیا کہاس شخص نے جھوٹا قصہ گھڑا ہے اصل قاتل یہی ہے جس نے لڑکی کا قتل کیا ہے۔انہوں نے اسے پکڑ لیا اور لے چلے۔ جمعرات کے دن وہ اسے اسی درخت کے نیچے لے ائے جس درخت کی نشاندہی موچی نے کی تھی شام کے ٹھیک چار بجے اسے اسی درخت پر پھانسی پر چڑھایا گیا۔اسی لمحے موچی سامنے آگیا اور اس سے پوچھا۔

''اے آدمی! تقدیر اور تدبیر کا مسئلہ سمجھ میں آیا۔''اس نے پھانسی پر چڑھتے ہوئے کہا۔''اب سمجھ میں آگیا۔''

اس قصے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک تقدیر کا لکھا بندے کی آنکھوں سے چھپا ہوا رہتا ہے وہ تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کے نتیجے کو اپنی کوشش اور محنت کا صلہ سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس نے تقدیر کے لکھے کو ٹال دیا مگر جب تقدیر سامنے نظر آتی ہے تب بندہ پہچان لیتا ہے کہ یہ عین اللہ کے ارادے کے مطابق ہے اور اللہ کا علم کامل ہے جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہے۔پس اگر وہ اس میں تدبیر بھی کرتا ہے تو اللہ کے حکم و قانون کی پاسداری اور تعمیل میں کرتا ہے اور جان لیتا ہے کہ تدبیر اور دعا وغیرہ اللہ کے حکم کو نہیں ٹال سکتی۔ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔اللہ کے علم و ارادے سے باہر کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔جیسا کہ اللہ پاک نے اپنے قرآن میں فرمایا۔''نہیں آتی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی کتاب میں اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔بے شک یہ بات اللہ کے لیے بالکل آسان ہے (ہم نے تمہیں اس لیے بتادی) تم غم زدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہیں نہ ملے اور نہ اترانے لگو اس چیز پر جو تمہیں مل جائے۔''(سورہ الحدید ۲۲)

تقدیر علم الٰہی ہے اور تدبیر علم الٰہی کا پہچاننا ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

www.ksars.org

خوف اور غم

۱۔ اللہ پاک فرماتے ہیں۔ ''اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے نہ غم۔'' جب انسان اپنی فکر کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات کو بنالیتا ہے تو وہ دنیا کے فکر و غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم اللہ کی رضا کے لیے اٹھتا ہے۔ اس کا مقصد حیات اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے بندوں کے لیے اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں ان کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتے ہیں، کان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی زندگی کا ہر عمل اللہ کے امر کی حرکت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ڈر خوف روحانی راستے میں ایک رکاوٹ ہے اور انسان شک وسوسوں اور بے یقینی میں، بتلا ہو جاتا ہے جو کہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

۲۔ کسی قسم کا نقصان، خوف ودہشت سے آدمی کے اندر ایسی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے وہ سمٹ کر محدودیت کے خول میں بند ہو جاتا ہے جو کہ سراسر اللہ سے دوری کا باعث بنتا ہے جب کہ روحانی آدمی اس کے برعکس ہوتا ہے اسے کسی چیز کا خوف و غم نہیں ہوتا۔

۳۔ لاعلمی خوف اور ڈر کا باعث بنتی ہے۔

۴۔ خوف منفی طرز فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ آدمی میں خود غرضی اور لالچ پیدا کرتا ہے اور دل کی کمزوری کا باعث بنتا ہے جس کی وجہ سے ارادے پست ہو جاتے ہیں۔ اللہ سے دوری دنیا کی جانب راغب کرتی ہے اور دنیا کی محبت میں آدمی صرف دنیا کو حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرتا ہے کیونکہ اس میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اسے ناکامی ہوتی ہے تو وہ اپنی کم مائیگی پر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ خوف آدمی کو بزدل بنا دیتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔ اللہ کی طرف راغب ہونے اور اللہ کی یاد سے دل کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

www.ksars.org

جیسا کہ اللہ پاک فرماتے ہیں اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں۔اللہ سے دوستی کرلی جائے تو خوف و غم سے نجات مل جاتی ہے۔

۵۔ خوف آدمی اس ہستی سے خائف کر دیتا ہے جو ستر ماؤں سے بھی زیادہ بندوں سے محبت کرنے والی ہے۔روحانی آدمی کو کسی محفل میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے ج سے حاضرین محفل کے دل میں اللہ کی محبت کے بجائے اس کا خوف پیدا ہو۔

۶۔ ایسے لوگ جو حقیقت آشنا نہیں ہوتے ہمیشہ خوف کا شکار رہتے ہیں جیسے کبھی بیوی بچوں کی کفالت کا خوف، کبھی روزگار کا خوف، کبھی رشتے داروں کا خوف۔۔ایک روحانی آدمی چونکہ حقیقت آشنا ہوتا ہے اس کے ذہن کی مرکزیت صرف ذات خداوندی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ہر وقت اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔وہ اللہ کو اپنا کفیل اور ہر کام

میں اس کو فاعل حقیقی جانتا ہے۔اس سے اس کے اندر استغنا پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر سے دنیا کا خوف نکل جاتا۔

۷۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر حال میں خداوند کریم سے ڈرتے رہو۔خوف خدا جس کے اندر نہیں وہ روحانی صلاحیت حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کے خوف اور محبت دونوں سے دل میں گداز پیدا ہوتا اور ہم اپنے اعمال پر نظر رکھتے ہیں کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھیں جس سے اللہ ہم سے ناراض ہو جائے جس کے اندر خوف خدا نہیں ہوتا وہ قطع رحمی کرنے لگتا ہے جس کے اندر خوف خدا نہیں ہوتا وہ قطع رحمی کرنے لگتا ہے جس سے لوگ بجائے محبت کے اس سے خوف کھانے لگتے ہیں۔

۸۔ جن لوگوں میں خود اعتمادی نہیں ہوتی وہ خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۹۔ خوف جہالت میں پلتا ہے۔

www.ksars.org

۱۰۔ تعصب اور تنگ نظری سے خوف پیدا ہوتا ہے۔

۱۱۔ خوف ترقی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہے جن قوموں کے لوگ بہادر اور نڈر ہوتے ہیں وہ قومیں ترقی کرتی ہیں۔

۱۲۔ خوف ذہنی دباؤ کا نتیجہ ہے۔آدمی کی شخصیت پر جب کسی دوسری شخصیت کا دباؤ کا نتیجہ ہے۔آدمی کی شخصیت پر جب کسی دوسری شخصیت کا دباؤ پڑتا ہے تو اپنی شخصیت مغلوب ہو جاتی ہے۔تب اپنی کمزوری اور دوسرے کی برتری کا احساس ہوتا ہے۔خوف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دوسرے کی برتری کے ساتھ ساتھ اس سے نقصان کا اندیشہ بھی ہو جب یہ اندیشہ حد سے بڑھ جاتا ہے تو آدمی اسے اپنا دشمن سمجھ لیتا ہے اور پھر اس سے دور بھاگتا ہے۔اللہ کا خوف اس کی بزرگی اور برتری کی بنا پر تو ضرور کرنا چاہیے اور اس کی قدرت پر نظر رکھنی چاہیے کہ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ مگر ایک روحانی آدمی اللہ سے اس طرح خوف زدہ نہیں ہوتا کہ اس سے نقصان کا اندیشہ ہو بلکہ وہ اپنے رب کو انتہائی درجہ کی رحیم و کریم ہستی جانتا ہے اور اپنی کمزوریوں پر ہر وقت اس سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔اللہ سے اس کا خوف اس بزرگی، برتری اور عظمت کی بناء پر ہوتا اس کے دل پر اللہ کا رعب طاری رہتا ہے۔یہ رعب اللہ کی عظمت کا اعتراف کرانے کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی بندے کے دل میں پیدا کرتا ہے اور بندہ اللہ سے قریب ہونے کی خواہش رکھتا ہے اس سے خائف نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ ”اللہ کے دوستوں کو خوف اور غم نہیں ہتا۔“اس کی تشریح کریں۔

سوال نمبر ۲۔ استغناء سے کیا مراد ہے مراد ہے؟ بیان کریں۔

سوال نمبر ۳۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شک سے باز رہنے کا حکم دیا ہے،اس میں کیا حکمت ہے؟

www.ksars.org

سوال نمبر ۴۔ خوف اور غم سے انسان کس طرح نجات حاصل کر سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

خوف کی تعریف یہ ہے کہ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جس میں مبتلا ہونے سے آدمی گھبراتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آدمی جس چیز سے خائف ہوتا اسے اس شئے سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم سانپ یا شیر کو دیکھتے ہیں تو راستہ چھوڑ کر دوسری طرف ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمیں ان سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے بلکہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ نقصان پہنچانے والے جانور ہیں جبکہ اگر ہم سڑک کے پار پھولوں کو دیکھ کیں تو اپنا رخ بدل کر ان کی جانب چلنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ہمارے ذہن میں پھولوں سے کسی قسم کا کوئی گزند پہنچنے کا کوئی تصور وجود نہیں ہے۔ آدمی جس چیز سے خوف کھاتا ہے اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے اسے اپنا دشمن جان کر اس سے نفرت کرتا ہے اور جس شئے سے نقصان کی توقع نہیں ہوتی اسے دوست اور محبوب بنالیتا ہے۔ اسی طرح اگر آج ہم انسانوں کی زندگی پر غور کریں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ عام طور سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں یعنی آخرت کی زندگی سے خائف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ سے بھی دور ہیں۔ اگر انہیں یہ یقین آجائے کہ اللہ پاک نہایت ہی محبت کرنے والی ہستی اس سے کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا خطرہ نہیں اور زندگی مابعد الموت اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے تو وہ ضرور موت سے خائف ہونے کی بجائے موت کی آرزو کریں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں۔ انہیں کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ۔ وہ ابد تک اس کی تمنا نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ اللہ سے خائف ہیں اور آخرت کی زندگی کی بہتری کی انہیں امید نہیں ہے۔

حضور پاک ﷺ نے فرمانا جس مفہوم یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمانوں کی کوئی وقعت نہ ہو گی۔ ان کے دشمن انہیں نوچ کھائیں گے اور اس کے لیے ایک دوسرے کو ایسے ہی دعوت دیں گے جیسے دستر خوانوں پر لوگوں کو بلایا جاتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کیا اس وقت ہم تعداد میں قلیل ہوں گے۔ فرمایا نہیں بلکہ بہت زیادہ

www.ksars.org

ہوں گے مگر تمہاری قیمت سمندر کے جھاگ کی طرح ہو گی اور اس کی وجہ یہ ہو گی کہ تم دنیا کو محبوب رکھو گے اور موت سے ڈرو گے۔دوسرے لفظوں میں غیب کی دنیا سے لاعلمی اور خوف انسان

کی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر دیتا ہے جب کہ ہمارا مشن یہ ہے کہ انسان اللہ کے قریب ہو اور آخرت کی زندگی کا مشاہدہ کرے۔قرآن اور آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ دوزخ کے عذاب اور خوفناک سزاؤں کا ذکر ہے جس کو پڑھ کر آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ پاک ایک جانب تو اپنی تعریف میں نہایت ہی رحیم و کریم ہستی کی حیثیت سے بیان فرماتے ہیں اور دوسری جانب بندوں کے لیے ایسی سزائیں مقرر کر رکھی ہیں کہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ میاں بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں۔اصل میں انسان کو دو قسم کے علوم عطا کیے گئے ہیں۔ایک اللہ تعالیٰ کی صفت جمالی کے دوسری اللہ تعالیٰ کی صفت جلال کے۔جب بندے کو صفت جلالی کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے اندر خوف پیدا ہو جاتا ہے۔دوزخ کا ڈراوا اور عذاب کا خوف اسی وجہ سے دلایا گیا ہے تاکہ بندہ اللہ تعالیٰ کے جلال سے دور رہے۔جلال اور غصہ نافرمانی کی صورت میں آتا ہے۔پس اللہ کے جلال کا نشانہ بھی فرمان نفس ہے۔نفس سرکش ہے۔اس لیے کہ وہ حقیقت سے دور ہے۔یہ دوری اسے لاعلم اور جاہل بناتی ہے۔لاعلمی کی وجہ سے وہ خیال کی روشنی کو اپنے تقاضوں کے مطابق معنی پہناتا ہے چونکہ نفس کے تقاضے مادیت میں کام کرتے ہیں اس لیے مادیت کا حصول ہی نفس کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔جب نفس مادی تقاضوں کے حصول میں اپنے آپ کو جکڑ لیتا ہے اور مادی زندگی ہی اس کا نصب العین بن جاتی ہے تو اس پر غیب میں داخل ہونے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے اللہ سے دور ہو جاتا ہے۔اللہ یہ نہیں چاہتا کہ بندہ اس دور ہو جائے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے نافرمان نفس کو اپنے عذاب سے ڈرایا ہے تاکہ نافرمان نفس سرکشی سے باز آجائے۔مادی نفس کی بنیاد نافرمانی پر ہے۔مادی جسم جنت میں اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مادی نفس کی فطرت نافرمانی ہے۔فطرت کبھی نہیں بدلتی۔جس طرح ایک درندے کو سدھا کر پالتو بنانے پر بھی اس کی درندگی اس دور نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اس پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جاتا اور اسے عام پبلک میں لایا نہیں جاتا۔اگر لاتے بھی ہیں تو پنجرے میں بند کر کے لاتے ہیں۔اس لیے کہ اس کا مالک جانتا ہے کہ شیر کی درندگی نہیں بدل سکتی یہ اس کی فطرت ہے۔جب بھی موقع ملے گا یہ ابھر آئے گی۔یہی حال نفس کا ہے کہ آدم و حوا کے جنت میں رہ کر

www.ksars.org

بھی یہ فطرت ان سے دور نہ ہوئی کیونکہ انسان کمزور ہے اور فطرتاً جلد باز واقع ہوا ہے۔ جب بھی فطری کمزوریاں ابھر کر آئیں، نفس نافرمانی کا مرتکب ہو گیا۔ تمام بزرگ ہستیاں جو اپنے نفس کی کمزوری اور سرکشی سے آگاہ ہیں وہ تمام اللہ پاک سے اپنے گناہوں اور خطاؤں پر معافی مانگتی ہیں۔ گزشتہ زمانے کے بزرگوں کے واقعات پڑھنے سے بھی ہمیں یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام اپنے نفس کی کمزوریوں سے خائف تھے اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ایک پرندے کو ہدف بنا کر کہا کاش میں بھی تیری طرح پرندہ ہوتا تو شریعت واحکام خداوندی کا مکلف نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے عتاب کے پنجرے میں بند نفس کے سامنے انہیں پرندہ زیادہ آزاد دکھائی دیا کہ اس کے لیے نہ سزا ہے نہ جزا۔ حضرت ابو غفاریؓ کی نگاہ جب بھی اپنے نفس کی کمزوریوں پر پڑتیں تو فرماتے۔ ''کاش میں درخت ہوتا اور کاٹ دیا جاتا۔ آپ کے اس قول میں بھی نفس کی سرکشی کا خوف پنہاں ہے۔ حضرت عائشہ □ فرماتیں۔ کاش میں بھولی بسری ہو جاتی یعنی کاش کوئی میری کمزوریوں اور نادانیوں کو بھول جاتا۔

ایک روحانی آدمی اپنے نفس پر اس طرح پاتا ہے کہ اپنی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی جانب لگا دیتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ فکر کی روشنیاں دماغ کے خلیوں میں جذب ہو کر جسمانی ودماغی حرکت کے لیے توانائی بنتی ہے۔ جب تصور میں اللہ ہو گا تو دماغ کے خلیوں میں نور جذب ہو کر توانائی فراہم کرے گا۔ اس طرح دل ودماغ میں نورانیت بھر جائے گی اور جہاں نور ہوتا ہے وہاں نار نہیں ہوتا۔ جہاں اللہ ہوتا ہے وہاں شیطان نہیں ہوتا۔ پس اللہ کے تصور میں اپنے آپ کو غرق کر دینے سے شیطان کا خیال خود بخود ذہن سے مٹ جاتا ہے اور نور سے توانائی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ پھر اللہ جس طرح ہم سے کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے اس کے علاوہ اللہ کی ہستی علیم ہے اور شیطان اللہ کے علوم سے آشنا نہیں ہے۔ جب اللہ کا تصور قائم ہو جاتا ہے تو اللہ کے نور سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے اسی نور کے ذریعے بندے کے علوم بھی منتقل ہوتے ہین۔ اس کا شعور وعقل زیادہ سے زیادہ ان علوم سے مستفیض ہوتا ہے علم کے ذریعے سے وہ اللہ کے قریب ہوتا رہتا ہے اور اس کی اصل فطرت اور صفات کو پہچانتا ہے مگر اس کے برعکس جب بندے کا رابطہ نور سے نہیں ہوتا تو اس کے قلب وذہن میں تاریکی ہوتی ہے۔ یہی تاریکی خوف بن کر آدمی کی روحانی صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے۔ علم روشنی ہے۔ روشنی میں ہمارے حواس کام کرتے ہیں۔ آنکھ دیکھتی ہے کان سنتے ہیں اور ہمیں ہر شئے کا صحیح پتہ چل جاتا ہے مگر تاریکی میں آنکھ جب دیکھ نہیں سکتی تو

www.ksars.org

اگر کچھ سنائی دے بھی تو کچھ نظر نہ آنے کی وجہ سے آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے کیونکہ پھر آنکھ تاریکی کے ڈائی مینشن میں کام کرتی ہے اور ان ڈائی مینشن سے تصویریں بناتی ہے۔ تاریکی کا ہر ڈائی مینشن مفروضہ ہے جو ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تنہائی میں یا تاریکی میں آدمی کا ذہن جذب ہو جاتا ہے تو تصور کے ہیولے اسے نظر آتے ہیں اور وہ سخت خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

روحانی نقطہ ء نظر سے اللہ تعالیٰ سے خوف کرنے کا اصل مطلب خود اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور نا فرمانیوں سے خوف کرنا ہے۔ ایک روحانی آدمی کے دل میں عام آدمی کی نسبت بہت زیادہ اللہ کا خوف ہوتا ہے مگر اس خوف کی وجہ خود اپنے نفس کی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ اللہ پاک کی ہستی کے مقابلے میں اپنے نفس کو بے بس اور کم علم جانتا ہے۔ یہ خوف اسے اللہ کی بارگاہ میں جھکنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ سے دور نہیں بلکہ اور زیادہ قریب ہوتا ہے اور اپنی محتاجی کو اللہ پاک کی تونگری کے ذریعے سے دور کرتا ہے۔ اس طرح اللہ اور بندے کے درمیان ایک مضبوط رشتہ بندھ جاتا ہے جس میں بندہ اپنے رب کی مہربانیوں اور رحمتوں سے فیاض ہوتا

ہے۔ روحانی آدمی کا اللہ سے خوف کرنا اس کو مہذب بنا دیتا ہے۔ خوف جب کمال کو پہنچتا ہے تو دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے یہی بے رغبتی بندے کو زہد کی طرف لے جاتی ہے۔ اللہ کے خوف کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت کی امید بھی ضروری ہے کیونکہ مایوسی سے کفر پیدا ہوتا ہے۔ رحمت خداوندی سے مایوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ آپ کو اللہ پاک قادریت اور قدرت سے انکار ہے۔ یا اگر انکار نہیں ہے آپ اس کی قدرت کو بھی اپنی مجبوری اور محتاجی کے چشمے سے دیکھ رہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ آپ کی مشکل کو دور نہیں کرے گا۔ اکثر ہوتا بھی یونہی ہے کہ آدمی اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مایوسی کے کنوئیں میں ہی ڈوب جاتا ہے وہاں سے نکلنے نہیں پاتا اور اللہ سے شکایت کرتا ہے کہ اللہ ہماری نہیں سنتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اللہ تو سب کا ہی خالق ہے۔ سب یکساں طور پر اس کی مخلوق ہے پھر کسی کی وہ سنتا ہے اور کسی نہیں سنتا کا کیا مطلب ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کیونکہ ہم دنیا میں پریشان حال لوگوں کی اکثریت دیکھتے ہیں جب کہ اللہ پاک اپنے آپ کو رحمٰن اور رحیم کہتا ہے اور غفار الذنوب کہتا ہے۔ جب وہ اس قدر بے نیاز ہے تو پھر مخلوق کے مبتلائے غم ہونے کا کیا جواز ہے۔ درحقیقت ساری کائنات ایک منظم اور مربوط نظام پر چل رہی ہے۔ گویا کائنات کا نظام

www.ksars.org

ایک مشینی نظام ہے۔ جس طرح مشین چلانے کے خاص قانون و طریقے ہوتے ہیں اسی کائنات کے چلانے کے بھی مخصوص طریقے اور اصول ہیں۔ تمام مخلوق فرداً فرداً کائنات کا ایک ایک کل پرزہ ہے۔ اگر اس پرزے کو صحیح رکھا جائے گا اور اس سے صحیح طور ہر کام لیا جائے تو پھر یہ درست رہے گا۔ کائناتی نظام کو سمجھنے کے لیے ہی اللہ پاک نے انسان کو روحانی علوم عطا کیے ہین۔ ان علوم میں یہ بھی شامل ہے کہ کائنات کا خالق کون ہے اور اس کی سورس آف انرجی کیا ہے اور اس انرجی کو حاصل کرنے کے لیے کون سے اصول اپنانے ضروری ہیں۔ کائنات کا خالق اللہ ہے اور کائنات کی انرجی اللہ کا نور ہے۔ پس اب سب سے زیادہ ضروری یہ لازم آتا ہے کہ ہم اپنا رشتہ خالق سے اور اس کے نور سے جوڑ لیں تاکہ ہماری محتاجی دور ہو جائے اور ہمیں انرجی کی مسلسل سپلائی ملتی رہے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میں تم سے تمہارے گمان کی قریب ہوں یعنی جیسا تم مجھے تصور کروگے ویسا ہی میں تمہارے لیے بن جاؤں گا۔ خوف اور مایوسی میں آدمی اللہ کو بھی اپنی طرح ہی نعوذ باللہ کمزور سمجھ لیتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات آجاتی ہے کہ بس اللہ میاں تو میری مشکل میں کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ قدرت اور فطرت کے قانون کے مطابق اللہ پاک بندے کے گمان کے مطابق ہی بن جاتا ہے۔ مایوسی اور ناامیدی میں انسان اللہ کی مدد کو قبول ہی نہیں کرتا جس کی وجہ سے وہ اپنی پریشانی و غم میں مبتلا رہتا ہے۔ ایک روحانی کیریکٹر اس کے برخلاف ہر وقت اللہ سے نیک امید اور نیک گمان رکھتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ فطرت کا ہر کام مخصوص اصولوں پر چل رہا ہے۔ پس وہ یہی کوشش کرتا ہے کہ سب سے پہلے تو وہ ان اصولوں کو پہچانے اور پھر ان کے مطابق ہی اللہ سے اپنی حاجت طلب کرے۔ اس کا خوف یہ ہوتا ہے کہ کہیں اس سے فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی دانستہ یا غیر دانستہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ جب کوئی بندہ قانون کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے تو پھر وہ بچ نہیں سکتا جیسے شیشے کے اوپر پتھر دانستہ ماریں تب بھی شیشہ ٹوٹے گا اور اگر نادانستہ لگ جائے تب بھی ٹوٹنا ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دانستہ جرم مجرم بنا دیتی اور نادانستگی معافی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ روحانی آدمی اللہ سے خوف کی حالت میں اپنے نادانستہ گناہوں اور گلطیوں پر ہر وقت اللہ کے سامنے عجز وانکسار کا دامن پھیلائے رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جتنا میں اللہ سے قریب ہوں گا اتنا ہی میری گلطیاں اور کمزوریاں مجھ سے دور ہوں گی کیونکہ اللہ کی ہستی پاک اور بے نیاز ہے جس طرح سورج کی روشنی میں بیٹھنے سے آدمی دھوپ سے استفادہ حاصل کرتا ہے اور چاند کی روشنی میں بیٹھنے سے چاندنی کو محسوس کرتا ہے۔ اللہ کے قریب جانے

www.ksars.org

سے بھی اس کے نور کو جذب کرتا ہے اور نور کی سفات اپنے اندر محسوس کرتا ہے پس روحانی شخصیت کو اللہ کا خوف سب سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے اور اس خوف کی وجہ سے اللہ کی قربت اور محبت اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ایسے ہی خوف کو لفظ ''خشیت اللہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے دلوں میں اللہ پاک کی خشیت پیدا کرے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

انا کی فطرت

۱۔ خود کی نفی کرنا، یہ سمجھنا کہ ہر کام اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے اور وہ طرزِ فکر جو انسان کو اللہ کی طرف لے جاتی ہے آدمی اپنے ہر کام میں اللہ کے تصور کو غالب رکھتا ہے اور ہر حالت میں اس کا شکر گزار ہوتا ہے۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فشاں لا الا الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

۲۔ انا کی پہچان یہ ہے کہ جس شخص میں انا کا غلبہ ہوتا ہے اس میں خوپسندی، خود نمائی اور احساس برتری کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ بات اللہ کو ناپسند ہے کیونکہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ الحمد اللہ رب العالمین۔ یعنی ہر تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام عالمین کا رب ہے۔ انا تو کائنات میں صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ انا پرست اللہ کی بجائے خود کو مخلوق کی توجہ کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔

۳۔ ساری کائنات میں ایک ایگو یا ایک شعور کام کر رہا ہے جس کو انا کہتے ہیں۔ یہ انا اللہ کی انا ہے یعنی کہ میں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے کن فرمانے سے اس کا آغاز ہوا۔ یہ کائنات کے ذرے ذرے میں ایک لائف اسٹریم یا انرجی کا کام کر رہی ہے۔ اس کا عکس ایک بندے میں بھی کام کرتا ہے۔ اسی لیے حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اللہ کو پہچان لیا۔ روحانیت میں آدمی اپنی انا کی نفی کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

۴۔ انا سے مراد انسان کی اپنی ذات ہے اور اپنی ذات کی پہچان اپنی پہچان ہے جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے رب کو پہچانا سے مراد انا کی پہچان ہے انا وحدت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

www.ksars.org

۵۔ انا کو عام لفظوں میں ایگو یا میں کہہ سکتے ہیں۔ روحانی لوگ بتاتے ہیں کہ میں تو صرف اللہ ہی کی ہونی چاہیے۔ انسان جو بھی کام کرے وہ جانتا ہو کہ وہ اللہ کی دی ہوئی توفیق سے کر رہا ہے۔ وہ خود کچھ بھی نہیں۔ جس آدمی میں انا زیادہ ہوتی ہے اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ دوسروں سے خود کو زیادہ عقل مند اور عالم سمجھتا ہے۔ ذرا سی بات پر جلد غصہ میں آجاتا ہے اگر ان باتوں سے اجتناب کیا جائے تو اپنی انا کو اللہ کی انا سے ملایا جا سکتا ہے یہی روحانی انسان کی نشانی ہے۔

۶۔ انا ایک انفرادی فکر ہے جس کو ہم میں یا اپنی ذات سے تعبیر کرتے ہیں یہ کن کی آواز ہے۔

۷۔ انا یعنی اپنی ذات کی فکر یا شعور آدمی کے اندر صرف اتنا ہی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق کا ایک فرد جانے جو دراصل مخلوق میں پہچان کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر ان کا شعور اس تعلق سے ہٹ کر صرف اپنی ذات پر مرکوز ہو جائے تو انسان خود بڑے بڑے دعوے کرنے لگ جاتا ہے۔ گویا کائنات میں وہی سب کچھ ہے اور یہ بات اسے کفر و شرک کے قریب کر دیتی ہے۔

۸۔ انسان اپنے آپ کو مخلوق، محتاج اور بے بس مان کر ہی اپنی انا کی اصل کنہ تک پہنچ سکتا ہے۔ انا کی حقیقت کی عدم پہچان انسان کو خالق سے دور لے جاتی ہے۔

۹۔ انسانی شعور کی ابتداء لاعلمی سے ہوتی ہے اور اس کے قریبی لوگ اسے ایک نام دیتے ہیں اور وہ خود بہ حیثیت زید ، بکر کے نام سے پہچانتا ہے۔ ایک روحانی آدمی چونکہ ایک ایسے راستے پر ہوتا ہے جس میں ہر فکر کی گہرائی میں تفکر کیا جاتا ہے وہ یہ تو جانتا ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد مجھے زید یا بکر کا نام دیا گیا مگر وہ اس سے پہلے کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا تھی اس کی جستجو کرتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ زید یا بکر کے پیچھے کام کرنے والی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے وہ اس حقیقت کو پالیتا ہے جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو کھنکناتی مٹی سے بنایا ہے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی ہے یعنی انسان کی حیثیت صرف خلاء ہے اس کے اندر کام کرنے والی انا اس کی اپنی ذاتی نہیں ہے۔

www.ksars.org

۱۰۔ اللہ اور بندے کے درمیان دوئی ہماری انا ہے۔ تخلیق کائنات سے پہلے انا ناقابل تذکرہ شئے تھی کیونکہ اس وقت دوئی نہیں تھی یعنی میں اس وقت زیرِ بحث اتی جب سامنے دوسرا موجود ہو۔ لہذا اللہ کی حقیقی ذات کی پہچان اور روح کے عرفان کے ذریعے سے انا کی پہچان کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

۱۱۔ روح اعظم یعنی تجلی کا شعور حاصل کرنے سے انا کی پہچان ہوتی ہے۔

۱۲۔ کائنات کی ہر شئے کا باہمی ربط انا کی لہروں پر ہے۔ کائنات میں یہاں سے وہاں تک ایک ہی انا کام کر رہی ہے۔ وہ ذات واحد کی انا ہے اس کی پہچان صفات الٰہیہ کی معرفت ہے۔

۱۳۔ انا کی پہچان اپنی ذات کی پہچان ہے۔ خالق اور مخلوق کے باہم ربط کی پہچان کرنا یہ جان لینا کہ وہی سب کا رب ہے اور اسی کے حکم پر کائنات کی حرکت جاری وساری ہے۔

۱۴۔ اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں۔ ''اس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ اچھے عمل کون کرتا ہے۔''

اچھے عمل سے مراد عبادت اور عبادت سے مراد بندگی ہے۔ بندگی کا حق اس وقت ادا ہوتا ہے جب بندہ اپنی انا کو اللہ کی انا میں شامل کر دیتا ہے اور مرتبہ احسان حاصل کر لیتا ہے۔ اس راستے می جاں طلبی، خود نمائی اور خود پسندی بنیادی رکاوٹ ہے۔

۱۵۔ روحانیت انسان کو وسعتوں میں لے جاتی ہے۔ کائناتی علوم سے روشناس کراتی جب کہ محدودیت کا سب سے تنگ دائرہ اپنی انا کا خول ہے۔ اس لیے انا پرست آدمی جب تک کسی مرشد کی اطاعت میں اس محدودیت سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتا، سلطان یا اپنی روح سے اس کا رابطہ نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

سوالات

سوال نمبر ا۔ اناسے کیامراد ہے؟اس کی تفصیل بیان کریں۔

سوال نمبر ۲۔ انا کی نفی کیوں ضروری ہے اس کے کیا فوائد ہیں؟

سوال نمبر ۳۔ توحید ذاتی سے کیا مراد ہے؟

سوال نمبر ۴۔ طین اور حین سے کیا مراد ہے؟قرآن میں ہے کہ ''ہم نے انسان کو بجنی مٹی سے پیدا کیا''اس پر روشنی ڈالیں۔

سوال نمبر۔۵۔ انالہروں کے ذریعے دوسری مخلوقات سے ہمارا رابطہ کس طرح قائم ہے؟

☆☆☆☆☆

آپ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی ہے اور آدم کو تخلیقی فارمولے اور کائنات کے انتظامی امور کی تعلیمات عطا کی ہیں۔ جنہیں اسمائے الٰہیہ کہا گیا ہے۔ان میں اللہ کی ذات اور صفات دونوں کے علوم شامل ہیں۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کائنات میں اور کوئی ذات نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مخلوق کے اندر اس کا اپنا انفرادی شعور بھی کام کر رہا ہے۔ ہر شخص اس انفرادی شعور کا ایک نام رکھ کر مخلوق کے درمیان اپنی پہچان برقرار رکھتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات میں ایک ہی ذات موجود ہے پھر انفرادیت اور کثرت کہاں سے آگئی۔ ہم اس کثرت کو کیونکر وحدت کے ساتھ ہم آہنگ کریں گے۔ جب ہم اللہ پاک کی توحید میں غور کرتے ہیں تو انکشاف یہ ہوتا کہ توحید ذاتی دراصل اللہ پاک کی ایک فکر ہے۔ فکر کی یہ تجلیات ذات کی تجلیات ہیں جو کائنات کی بنیاد ہے۔ ان تجلیات کے اندر ذات کا شعور انا کی لہروں کی صورت میں موجود ہے۔ تجلی ذات کا شعور کن کہہ کر وجود میں آیا۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر شئے کو اس فطرت پر پیدا کیا ہے اور فطرت میں کوئی ردوبدل نہیں ہے۔انا کی فطرت حاکمیت ہے کیونکہ یہ شعور حاکم فطرت یا خالق کا ہے۔ تخلیقی قانون کے مطابق فطرت میں کوئی تبدیلی لائی نہیں جاسکتی۔ نہ ہی فطرت

www.ksars.org

توڑی مروڑی جاسکتی ہے۔ لہذاانا کی لہروں سے حاکمیت کا تصور نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ حاکمیت کا تصور انا کی فطرت ہے۔ فطرت بدلی نہیں جاسکتی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انا کی لہروں کا رخ بدل دیا جائے اور اس ہستی کی جانب موڑ دیا جائے جو حقیقت میں حاکمیت کا وصف رکھتی ہے۔ اناجب لامحدودیت میں کام کرتی ہے تو اس کا رخ اللہ کی جانب ہوتا ہے جیسا کہ اللہ پاک فرماتے ہیں میں ہوں تمہارا رب۔ اللہ پاک کا یہ فرمانا لامحدودیت کا فرمان ہے۔ لامحدودیت کے ذرے ذرے میں ذات خالق کی یہ فکر کام کر رہی ہے۔ اسی عالم تجلیات کو توحید ذاتی کہا گیا ہے۔ ذات کی یہی فکر امر الٰہی کے ساتھ کائنات کی خلا میں اپنا مظاہرہ کرتی ہے اور فکر کی ہر تجلی امر الٰہی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی صورتیں ان کے وہ اجسام ہیں جنہیں روح مثالی کہا جاتا ہے۔ جب یہ روح مثالی تنزل کر کے عالم ناسوت میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اندر کام کرنے والی انا کی لہروں کی رفتار اتنی سست پڑ جاتی ہے کہ لہریں گنجان ہو جاتی ہیں اور جمود طاری ہو جاتا ہے۔ انہی گنجان لہروں سے انا ٹھوس جسم وجود میں آتا ہے اور انا کی ذات کا تصور جسم مثالی سے منتقل ہو کر اس ٹھوس جسم میں کام کرتا ہے۔ انا میں چونکہ فطرتاً حاکمیت کا وصف ہے یہی وجہ ہے کہ بندہ اپنی کنہ حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر انا کی فطرت کو اپنے نفس کی فطرت سمجھ لیتا ہے اور ہر تقاضے اور فکر کا رخ شعور کی جانب موڑ دیتا ہے۔ انا کی لہریں شعور میں داخل ہو کر انفرادی پہچان بن جاتی ہے اور حاکمیت کا وصف آدمی کو خدائی کا دعویٰ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جیسا کہ فرعون نے رب ہونے کا دعویٰ کیا۔ ''انا ربکم الاعلی'' اگر فرعون انا کی کنہ حقیقت سے واقف ہوتا تو ہر گز بھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔

ساری کائنات کی بنیاد انا کی لہروں پر ہے۔ انا کی لہروں کے ذریعے خیالات کا ردوبدل ہوتا ہے گویا انا کی لہریں خیالات کی ترسیل کا کام کرتی ہیں۔ اگر کائنات کے اندر سے انا کی لہریں نکال دی جائیں تو کائنات کے اندر سے حواس یا دماغ ختم ہو جائے گا۔ ہمارا دماغ انا کی لہروں کو وصول بھی کرتا ہے اور بھیجتا بھی ہے۔ یہ دوہری حرکت ہمارے اندر ہر لمحے جاری وساری ہے اور اسی حرکت کا نام زندگی ہے۔ ہمارا دماغ یا شعور ایک ایسا اسٹیشن ہے جس سے کائنات کی ساری انائیں منسلک ہیں۔ جب ہم کائنات کی اناؤں کی بات کرتے ہیں ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات کے افراد کا انفرادی شعور جو خالق سے ہٹ کر مخلوق کی پہچان کراتا ہے۔ ساری کائنات انا کے اجسام کا مجموعہ ہے۔ کائنات کی تخلیق میں اللہ پاک کی خود کو پہچانے جانے کی فکر کام کر رہی ہے۔ اللہ پاک کی اس فکر اور ارادے کی تکمیل پر تمام مخلوق کام کر رہی ہے یعنی تمام

www.ksars.org

مخلوق اللہ پاک کو پہچاننے کا کام کر رہی ہے۔انا کی لہریں کائنات میں دو رخوں میں کام کر رہی ہیں۔ایک رخ میں انا ذات خالق کی پہچان بنتی ہے دوسرے رخ میں مخلوق کی پہچان بنتی ہے۔ایک رخ میں خالق کی فکر توحید کام کر رہی ہے دوسرے رخ میں خالق کی فکر کائنات کام کر رہی ہے۔دونوں رخ انا کے دو پہلو ہیں۔ایک رخ دوسرے رخ کی پہچان کا باعث بنتا ہے۔ ایک رخ ذات کی تجلیات ہے جو فکر توحید کے ذریعے اپنے آپ کو بہ حیثیت خالق پہچان کرانا چاہتی ہے دوسرا رخ صفات کی تجلیات ہیں جو فکر توحید صفاتی کے ذریعے خالق کی پہچان کرنا چاہتی ہے۔انا کی لہروں کے ان دونوں رخوں کا بہاؤ اور مرکز ذات باری تعالیٰ کی ہستی ہے۔تمام مخلوق انا کی لہروں کے ان دونوں رخوں کے ساتھ اللہ پاک سے وابستہ ہیں۔انا کی لہروں کا مرکز اور سورس ہی ذات خالق اور ذات واحد ہے۔اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ کائنات کی ہر شئے اللہ کی تسبیح کرتی ہے اس میں پہاڑوں، پتھروں، کنکروں، پرندوں کا ذکر ہے کہ سب اپنے خالق کی تسبیح کرتے ہیں یعنی ہر شئے انا کے رشتے سے خالق کو پہچانتی ہے۔انا کی لہروں کی متعین مقداروں سے مخلوق کے اجسام وجود میں آئے ہیں۔انا کی لہروں میں جتنی زیادہ سے زیادہ نورانیت ہو گی اتنے ہی اجسام لطیف ہوں گے اور جتنی نورانیت کم ہوتی جائے گی اجسام کے اندر ٹھوس پن آتا جائے گا۔اسی مناسبت سے ازل سے لے کر ابد تک انا کی لہروں کے مختلف زون ہیں۔ہر زون میں انا کی لہریں لطیف اور کثیف اجسام کی تخلیق کر رہی ہیں۔ان زون کو تجلی، نور، روشنی اور نسمہ کہا گیا ہے۔انا کا وہ رخ جسے ہم توحید ذاتی کہہ چکے ہیں یہ تجلی ذات کا شعور ہے جو ذات کی انا ہے۔ازل میں جب اللہ پاک نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تو اس ارادے سے ذات کی انا یا تجلی ذات کا شعور ظاہر ہوا۔اسی شعور کو روح اعظم کہتے ہیں جو ذات کی وحدت فکر ہے۔یہی وہ رخ ہے جو دوسرے رخ کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔روح اعظم کو حقیقت محمدی کا عالم بھی کہتے ہین۔اسی نور کو کائنات کی تخلیق کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس رخ کو کائنات کی توانائی کہیں تو دوسرا رخ کائنات ہے جو اس رخ سے توانائی حاصل کر رہا ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ ہم نے کھنکھناتی بجنی مٹی سے آدم کا پتلا بنایا۔ پتلے سے مراد شعوری جسم ہے۔قرآن اس شعوری جسم جو مادے سے بنا ہے اس کے دو رخ بیان کرتا ہے ایک رخ طین دوسرا حین۔ طین مٹی یا مادہ ہے۔ حین اس مٹی یا مادے کی نیچر ہے۔اس نیچر یا فطرت کو اللہ نے کھنکھناتی بجنی کہا ہے یعنی خلاء ہے۔ طین اور حین دونوں رخ مٹی کے اس پتلے کے ہیں جسے آدم کہا ہے۔اور ان دونوں رخوں میں انا کی لہریں زندگی فراہم کر رہی ہیں۔ خلاء یا حین

www.ksars.org

جب روشنیوں سے پُر ہو جاتا ہے یہ روشنیاں جو روح کی انا کی انا کی لہریں ہیں تو ان سے آدم کا جسم مثالی وجود میں آتا ہے۔اسی کو انا کا جسم بھی کہتے ہیں۔یہی وہ جسم ہے جو فرد کا شعور اور پہچان بنتا ہے۔دوسری جانب انا کی لہروں پر روح کے تصورات کی ترجمانی کر کے اللہ کی پہچان کا باعث بنتا ہے۔اللہ تعالی کے کن کہنے سے ازل سے ابد کے درمیان انا کی لہروں کا ایک جال وجود میں آگیا۔اس جال کے اوپر اللہ تعالی کے تصورات مظاہر کائنات کی صورت میں موجود ہیں۔انا کی لہروں کا جال ہی کائنات کی Base ہے یا وہ پردہ ہے جس پر مظاہر کائنات کا ڈسپلے ہو رہا ہے۔ہر شئے لا محدودیت سے محدودیت میں آکر اپنا تعارف کراتی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے اور پھر واپس وہیں لوٹ جاتی ہے۔تمام کائنات اسی اصول پر سفر کر رہی ہے۔کائنات کی تمام انائیں وحدانیت کا پھیلاؤ ہیں۔ہر شئے فکر توحید کے بحر بیکراں میں گم ہو جاتی ہے۔یہی گمشدگی مخلوق کی انا کی فنائیت ہے جسے ناقابل تذکرہ کہا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کائنات ناقابل تذکرہ تھی اور پھر ایک وقت آئے گا جب وہ ناقابل تذکرہ ہو جائے گی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

تذکرہ باباتاج الدینؒ میں لکھا ہے کہ راجہ رگھورائے جی نے حضور باباتاج الدینؒ سے ایک دن پوچھا کہ حضور دنیا میں خال خال لوگوں نے جنات،ارواح اور دیگر غیر مرئی مخلوق کو دیکھا ہے۔مگر ساری دنیا کے انسان خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب،کسی بھی معاشرے سے ہو وہ ان کی موجودگی کو تسلیم ضرور کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔انہوں نے فرمایا۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا ذہن ایک ایسی مشین ہے جو دوہری حرکت کرتی ہے یعنی ہم انفارمیشن ریسیو بھی کرتے ہیں اور ٹرانسمٹ بھی کرتے ہیں۔جتنے بھی سیارے ہیں اور دیگر نظام ہیں ان میں آباد مخلوق کے ساتھ بلکہ تمام موجودات کے ساتھ ہمارا ایک نادیدہ ذہنی رابطہ ہے جس کی بدولت ہم ایک دوسرے کے وجود سے آگاہ ہیں۔ہم چاند کو دیکھ کر چاند کہہ دیتے ہیں اور سورج کو دیکھ کر سورج کہہ دیتے ہیں۔دراصل یہ رابطہ ہی انا کی لہریں ہیں۔ان کے ذریعے ہم دیگر مخلوقات کو اپنی موجودگی پر مطلع کر رہے ہیں۔جب آدمی کے اندر اپنی موجودگی کا یعنی اپنی ذات کے وجود کا احساس بہت زیادہ ہو جاتا ہے تو اس کی تمام توجہ کا مرکز صرف اپنی ذات رہ جاتی ہے۔وہ دوسروں کی موجودگی کا انکار تو نہیں کرتا مگر ان کے مفادات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔وہ اپنے اوپر کسی کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا بلکہ اپنا ہی حق دوسروں پر جتاتا رہتا ہے۔ایسا آدمی انفرادی طرزِ فکر کا حامل ہوتا ہے اور اس کا ذہن اس قدر محدود ہو جاتا ہے کہ کائناتی شعور تک اس رسائی

www.ksars.org

ناممکن ہو جاتی ہے۔ایسا شخص جس کے اندر اپنی انا کا غلبہ ہو وہ شخص کبھی روحانی نہیں ہو سکتا کیونکہ روحانیت کے لیے شیخ کی اطاعت لازمی ہے اور انا پرست آدمی انا کے غلبہ کی وجہ سے کچھ سیکھ نہیں سکتا۔وہ ہر وقت چوں چرا میں مبتلا رہتا ہے۔ حضور باباجی نے فرمایا کہ کسی کے ساتھ پانچ منٹ گزارنے سے ہی اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں انا ہے یا نہیں۔آج کل دنیا میں ہر شخص ہر طبقہ ہر گروہ ہر ملک اس بات کا رونا رو رہا ہے کہ میرے حقوق غصب کر لیے گئے ہیں، میرے حقوق مجھے دلواؤ۔کوئی آدمی دوسرے کے حقوق اپنے اوپر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے یعنی سارا معاشرہ ہی انا پرستی کا شکار ہے۔لہذا سارا معاشرہ ہی اپنی روح سے دور ہے۔محدودیت میں قید ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری طرف ایسا روحانی دور بھی گزرا ہے کہ ایک شخص نے یہ کہا کہ اس پر میرے یہ حقوق ہیں اور یہ لے نہیں رہا۔مثلاً حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک آدمی نے اپنی زمین بیچی دوسرے نے خرید لی۔اس میں کھدائی کے دوران اسے سونے کے سکے ملے وہ اس آدمی کے پاس گیا کہ یہ آپ کے پیسے ہیں۔میں نے صرف زمین خریدی تھی ان سکوں کے پیسے آپ کو نہیں دیئے تھے۔ انہوں نے کہا نہیں بھائی میں نے جہاں زمین بیچی تھی اس کے ساتھ کو کچھ اس کے اندر ہے وہ بھی بیچ دیا تھا جب دونوں میں کوئی فیصلہ نہ ہوا تو حضرت عمرؓ کے پاس گئے اور صورتحال بیان کی کہ یہ اپنا حق مجھ سے نہیں لے رہا۔حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم دونوں کی اولاد ہے؟ایک نے کہا لڑکی ہے دوسرے نے کہا لڑکا۔حضرت عمرؓ نے ایک کی لڑکی کے ساتھ دوسرے لڑکے کی شادی کر کے یہ دولت انہیں عطا کر دی۔

اللہ پاک فرماتے ہیں۔''اس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے۔نیک اعمال کرے اور اس عمل سے اپنے آپ کو کوئی بڑی شئے نہ سمجھنے لگے بلکہ یہ کہے کہ میں بھی عام مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔''

☆☆☆☆☆

www.ksars.org

وحی کی حقیقت

۱۔ وحی روح کی زبان ہے۔جب تک کسی بندے کو روح کا عرفان حاصل نہیں ہو جاتا وہ وحی کی طرزوں کو سمجھ نہیں سکتا۔

۲۔ حضور پاک ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تھے تو پاس بیٹھا آدمی بھی وحی کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔وحی کی آواز کی وہی سن سکتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

۳۔ وحی کلام الٰہی ہے جو بات اللہ پاک اپنے بندے سے کرتے فرشتے کے ذریعے یا کسی پردے میں،اللہ تعالیٰ کا امر وحی کے ذریعے آتا ہے بندے کے دل میں کسی بات کا القاء ہونا وحی کی طرزوں میں ہے۔ساؤنڈ کی متعین مقدار ہے۔قرآن حکیم وحی الٰہیہ میں سے ہے۔

۴۔ وحی اللہ تعالیٰ کا اپنے خاص بندوں سے براہ راست رابطہ کا نام ہے۔وحی انبیاء علیہ السلام پر نازل ہوا کرتی تھی۔ لطیفہ اخفیٰ سے تجلی جب بغیر کسی رکاوٹ کے انسانی ذہن پر نزول ہو تو اسے وحی کہا ہے۔وحی کی روشنیوں کو جذب کرنے کی سکت صرف انبیاء علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ تجلی کی یہ روشنیاں اللہ تعالیٰ کی جانب خاص ہدایات ہیں۔ان ہدایات کو کتابی صورت دی گئی تو انہیں آسمانی کتابیں کہا گیا جن میں توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن شامل ہیں کیونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔اس وجہ سے وحی کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے مگر اب بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں سے انہی طرزوں پر رابطہ قائم کرتے ہیں اس رابطہ کو الہام اور کشف اور القاء کہا جاتا ہے۔

۵۔ وحی سے مراد اللہ کا کلام یا حکم ہے جو پیغمبروں پر اتارا گیا۔وحی کی حقیقت کی سب سے بڑی نشانی قرآن پاک ہے جو حضور پاک ﷺ پر نازل ہوا۔حالانکہ آپ اُمی تھے۔قرآن ہر زمانے کے لیے ہدایت ہے۔

www.ksars.org

۶۔ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو پیغمبروں کے علاوہ کسی سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

۷۔ امر الٰہی بغیر کسی شعوری مداخلت کے موصول کرنا اور اس کی اطلاع کے مطابق معنی پہنانا وحی ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے پیغام کی ترسیل وحی کہلاتی ہے جو کسی فرشتے کے ذریعے ہوتی ہے۔ وحی تمام پیغمبران علیہ السلام پر نازل ہوئی مگر قرآن میں ہے کہ ہم نے شہد کی مکھی پر وحی بھیجی۔ جس سے ثابت ہوا کہ تجلی کا عالم ناسوت میں نزول وحی کہلاتا ہے۔

۹۔ ہماری زندگی روح کی انفارمیشن کی مرہونِ منت ہے۔ جس لمحے روح سے اطلاعات آنی بند ہو جاتی ہیں شعوری جسم مردہ ہو جاتا ہے یعنی روح کی اطلاعات بند ہونے شعور فوراً ہی معطل ہو جاتا ہے۔ شعور ان اطلاعات میں معنی پہناتا ہے اور معنی پہنانے میں اپنا ارادہ استعمال کرتا ہے، اسے خیال کہتے ہیں۔ مگر روح کی وہ اطلاعات جو براہ راست شعور میں داخل ہوں اور

ان اطلاعات سے ہمارا ارادہ واقف نہ ہو تو اطلاعات کی یہ صورت وحی، کشف، الہام اور القاء کہلاتی ہیں، کشف، الہام اور القاء وحی کی طرزیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

سوالات

سوال نمبر ۱۔ وحی سے کیا مراد ہے؟ وحی کی طرزوں کو ہم کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟

سوال نمبر ۲۔ کشف، الہام اور القاء کیا فرق ہے؟

سوال نمبر ۳۔ سورس آف انفارمیشن کیا ہے؟

سوال نمبر ۴۔ حقیقت محمدی ﷺ کیا ہے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

www.ksars.org

سوال نمبر۵۔ حجابات کیاہیں؟حجاب محمود،حجاب کبریااور حجاب عظمت میں کیافرق ہے ہے؟

سوال نمبر۔ تدلی کیاہے؟اس کی تفصیل بیان کریں۔

☆☆☆☆☆

اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ایسی بات نہیں چھوڑی جس کی قرآن میں وضاحت نہ کر دی گئی ہو۔ بعض لوگ کہتے ہی بلکہ اکثریت یہی کہتی ہے کہ ہمیں قرآن کی باتیں اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتیں۔ مطلب یہ کہ اس کے نکات سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ جانتے ہیں کہ لکھنے والا جب کوئی تحریر لکھتا ہے تو اس کے اندر س کی ایک فکر کام کرتی ہے وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے اس کی فکر میں اس کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ الفاظ تحریر بن کر صفحہ پر بکھر جاتے ہیں۔ مگر ذہن کا مفہوم الفاظ کے پیچھے چھپ جاتا ہے جب کوئی پڑھنے والا اس تحریر کو پڑھتا ہے تو الفاظ پڑھ کر اپنی فکر کے ذریعے سے معنی پہناتا ہے۔ اگر لکھنے والے کی فکر کے ساتھ اس کی فکر نہ ملی تو پڑھنے والے کے قلب میں اس کا تاثر نہیں ابھرتا۔ اس کا ذہن تحریر کی گہرائی میں نہیں جاتا جس کی وجہ سے اسے نہ لطف آتا ہے جب الفاظ دل کی گہرائی میں اتر جائیں اور اس گہرائی میں ذہن انہیں معنی پہنائے۔ قرآن کا بھی یہی قاعدہ واصول ہے سمجھنے کا۔ قرآن وحی کا کلام ہے اور اس کے پیچھے اللہ کا تفکر کام کر رہا ہے۔ قرآن کے نکات اور حکمتیں اس وقت سمجھ میں آسکتی ہیں جب ہماری فکر اللہ کے تفکر سے مل جائے۔ اللہ پاک نے سینکڑوں جگہ قرآن کی آیات میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اگر ہم بار بار قرآن پڑھ کر اس میں غور وفکر کریں گے تو صاحب ﷺ وحی کے ذہن سے ہمارا رابطہ ہو جائے گا اور جس طرح انہوں ﷺ نے قرآن کے معنی سمجھے ہمیں بھی ان کی نسبت سے یہ مفہوم ومعنی سمجھ میں آجائیں گے۔ مگر اس معنی کو سمجھنے سے پہلے ذہن کی تیاری بھی ضروری ہے۔ اللہ پاک اپنے کلام میں کئی جگہ فرماتے ہیں کہ ۔''ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی سمجھنے والا۔''اس کا مطلب یہ کہ قرآن کو اس کے اصلی معنی ومفہوم پر سمجھنا مشکل نہیں ہے بشرطیکہ اس کے مطابق اپنے ذہن کو تیار کیا جائے۔ روحانی علوم وہی علوم ہیں جو بذریعہ وحی پیغمبروں پر نازل ہوئے۔ پس ان علوم کے اصل معنی وہی ہیں جو پیغمبروں نے الفاظ کی صورت میں ہمارے سامنے

www.ksars.org

رکھے ہیں۔ان علوم کو سیکھنے کے لیے ہمیں بھی اپنے ذہن کو اسی طرزِ فکر پر ڈھالنا ہوگا جس پر پیغمبران علیہ السلام کا رابطہ وحی کے ذریعے اللہ پاک سے ہوا۔جب ایک روحانی علوم کے طالب کی طرزِ فکر اس طرز پر بن جاتی ہے۔تب قرآن کا سمجھنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔روحانی علوم کو سمجھنے کے لیے وحی کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم اپنے ذہن کو کس طرز پر تیار کریں کہ وحی کے علوم کے انوارات پیغمبروں کے کے ذریعے ہمارے سینے میں بھی منتقل ہو جائیں اور ہمارا روحانی راستے پر چلنے کا منشا پورا ہو۔

ہماری ساری زندگی روح کی اطلاعات پر حرکت کر رہی ہے۔ہمارے مرشد کریم حضور بابا جی فرماتے ہیں کہ زندگی ایک اطلاع ہے۔اطلاع اس تسلسل سے موصول ہوتی ہے کہ ہم ہر چیز کو رواں دواں دیکھتے ہیں۔جب انفارمیشن کی یہ رو ہمارے مادی جسم سے کٹ جاتی ہے تو ہم اس سے اگلے لیول پر زندگی رواں دواں دیکھتے ہیں کیونکہ ہمارا روشنی کا جسم ان اطلاعات کو اسی طرح موصول کر رہا ہوتا ہے لیکن مادی جسم نہیں رہتا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اطلاعات بیک وقت دو اسکرین پر چل رہی ہوتی ہیں۔ایک اسکرین یعنی مادی جسم۔دوسری اسکرین یعنی روشنیوں کا جسم مثالی۔جب مادی جسم کی اسکرین سے ان اطلاعات کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے تو اطلاعات اسی طرح پہلے کی نسبت سے روشنی کے جسم پر چلتی رہتی ہیں۔اور ہمارے تمام حواس روشنیوں کے جسم میں منتقل ہو جاتے ہیں اور روشنی کے جسم کا شعور ہی ہمارا شعور مرنے کے بعد کا بن جاتا ہے۔

قرآن میں وحی کے الفاظ کو کئی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔فرماتے ہیں ہم نے شہد کی مکھی پر وحی کی۔ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو وحی کی۔اس کے علاوہ حضور پاک ﷺ کے لیے فرماتے ہیں۔"قسم ہے ستارے کی جب وہ نیچے اترا۔تمہارا ساتھی نہ راہِ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے اور انہیں سکھایا ہے زبردست قوتوں والے نے دانا نے۔" (سورہ نجم)

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ زندگی روح کی جانب سے موصول ہونے والی اطلاع کا نام ہے اور زندگی کی تمام حرکات یہی اطلاعات بنتی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ وحی بھی اطلاع ہے کیونکہ وحی بھی زندگی کی حرکات کا باعث بنتی ہے۔ وحی

www.ksars.org

موصول ہوئی تو پیغمبران علیہ السلام نے اللہ کے مشن پر جدوجہد کی۔ کھوج یہ لگانا ہے کہ وحی کی وہ کون سی حقیقت ہے جو ایک بشر کو نبوت کے درجے پر فائز کرتی ہے اور مکھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو اس فضیلت سے محروم کرتی ہے کیونکہ لازمی طور سے یہ وہ وحی نہیں ہے جو پیغمبروں کے اوپر نازل ہوئی۔ ورنہ مکھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی پیغمبر ہی کا درجہ مل جاتا۔ پھر ذہن یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں کے علاوہ ایک عورت اور ایک جانور کے لیے وحی کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا جب کہ وحی کا تعلق پیغمبروں کے ساتھ ہے اور پھر اللہ میاں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس میں غور و فکر کرو۔ جیسا کہ سورہ نحل کی آیت ہے۔ اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ بنا لے پہاڑوں میں چھتے اور درختوں میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں پھر رس چوس کر ہر قسم کے پھولوں سے، پس چلتی رہا کر اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں۔ نکلتا ہے ان کے شکموں سے ایک شربت مختلف رنگوں والا۔ اس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔؛

ان آیات سے صاف طور پر یہ معنی نکلتے ہیں کہ اللہ پاک نے یہاں وحی کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ انسان کی توجہ اس پر خاص طور پر جائے اور وہ اس میں غور و فکر کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات میں غور و فکر کرنے سے وحی کی طرزوں کا پتہ چلتا ہے۔ اب ہم اس حدیث کی طرف آتے ہیں جو اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور پاک ﷺ کے پاس وحی لے کر آئے تو حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''اے جبرئیل! کبھی تو نے یہ بھی دیکھا کہ وحی کہاں سے آرہی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی کہ سرکار وحی کی تجلیات وانوار سدرۃ المنتہیٰ سے میں آپ ﷺ کے پاس لاتا ہوں میرے لیے یہی حکم ہے۔ یہ انوار کہاں سے سدرۃ المنتہیٰ پر نازل ہوتے ہیں میں نہیں جانتا۔ کیونکہ اس مقام سے اوپر میری پہنچ نہیں ہے ورنہ میرے پر جل جائیں گے اور میرا شعور منتشر ہو جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اب جب وحی کا سدرۃ المنتہیٰ پر نزول ہو اور آپ کو ان انوار و تجلیات کو ہمارے پاس لانے کا حکم ملے تو ہماری نسبت سے سدرہ سے اوپر جا کر دیکھنا کہ وحی کہاں سے آرہی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کے حکم پا کر ایسا ہی کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سدرہ سے اوپر لامکانیت میں بھی رسول ﷺ کی ذات اقدس جلوہ افروز ہے اور وحی کا نزول آپ ﷺ کی ذات کی جانب سے کیا جارہا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حیرانی کی حالت میں

www.ksars.org

حضور پاک ﷺ کی جانب زمین پر تشریف لائے اور فرمایا حضور عجیب اسرار ہے جسے میرا ذہن سمجھ نہیں پایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بھی آپ ﷺ ہیں اور یہاں بھی آپ ﷺ ہیں۔ وحی بھیجنے والے بھی آپ ﷺ اور وحی موصول کرنے والے بھی آپ ﷺ ہیں۔

اس حدیث شریف میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے اوپر وحی کی حقیقتیں منکشف ہونے لگتی ہیں۔ اس حدیث میں وحی کا وہ اصل مرکز بتایا گیا ہے جہاں سے وحی کائنات میں نازل ہوتی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ اسلام حضور پاک ﷺ کی اجازت اور نسبت کے ساتھ اس مرکز پر پہنچے جہاں سے وحی بھیجی جاتی ہے۔ ہم سب ان مراکز کی بات کرتے ہیں جہاں پر وحی موصول ہو رہی ہے۔ یعنی پیغمبران علیہ السلام کا دنیا میں موجود شعور اور جب اس دنیا سے یا اس شعور سے پیغمبروں کی ہستیاں پردہ کر گئیں تو ہم اسے وحی کا سلسلہ منقطع ہونا جانتے ہیں۔ اصل میں وہ مرکز جہاں پر وحی آرہی ہے وہ حقیقت محمدی ﷺ کا عالم ہے۔ اس عالم کو روح اعظم یا تجلی ذات کا عالم کہا گیا ہے۔ اس عالم میں تجلی کے اندر ذات کا شعور بحیثیت روح محمدی ﷺ کے کام کر رہا ہے۔ یہ وہ روح اعظم ہے جس کا تعلق براہ راست ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حقیقی اس روح اعظم یا حقیقت محمدی ﷺ کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ یہی بات اللہ پاک اپنے کلام میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک سے کوئی بھی پردے کے بغیر یا فرشتے کے بغیر کلام نہیں کر سکتا نہ ہی دیکھ سکتا۔ اب یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ پاک کو اگر کوئی دیکھتا ہے یا اس کا کلام سنتا ہے تو وہ دیکھنا یا سننا حقیقت محمدی ﷺ کے حجاب میں ہے۔ یہ تجلی ذات کا وہ عالم ہے جس کو نور اول کہا گیا ہے اور جو ہمیشہ سے تھا۔ جب اللہ پاک نے چاہا کہ ظاہر ہو تو پھر یہ خزانہ ظاہر ہوا۔ کن کہنے سے تجلی ذات کے اندر شعور متحرک ہو گیا اور یہی شعور اول ہے جو ذات کی پہچان کراتا ہے۔ اس شعور کی صورت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو ذات احمد ﷺ ہیں۔ اس ذات احمد ﷺ کی تعریف اللہ پاک کی جانب سے بیان کی گئی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ ہر صورت و شعور سے ماوراء ہستی ہیں مگر ذات خالق نے مخلوق کے سامنے اپنے آپ کو حقیقت محمدی ﷺ کے پردے میں ظاہر کرنا پسند فرمایا ہے یعنی حقیقی ذات پھر بھی پردے میں ہے۔ اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ذات کی تجلی کو دیکھ کر اللہ کہہ دیتے ہیں جب کہ وہ ذات نہیں ہے بلکہ ذات کا عکس ہے۔ مگر انسان کے حواس کی یہی معراج ہے کہ وہ ذات کے حجاب تک رسائی حاصل کرے۔ یہی بہت بڑی بات ہے۔ آنکھ ہمیشہ

www.ksars.org

ڈائی مینشن میں دیکھتی ہے بغیر ڈائی مینشن کے نہیں دیکھ سکتی۔بینائی کا نور اللہ ہی کا ہے۔اللہ ہی دیکھ رہا ہے اور اللہ ہی سن رہا ہے۔ذات باری تعالیٰ کی بینائی یا نظر تو بغیر ڈائی مینشن کے بھی دیکھتی ہے۔یہی دیکھنا اللہ کا ذاتی علم ہے مگر کائنات بذات خود ایک مخصوص ڈائی مینشن کا نام ہے۔اسمائے الٰہی اس کی حدود مقرر ہے۔ہم ان حدود کو ازل ابد سے تعبیر کرتے ہیں جو اللہ کی قدرت کی حدود ہے۔ حقیقت محمدی ﷺ یا روح اعظم تجلی ذات کی وہ تشکیل ہے جس کے ذریعے اللہ کی نظر کائنات میں دیکھتی ہے اور کائنات میں سنتی ہے۔ گویا حقیقت محمدی ﷺ کا عالم اللہ پاک کے ان ذاتی علوم کا عالم ہے جنہیں اللہ پاک نے اپنے ارادے سے ظاہر فرمایا ہے۔ حقیقت محمدی ﷺ کا ہر جلوہ اللہ پاک کے ذاتی علوم کا ایک عکس ہے چونکہ یہ تمام علوم اللہ پاک کی ذات کے ہیں اس لیے ان کی ہر تجلی کو ذات کی تجلی کہا گیا ہے اور ان تجلیات سے آگے حقیقی ذات تک انسان کے شعور کی رسائی نہیں ہے۔اب ہم یوں کہہ سکتے ہیں حقیقت محمدی ﷺ یا روح اعظم کی ظاہری صورت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے اور باطنی ذات باری تعالیٰ کی تجلی ہے ذات خالق جب بھی اپنے آپ کو کائنات میں ظاہر کرنا چاہتی ہے وہ حضور پاک ﷺ کے پردے میں ظاہر کرتی ہے۔اسی لیے آپ ﷺ کا درجہ اللہ سے قریب ترین بیان کیا گیا ہے۔ گویا حقیقت محمدی ﷺ ایک جانب ظہور الٰہی کا واسطہ بنی دوسری جانب ظہور کائنات کا واسطہ بنی۔اللہ کی حقیقی پہچان روح اعظم کے ذریعے ہوئی ہے۔ یہ وہ پہچان ہے جو اللہ کے ارادے میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا مقصد تھا۔وحی اللہ کے کلام کی وہ تجلیات ہیں جو روح اعظم کے دہن مبارک سے آواز اور کلام کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔اس دہن مبارک کے پردے میں تجلیات اللہ ہی کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر ان تجلیات کو بشری دماغ اور بشری حواس کے مطابق معنی و مفہوم پہنانا ضروری تھا تاکہ بشر یا آدم اللہ کے کلام کو سمجھ جائے اور اس پر عمل کر سکے۔پس اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے ایک صورت بنائی اور اس اپنی تخلیق کو خود پسند فرمایا اور خود اس کی تعریف کی اور اس بشر کو اپنا پیغامبر اور قاسم بنایا اور خود اس پردے کے پیچھے رہ کر اپنے ارادے پر کام کرنے لگے۔اب اصل ذات کیا ہے۔ کیسی ہے؟ یہ تو یا خود اللہ جانتا ہے اور یا پھر حقیقت محمد رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک جانتی ہے۔انسان کی زیادہ سے زیادہ رسائی تو بس اسی حقیقت محمدی ﷺ کے شعور تک ہے۔ وہ بھی اتنی کہ جو کچھ یہ شعور اپنے ارادے سے بتانا چاہے اور بس۔اسی حقیقت کو اللہ پاک بیان فرماتے ہیں کہ وہ تو کچھ بولتے ہی نہیں سوائے وحی کے۔ یہ حقیقت محمدی ﷺ کے

www.ksars.org

شعور کا تذکرہ ہے کہ اس کا ہر کلام اللہ کے کلام کی تجلیات ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے اوپر دنیا میں یہی شعور غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر کلام اللہ پاک نے وحی میں شمار کیا ہے۔ حضور پاک ﷺ کے ارادے پر اللہ کا ارادہ غالب تھا اور ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ جو اطلاعات ہم تک پہنچتی ہیں ہم ان اطلاعات کو اپنے ارادے سے معانی و مفہوم پہناتے ہیں ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے حصے تو اس اطلاع کو ہمارا ذہن رد کر دیتا ہے اور ایک حصہ فی ہزار کو اپنے حافظہ میں توڑ مروڑ کے رکھ دیتا ہے یعنی ہم اپنے ذہن سے ان اطلاعات کو زیادہ تر غلط معنی پہناتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ تو زمین کی اکثریت کے پیچھے چلے تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے یعنی ان اطلاعات میں غلط معنی پہنا کر انہیں کچھ کا کچھ بنا دیں گے۔ اب جس آدمی کا شعور اس مادی لیول سے ترقی کر کے روشنی نور کے لیول سے گزرتا ہوا تجلی کے لیول تک پہنچ جاتا ہے تو وہ ان اطلاعات کو بالکل وہی معنی پہناتا ہے جو اللہ کے ارادے میں ہیں۔ انبیاء علیہ السلام چونکہ شعور کے اس درجے پر پہنچے ہوئے تھے اسی لیے وہ اس کے اندر اللہ کے ارادے کے مطابق معنی پہناتے رہے۔ کشف، الہام اور القاء وحی کی طرزیں ہیں۔ اصلی وحی جو پیغمبروں کے ساتھ منسوب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا ارادہ پیغمبروں کے ارادے پر اپنا تصرف کر کے جو کچھ انہیں سکھانا چاہتے ہیں، سکھا دیتے ہیں۔ وحی کا یہ سلسلہ براہ راست ہے جو نبوت کے بعد اب دنیا سے منقطع ہو چکا ہے۔ اس کی ذیلی صورت یہ ہے کہ جو کچھ پیغمبروں کو اللہ نے سکھایا اپنے خصوصی تصرف کے ساتھ۔ پیغمبروں کے ذریعے سے وحی کے یہ انوارات جو علوم لدنی کہلاتے ہیں۔ یہ انوارات اولیاؤں اور روحانی افراد کے اندر منتقل ہوتے ہیں۔ یہ تینوں درجات پیغمبروں کے تصرف کے درجات ہیں۔ اس کا تذکرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی کرنے کے ذکر میں آیا ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر بھیجی جانے والی وحی پیغمبر کا تصرف یا ارادہ ہے۔ جس کا فاعل حقیقی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد اللہ کے ارادے پر پیغمبران علیہ السلام کی ہستیاں حرکت میں آ کر عملی طور اللہ کے ارادے پر کام کرتی ہیں۔ یہ عالم امر ہے۔ عالم امر سے فرداً فرداً ہر مخلوق کو کائنات کے ذرے ذرے کے لیے احکامات نازل ہوتے ہیں۔ یہ احکامات روح کی آواز کی لہریں ہیں جس پر ساری کائنات کی روحیں حرکت میں آجاتی ہیں اور حکم خداوندی پر مستعد ہو جاتی ہیں۔ یہ وحی ہے جس کا تذکرہ شہد کی مکھی کے ذکر میں آیا ہے۔ وحی، کشف، الہام اور القاء کا ایک ہی قانون اور اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ وحی بھیجنے والا اپنے ارادے کی قوت سے

www.ksars.org

وحی وصول کرنے والے کے ارادے کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔اس طرح وصول کرنے والے کا ارادہ مغلوب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ارادے سے سوچ نہیں سکتا۔ پھر جو کچھ بھیجنے والا ارادہ کرتا ہے وہ اطلاع اور علم اس کے قلب میں منتقل کر دیتا ہے۔ چونکہ دوسرے آدمی کا ارادہ تو مغلوب ہے وہ معنی پہنا نہیں سکتا اس وجہ سے غالب شدہ ارادہ ہی اسے معنی پہناتا ہے۔ چونکہ بھیجنے والا بھی وہی ہے تو معنی بھی وہی درست ہوتے ہیں جو وہ پہناتا ہے۔

عالم امر سے فرداً فرداً جو احکامات روحوں کو نازل ہو رہے ہیں وہ ہر روح کے لیے اس کی زندگی کا ایک دائرہ ہے۔ زندگی کا یہ ریکارڈ ہر ذی روح کے اندر ہوتا ہے۔ اسی ریکارڈ سے زندگی کو حرکت کی انرجی اور حکم ملتا ہے۔ یہ حکم خود اپنی روح کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی نے خود اپنی روح کے ذریعے اللہ کا امر اور حکم موصول کیا۔ اللہ نے اسے بھی وحی اس لیے کہا کہ روح کے اندر غیب کا ارادہ کام کر رہا ہے اور غیب میں پیغمبروں کا اور اللہ کا ارداہ کام کرتا ہے۔ یعنی شہد کی مکھی اپنے نفس کے ارادے پر نہیں بلکہ اپنی روح کے ارادے پر کام کرتی ہے۔ عالم امر سے عالم ناسوت کے درمیان وحی کی جو ترسیل ہے وہ آواز کی یا ساؤنڈ کی لہروں پر ہے۔ یہ وحی کی ذیلی طرزیں ہیں جسے کشف الہام اور القاء کہا ہے اور عالم امر عام سے آگے عالم امر خاص اور تجلیات کے عالمین میں وحی کی ترسیل پیغمبروں کے تفکر کی لہروں پر ہے اور تجلی ذات کے عالمین میں وحی کی ترسیل اللہ تعالیٰ کے تفکر یا انا کی لہروں پر ہے۔ اللہ پاک کی انا کی لہروں کا شعور تدلی ہے جو حضور پاک ﷺ کو معراج میں حاصل ہوا۔ اس شعور کے ساتھ انہوں نے اللہ کو اپنی ذات سے قریب ترین دیکھا۔ وحی کی یہی حقیقت انسانی شعور کی انتہائی بلندی ہے۔

www.ksars.org